الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

سب سے زیادہ نادان وہ شخص ہے
جو چیزوں کی ظاہری [illegible]

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ ـ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ـ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ
جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۸ جنوری ۱۹۹۰

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 611128, 697333

انقلاب انگیز اثر

۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو دہلی پولیس نے کچھ اسکوٹر ڈرائیوروں کو پکڑا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ کسی نے پیلی لائن کو کراس کیا ہے۔ کسی نے ریڈ لائٹ پر اپنی گاڑی دوڑا دی ہے۔ ڈرائیوروں نے انکار کیا۔ ٹریفک پولیس نے ان سے زیادہ بحث نہیں کی۔ بس ان کے سامنے ایک ویڈیو فلم کھول دی۔ انھوں نے عملاً اپنی آنکھوں سے وہ واقعہ دیکھ لیا جس کا ان کے اوپر الزام تھا۔ اب ان کی زبان بند ہو گئی۔ انھیں اپنے جرم کا اقرار کرنا پڑا۔

یہ الکٹرانک آنکھ (Electronic eye) کا کرشمہ تھا۔ دہلی پولیس نے حال میں ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی کرنے والوں کو پکڑنے کے لیے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اس نے ایک میٹاڈور میں ویڈیو کیمرہ اور مخصوص مشینیں نصب کر دی ہیں۔ اس کا پہلا تجربہ ۲ ستمبر کو تلک برج کے پاس کراسنگ پر کیا گیا۔ میٹاڈور میں لگا ہوا کیمرہ تمام گزرنے والی گاڑیوں کا خاموشی کے ساتھ فوٹو لیتا رہا۔ اس طرح اس نے تقریباً ۹۰ موٹر گاڑیوں کو خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑا۔ پولیس نے ان پر ایک سو سے ایک ہزار روپیہ تک جرمانہ کیا۔

ہندستان ٹائمس (۳ ستمبر ۱۹۸۹) کی رپورٹ کے مطابق، ڈاکٹر کے کے پال (اڈیشنل کمشنر آف پولیس، سیکورٹی اینڈ ٹریفک) نے اس کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ صرف یہ بات کہ اس قسم کی ایک پولیس گاڑی ویڈیو کیمرہ کے ساتھ دہلی کی سڑکوں پر متحرک ہے، یہی ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کے اوپر مفید اثر ڈالنے کے لیے کافی ہے:

Just the fact that such a van with a video camera is moving around Delhi roads is going to have a salutary effect on traffic violators (p. 7).

یہی واقعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اس وقت پیش آتا ہے جب آدمی کو یقین ہو جائے کہ خدا کی آنکھ اس کو مستقل دیکھ رہی ہے اور خدا کے فرشتے ہر لمحہ اس کی کارگزاریوں کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ "خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے" بظاہر ایک سادہ عقیدہ ہے۔ لیکن اگر یہ عقیدہ صحیح طور پر پیدا ہو جائے تو آدمی کی پوری زندگی بدل جائے۔

پیغمبر اعظم

محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں خاتم النبیین (الاحزاب ۴۰) کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہے کہ آپ نبوت کی فہرست کی آخری کڑی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبیوں کو بھیجنے سے جو مقاصد مطلوب تھے، وہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ آخری طور پر مکمل کر دیئے۔ اسی لیے آپ آخری نبی قرار پائے۔ آپ کے بعد اب مزید کسی نبی کو بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نبوت کے تمام مقاصد کی تکمیل ہونا صرف شخصی عقیدہ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک معلوم تاریخی واقعہ ہے۔ اسی لیے انگریز مورخ طامس کارلائل نے آپ کو پیغمبروں کا ہیرو بتایا ہے۔ امریکی پروفیسر مائیکل ہارٹ نے آپ کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہا ہے۔ کروروں اہل اسلام آپ کو تمام پیغمبروں میں سب سے اعظم اور افضل پیغمبر مانتے ہیں۔

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے، سب توحید کا پیغام لے کر آئے۔ مگر آپ سے پہلے تمام پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کا پیغام صرف دعوتی مرحلہ میں رہا۔ وہ انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہونچا۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی مدد سے اس کو عملی انقلاب کے مرحلہ تک پہونچا دیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے دین میں تحریفات ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک کسی پیغمبر کا دین بھی تحریف سے خالی نہ رہا۔ آپ کے ذریعہ تاریخ نبوت میں پہلی بار ایسا ہوا کہ خدا کا دین تحریفات سے پاک ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک محفوظ دین کی صورت میں قائم ہو گیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مذہب نزاعی دور میں تھا۔ مذہب کے ساتھ وہ حقائق جمع نہیں ہوئے تھے جو اس کو ایک تاریخی مسلّمہ بنا دیں۔ آپ کے ذریعہ یہ عظیم کارنامہ انجام پایا کہ مذہب کی تحریک نزاعی مذہب کے دور سے نکل کر مسلّمہ مذہب کے دور میں داخل ہو گئی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مذہبی تعلیمات کی پشت پر ایک حقیقی عملی تاریخ موجود نہ تھی۔ آپ اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ پہلی بار ایسا ہوا کہ مذہب کی اعلیٰ تعلیمات مجرد تعلیمات نہ رہیں بلکہ ان کے پیچھے ہر اعتبار سے ایک مکمل واقعاتی تاریخ موجود ہو گئی ـــــــ حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میں بولا ہوا ہر لفظ ایک ثابت شدہ واقعہ ہے نہ کہ فرضی نوعیت کا صرف ایک شخصی عقیدہ۔

دے کر پانا

۱۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک عیسائی تاجر اپنے تجارتی گھوڑوں کو لے کر دریائے فرات کے پاس سے اسلامی سرحد میں داخل ہوا۔ زیاد بن حدیر نے اس سے محصول طلب کیا۔ اس نے محصول ادا کر دیا۔ واپسی میں وہ دوبارہ اسی راستہ سے گزرا تو زیاد نے اس کے غیر فروخت شدہ گھوڑوں سے دوبارہ محصول طلب کیا۔ تاجر کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس نے اپنے غیر فروخت شدہ گھوڑے اپنے غلاموں کی نگرانی میں وہیں چھوڑ دیے اور خود چل کر مدینہ پہونچا تاکہ خلیفہ سے شکایت کرے۔ اس نے مدینہ پہونچ کر حضرت عمر فاروق ؓ سے اپنا قصہ بیان کیا۔ اور کہا کہ مجھ سے میرے گھوڑوں پر دوبارہ محصول طلب کیا جا رہا ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے اس کی بات سن کر مختصر طور پر صرف اتنا کہا کہ کفیت (اس کا انتظام کر دیا گیا ہے)

تاجر نے سمجھا کہ خلیفہ نے اس کی شکایت کو کچھ اہمیت نہ دی۔ وہ مایوسی کی حالت میں دریائے فرات کی چوکی پر واپس آیا اور زیاد کے مطالبہ کے مطابق محصول کی رقم ادا کرنے لگا۔ مگر زیاد نے اس سے دوبارہ رقم نہ لی اور کہا کہ خلیفہ کی طرف سے یہ حکم آ گیا ہے کہ تم سے دوبارہ محصول نہ لیا جائے۔

عیسائی تاجر اس بات سے بے حد متاثر ہوا کہ خلیفہ نے اتنی تیز کارروائی کی کہ میرا انصاف مجھ سے پہلے یہاں پہونچ گیا۔ اس نے کہا کہ اے زیاد، میں مسیحیت کو چھوڑتا ہوں، اور میں اس آدمی کے دین کو اختیار کرتا ہوں جس نے تمہارے پاس یہ فرمان بھیجا ہے (یا زیاد انی برئ من النصرانیہ وانی علی دین الرجل الذی کتب الیک ھذا الکتاب، کتاب الخراج)

۲۔ حضرت علی ؓ بن ابی طالب چوتھے خلیفہ راشد تھے۔ ایک بار ان کی زرہ چوری ہو گئی۔ حضرت علی کو معلوم ہوا کہ وہ فلاں یہودی کے پاس ہے۔ انھوں نے کوفہ کے قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ حضرت علی ؓ نے اپنے دعویٰ کے حق میں دو گواہ پیش کیے۔ ایک اپنے غلام قنبر کو، اور دوسرے اپنے لڑکے حسن کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں مقبول نہیں ہے اور صرف ایک گواہ دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ چنانچہ قاضی شریح نے مقدمہ خارج کر دیا۔ زرہ بدستور یہودی کے پاس باقی رہی۔

یہودی اس فیصلہ کو سُن کر بے حد متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ تو نبیوں جیسا معاملہ ہے کہ ایک قاضی وقت کے حاکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے (ھذہ احکام الانبیاء قاضیة یقضی علیه) اس کے بعد یہودی نے اسلام قبول کر لیا اور زرہ یہ کہہ کر حضرت علیؓ کو دے دی کہ یہ آپ ہی کی ہے، آپ کا دعویٰ بالکل درست تھا (کنز العمال)

۳۔ بنو امیہ کے زمانہ میں دمشق کی جامع مسجد بنائی گئی۔ مسجد کے ایک طرف ایک قدیم گرجا تھا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ گرجا کا ایک حصہ مسجد میں شامل کر لیا جائے۔ مگر عیسائی اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ خلیفہ عبدالملک نے اس کے لیے عیسائیوں کو ایک معقول رقم کی پیش کش کی پھر بھی وہ راضی نہ ہوئے چنانچہ ابتدائی تعمیر میں مسجد کا ایک گوشہ ناقص رہا۔

اس کے بعد ولید بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو اس نے بھی مسجد کی تکمیل کے لیے عیسائیوں کو راضی کرنا چاہا مگر عیسائی دوبارہ راضی نہیں ہوئے۔ ولید بن عبدالملک نے اس زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا اور اس کو مسجد میں شامل کر کے اس کی تعمیر مکمل کر دی۔ اس کے کئی سال بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے۔ ان کے عدل و انصاف کی شہرت پھیلی تو عیسائیوں نے دوبارہ ان سے مل کر اپنی سابقہ شکایت کو پیش کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو سن کر حکم دے دیا کہ گرجا کی زمین کا جو حصہ مسجد میں شامل کیا گیا ہے اس کو توڑ کر عیسائیوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

مسلمانوں کو یہ بات بے حد شاق گزری۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنی مسجد کو گرا دیں، حالاں کہ ہم نے اس میں اذانیں دی ہیں اور نمازیں ادا کی ہیں (نھدم مسجدنا اذنّا فیه وصلّینا) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ خواہ کچھ ہو، یہ زمین اگر مسیحی عبادت خانہ کی تھی تو وہ مسیحیوں کو واپس کی جائے گی۔

مسیحیوں نے جب خلیفہ کے اس فیصلہ کو سنا تو وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اب ان کا ذہن بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا دعویٰ ثابت ہو گیا، ہم کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ اب ہم اس زمین کو اپنی طرف سے بطور ہدیہ مسجد کو دیتے ہیں (تاریخ بلاذری)

اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ اور جو شخص صرف پانا چاہے، وہ کھوتا ہے۔ یہ اس دنیا کا اٹل قانون ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

قرآن کی طاقت

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ - ۱۸۹۷) جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے معماروں میں سے تھے۔ آخر عمر میں وہ ہندستان کے صدر جمہوریہ بنائے گیے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے انتقال کیا۔ انھوں نے ریڈیو پر بہت سی تقریریں کی تھیں۔ ایک تقریر میں انھوں نے اپنے ایک ابتدائی استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا :

" خدا بخشے علی گڑھ کے مشہور استاد مولوی عباس حسین صاحب کو۔ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی، قرأتِ قرآن کا فن ختم ہو گیا۔ میرے اپنے استاد مرحوم (جن سے میں نے قرأت سیکھی) وہ اس کے آخری جاننے والوں میں تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر " ق " کا صحیح تلفظ مٹکے کے اندر کر دوں تو مٹکا پھٹ جاتے " (بچوں کی تربیت ، نیا کتاب گھر لاہور، صفحہ ۹۵)

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ قرآن جس کے اندر پہاڑوں کو ہلا دینے کی طاقت تھی (الحشر ۲۱) جس کو سُن کر کتنے لوگوں کے سینے شق ہو گیے (مثلاً عمر فاروق) وہ بالآخر ایک ایسے فن تک جا پہونچا جو بس مٹی کا ایک " مٹکا " توڑ سکتا تھا۔ اور اب یہ حال ہے کہ وہ کاغذ کے صفحات میں چھپا ہوا پڑا ہے ، اور اس کے اندر کسی بھی چیز کو توڑنے کی صلاحیت نہیں۔ حتی کہ اغیار یہ کہنے لگے ہیں کہ قرآن اب ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) ہے، اب وہ کوئی کارنامہ انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ، اور نہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں کوئی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

یہ حالت اس لیے نہیں ہے کہ خدانخواستہ قرآن میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے۔ قرآن میں آج بھی تسخیری قوت ہے۔ آج بھی وہ انھیں طاقتوں کا خزانہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے جس کا اظہار اس کے نزول کے ابتدائی زمانہ میں ہوا تھا۔ البتہ قرآن کے حاملین اس محفوظ خزانہ کو حاصل کرکے اس کو باہر کی دنیا میں لانے کے قابل نہ رہے۔

قرآن کی لفظی قرأت اگر مٹکا توڑ سکتی ہے تو اس کا معنوی اظہار دلوں اور دماغوں میں زلزلہ پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اصل کمی یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں قرآن کے معنوی اظہار کے لیے کوئی حقیقی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ موجودہ زمانہ میں قرآن کا یہ پہلو ابھی تک غیر اظہار شدہ پڑا ہوا ہے۔

غلط رہنمائی

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے جب مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کی، اس وقت حضرت ابراہیم نے یہ دعا فرمائی کہ اے ہمارے رب، تو ہم دونوں کو مسلم (مطیع) بنا۔ اور ہماری نسل سے ایک مسلم امت (مطیع امت) برپا کر (البقرہ ۱۲۹) اس واقعہ کے ڈھائی ہزار سال بعد جب یہ امت، امت محمدی کی صورت میں اٹھی تو پچھلی تاریخ کو یاد دلاتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ اللہ نے تمہارے باپ ابراہیم کی ملت کو تمہارے لیے پسند فرمایا ہے۔ ابراہیم نے تمہارا نام مسلم (مطیع) رکھا تھا اس سے پہلے (الحج ۷۸)

یہ قرآن کا طریقہ ہے۔ قرآن نے دور اول کے مسلمانوں کو عمل پر ابھارنے کے لیے ماضی کا حوالہ دیا۔ ان کو ان کے آباء و اجداد کی یاد دلائی۔ مگر قرآن نے یہ زبان استعمال نہیں کی کہ ـــــ اے مومنو، تم اسی ابراہیم کی اولاد ہو جس نے بتوں کو توڑ کر پاش پاش کر دیا۔ جس کے ایک کلمہ سے بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ جو اپنے وقت کے نمرودوں کو خاطر میں نہیں لایا۔ اس کے برعکس قرآن نے اہل ایمان کو حضرت ابراہیم کے اس پہلو کی یاد دلائی کہ انھوں نے تمہارا نام مسلم و مطیع رکھا تھا۔ وہ تم کو اطاعت گذار اور فرماں بردار دیکھنا چاہتے تھے۔

اب موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کو دیکھئے۔ یہ مسلم رہنما بھی مسلمانوں کو ان کی گزشتہ تاریخ یاد دلا کر ان کے اندر عمل کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کا طریقہ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ ان میں سے کوئی شخص جب بولتا یا لکھتا ہے تو اس کی زبان یہ ہوتی ہے ـــــ مسلمانو، تم وہی تو ہو جن کے اجداد نے قیصر و کسریٰ کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا۔ تم وہی تو ہو جن کی تلواروں کے آگے قومیں جھکنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ تم وہی تو ہو جنھوں نے شعلہ بن کر باطل کی خاشاک کو پھونک ڈالا تھا۔ تم وہی تو ہو جنھوں نے محتسب کائنات بن کر سارے عالم پر حکمرانی کی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے تاریخ کا حوالہ اس لیے دیا تھا کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر تواضع اور اطاعت گذاری کا جذبہ پیدا ہو۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما تاریخ کا حوالہ اس لیے دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر فخر اور حکمرانی کا جذبہ بیدار کریں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ ان کی یہی غلط رہنمائی ہے۔

اذن اللہ

قرآن میں ہے : کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله (کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آتی ہیں ۔ البقرہ ۲۴۹) یہ موجودہ دنیا کے لیے اللہ کا قانون ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں عزت اور برتری صرف انھیں لوگوں کا مقدر نہیں ہے جو تعداد اور وسائل میں زیادہ ہوں ۔ یہاں کم تعداد اور کم وسائل والا گروہ بھی عزت اور سربلندی حاصل کرسکتا ہے ، بشرطیکہ وہ اذن اللہ کی پیروی کرے ۔

یہ اذن اللہ یا خدائی قانون کیا ہے ، وہ الرعد (آیت ۱۷) کے مطابق یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے ، وہ زمین میں ٹھہراؤ اور استحکام حاصل کرتی ہے (واما ما ينفع الناس فيمكث في الارض) یہی بات حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے (اليد العليا خير من اليد السفلى) یعنی جو ہاتھ دوسروں کو دیتا ہے ، وہ اس سے بہتر ہے جو دوسروں سے لینے والا ہے ۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سماج میں ہمیشہ دو قسم کے گروہ ہوتے ہیں ۔ ایک دینے والا گروہ (Giver group) اور دوسرا لینے والا گروہ (Taker group) زندگی کا یہ ابدی قانون ہے کہ جو گروہ لینے والا ہو اس کو اس دنیا میں پستی اور مغلوبیت کی سطح پر جگہ ملے ۔ اور جو گروہ دینے والا گروہ بنے ، اس کو دوسروں کے اوپر عزت اور برتری کا مقام حاصل ہو ۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہناؤں نے احیاء ملت کے نام سے جو تحریکیں اٹھائیں ، وہ زندگی کے اس شعور سے یکسر خالی تھیں ۔ یہ لوگ اس بات کو نہ جان سکے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انھیں تخلیقی گروہ کی حیثیت سے اٹھایا جائے ۔ اس کے بجائے انھوں نے مسلمانوں کو علاحدگی پسند گروہ (Separatist group) کے طور پر اٹھانے کی کوشش کی ۔ ۱۹۴۷ سے پہلے اس علاحدگی پسندی کا اظہار جغرافیائی تقسیم کی شکل میں ہوا ، اور ۱۹۴۷ کے بعد ملی تشخص کی حفاظت کی صورت میں ہو رہا ہے ۔

مسلمانوں کی ترقی کا راز علاحدگی پسندی میں نہیں بلکہ آفاقیت پسندی میں ہے ۔ انھیں تخلیقی گروہ بننا ہے نہ کہ جامد گروہ ۔ انھیں اپنا امتیاز خارجی مظاہر میں نہیں بلکہ معنوی حقیقتوں میں قائم کرنا ہے ۔ وہ نفع بخشی کی زمین پر کھڑے ہو سکتے ہیں نہ کہ حقوق طلبی کی زمین پر ۔

تصدیق، اعتراف

مطلوب انسانی شخصیت کے دو درجے ہیں۔ ایک تصدیق کا درجہ، اور دوسرا اعتراف کا درجہ۔ ان دونوں قسم کی شخصیتوں کے دو معیاری نمونے (Models) اللہ تعالٰی نے تاریخ میں قائم کر دیے ہیں۔ ایک، ابوبکر بن ابی قحافہ کا نمونہ، اور دوسرا، عمر بن الخطاب کا نمونہ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کو بھی اسلام کی طرف بلایا، اس کے لیے اس میں کچھ نہ کچھ تاخیر اور سوچ اور تردد ہوا، سوا ابوبکر بن ابی قحافہ کے۔ جب میں نے ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کو قبول کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہ کیا (ما دعوت احدا الی الاسلام الا کانت فیہ عندہ کبوۃ ونظر وتردد الا ما کان من ابی بکر بن ابی قحافۃ ما عکم عنہ حین ذکرتہ لہ وما تردد فیہ، سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۶۸)

عمر بن الخطاب کے اسلام کا معاملہ اس سے مختلف صورت میں پیش آیا۔ ان کے قبول اسلام کا قصہ تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں آیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ اپنے گھر سے اسلام کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلے اور جب اسلام (قرآن) کو سنا تو خود قتل ہو گئے۔ انھوں نے اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کو اس لیے مارا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب بہن کے جسم سے خون بہنے لگا تو اس کو دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے قرآن دکھاؤ۔ اس کے بعد انھوں نے سورہ طٰہٰ پڑھی۔ اس کو پڑھتے ہی ان کے اندر اعتراف کی نفسیات جاگ اٹھی۔ ان کی زبان سے نکلا: ما احسن ھذا الکلام واکرمہ (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۶۷)

ایک انسان وہ ہے جو پوری طرح فطرت خداوندی پر قائم ہے۔ اس کے سامنے سچائی آتی ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ عین اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کی فطرت پر ماحول کے اثر سے کچھ پردے پڑ گئے۔ تاہم اس کا انسانی جوہر بدستور پوری طرح زندہ ہے۔ وہ ابتداءً شبہ اور تردد کا شکار ہوتا ہے۔ مگر جب دلائل سے بات واضح ہو جاتی ہے تو اس کے بعد وہ حق کے آگے ڈھیر پڑتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو دل وجان سے قبول کر لیتا ہے۔ پہلے کردار کا مثالی نمونہ ابوبکر صدیق ہیں اور دوسرے کردار کا مثالی نمونہ عمر فاروق۔

عُسر میں یُسر

الم نشرح لك صدرك ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك ورفعنا لك ذكرك فإنّ مع العسر يسرًا ان مع العسر يسرًا فاذا فرغت فانصب والى ربك فارغب

کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا۔ اور تمہارا وہ بوجھ اتار دیا جو تمہاری پیٹھ کو توڑ رہا تھا۔ اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو، اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو (الانشراح)

یہ سورہ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اتری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب دعوت توحید کا آغاز کیا تو یہ ان تمام لوگوں کو دینی لحاظ سے غیر معتبر ٹھہرانے کے ہم معنی تھا جو غیر اللہ کی بنیاد پر بڑائی اور سرداری کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کے سخت دشمن ہو گئے۔ وہ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے۔ اس صورت حال نے آپ کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔

اس وقت اس سورہ کے ذریعے آپ کو ایک سنت الٰہی سے باخبر کیا گیا۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں یُسر کا رشتہ عُسر سے بندھا ہوا ہے۔ اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا کسی نئی آسانی کی تمہید ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی حوصلہ نہ کھوئے اور آنے والے بہتر مستقبل کا انتظار کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت سے پہلے یہ مرحلہ گزرا کہ آپ حق کی تلاش میں سخت سرگرداں ہوئے۔ وقت کے ماحول اور مروجہ مذہب میں آپ کو اطمینان نہیں مل رہا تھا۔ "سچائی کیا ہے" اس سوال نے آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت کر دیا۔ یہ اضطراب اگرچہ ابتداءً "عسر" تھا، مگر اس کے اندر "یسر" کا پہلو نکل آیا۔ کیوں کہ اس نے آپ کو خشک زمین کی مانند بنا دیا تاکہ جب وحی کی صورت میں ہدایت آئے تو اس کی ایک ایک بوند آپ کے اندر جذب ہوتی چلی جائے۔ آپ بھرپور طور پر اس کو اخذ کریں۔ وہ پوری طرح آپ کے ذہن کو واضح اور روشن کر دے۔

دوسری چیز جو مذکورہ سنت کے لئے بطور مثال پیش کی گئی، وہ رفع ذکر کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے جن لوگوں کو مخالفت پیدا ہوئی، انھوں نے اس کو ناکام

کرنے کے لئے دعوت اور صاحب دعوت کو بدنام کرنے کی مہم شروع کر دی۔ وہ آپ کے خلاف اشعار کہہ کر اس کو پھیلاتے جو گویا اس زمانہ کی صحافت تھی۔ میلے اور بازار جو گویا اس زمانہ کے اجتماعات تھے، وہاں جا کر وہ لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے۔ وہ لوگوں کے سامنے آپ کی بری تصویر پیش کرتے تاکہ وہ آپ سے اور آپ کے سچے مشن سے بدگمان ہو جائیں۔

مخالفین نے عیب جوئی اور الزام تراشی کی جو مہم چلائی، اس کا مقصد ان کے اپنے خیال کے مطابق یہ تھا کہ صاحب دعوت کو بدنام کریں اور اس طرح لوگوں کو آپ کی دعوت سے متوحش کر دیں۔ مگر اس عسر میں بھی یسر کا پہلو نکل آیا۔ مخالفین کے نزدیک وہ آپ کو بدنام کرنے کی کوشش تھی، مگر دوسروں کے لئے وہ تجسس کے ہم معنی بن گئی۔ اس طرح آپ کی شخصیت نہایت وسیع پیمانہ پر لوگوں کے سامنے سوال بن کر کھڑی ہو گئی۔ ہر آدمی تفصیلی طور پر یہ جاننے کا طالب بن گیا کہ محمد کون ہیں اور ان کی دعوت کیا ہے۔

انسانی فطرت کبھی جزئی علم پر قانع نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ پوری بات جاننا چاہتی ہے۔ چنانچہ آپ کے خلاف کچھ باتیں سن کر لوگ اتنے ہی پر رک نہیں جاتے تھے۔ بلکہ وہ دعوت اور صاحب دعوت کے بارہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے براہ راست تحقیق کرتے تھے۔ وہ آپ سے ملتے اور قرآن کا مطالعہ کرتے۔ اس طرح مخالفین کی مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کی دعوت ان دور دور کے علاقوں میں پہنچ گئی جہاں آپ خود ابھی تک اس کو نہیں پہنچا سکے تھے۔ مخالفین نے آپ کو بدنام کر کے آپ کے بارہ میں لوگوں کے اندر شوق تحقیق پیدا کیا۔ اور جب ان لوگوں نے براہ راست تحقیق کی تو ان میں سے بہت سے لوگ آپ کی دعوت کو حق پا کر اس کے حامی بن گئے۔

اس سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ عسر کے یسر میں تبدیل ہونے کا دو تجربہ تم کر چکے ہو ــــ تلاش حق کی بے چینی کے بعد ہدایت کا ملنا، بدنامی کی مہم سے اشاعت دعوت کے نئے مواقع پیدا ہونا۔ اسی طرح اس سنت الٰہی کا تیسرا ظہور بھی عنقریب تمہارے سامنے آجائے گا۔ حالات کی فطری رفتار کو اپنی حد پر پہنچنے دو اور مستقبل کے ظہور تک صبر کے ساتھ اس کا انتظار کرو۔

اس تیسرے دور سے مراد دعوت اور صاحب دعوت کا نزاعی دور سے نکل کر مسلمہ دور میں

داخل ہونا ہے جس کو سورہ نصر میں "فتح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ موجودہ دور نزاع میں جو سخت حالات پیش آرہے ہیں، وہ آنے والے یسر کی تمہید ہیں۔ اس طرح وہ تمام ضروری اسباب جمع کئے جارہے ہیں کہ آئندہ جب مرحلۂ استحکام آئے تو وہ حقیقی معنوں میں استحکام اور ثبات بن سکے۔

اس عمل کے دوران دعوت کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہو جائیں۔ سچے انسان اور جھوٹے انسان ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں۔ یہ معلوم ہو جائے کہ کون واقعی معنوں میں حق کا طالب ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو حق کا نام صرف اس لئے لیتے ہیں کہ اس کی آڑ میں اپنا ذاتی مفاد حاصل کر سکیں۔ گم نامی میں پڑے ہوئے جواہر نکھر اٹھیں اور مصنوعی شہرت کا لبادہ اوڑھنے والے لوگ بے نقاب ہو جائیں۔

نیز یہ کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی فکر کو ماحول میں غلبہ حاصل ہو تو اس طرح ہو کہ وہ ان کا ایک ثابت شدہ حق بن چکا ہو، اور اسی طرح جب آپ کے مخالفین کو مغلوب کیا جائے تو یہ مغلوبیت اس طرح آئے کہ وہ لوگوں کو ایک کھلی ہوئی تاریخی ضرورت دکھائی دینے لگے۔

عسر میں یسر کا یہ تجربہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا، یہی آئندہ بھی آپ کے امتیوں کو ہوتا رہے گا، بشرطیکہ وہ اسی صراط مستقیم پر چلیں جس پر آپ چلے اور اسی صبر اور استقامت کا ثبوت دے سکیں جس کا ثبوت آپ نے اپنے زمانہ میں دیا۔

مہنگی قیمت

قدیم رومی شہنشاہ آکٹیوین (Octavian) جس کو آگسٹس (Caesar Augustus) بھی کہا جاتا ہے، ۶۳ ق م میں پیدا ہوا، اور ۱۴ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ حکمت کی باتوں کے لیے مشہور ہے۔ اس کا ایک قول انگریزی ترجمہ میں اس طرح نقل کیا گیا ہے:

Whoever seeks to obtain small benefits at the risk of great dangers is like a fisherman using a hook of gold: should it come off, no catch would compensate the loss.

جو شخص بڑے نقصانات کا خطرہ مول لے کر چھوٹے فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کی مثال اس مچھیرے کی سی ہے جو مچھلی پکڑنے کے لیے سونے کا کانٹا استعمال کر رہا ہو۔ اگر اس کا کانٹا نکل کر دریا میں گر جائے تو اس کا شکار خواہ کتنا ہی ہو، اس کے نقصان کی تلافی نہیں بن سکتا۔

حکمت کی یہ بات اب سے تقریباً دو ہزار سال پہلے کہی جا چکی تھی۔ مگر انسان آج بھی اس کو پوری طرح اختیار نہ کر سکا۔ آج بھی بے شمار افراد اور گروہ ملیں گے جو چھوٹے فائدے کو حاصل کرنے کے لیے بہت بڑے بڑے خطرے میں کود پڑتے ہیں۔ وہ چند مچھلیاں پکڑنے کی خاطر سونے کا کانٹا کھو دیتے ہیں۔

غلطی کی یہ قسم سب سے زیادہ جن لوگوں میں پائی جاتی ہے وہ قوم کے لیڈر ہیں۔ ایک لیڈر اپنے معمولی مفاد کے لیے قوم کو ایسی بربادی میں ڈال دے گا جس کی تلافی سیکڑوں سال میں بھی نہ ہو سکے۔ وہ اپنی وقتی مقبولیت کے لیے قوم کو مستقل ذلت کے گڑھے میں دھکیل دے گا۔ وہ اپنے چند سکوں کی خاطر پوری قوم کی اقتصادیات کو تہ و بالا کر دے گا۔ وہ اپنے حق میں سستی شہرت کے حصول کے لیے قوم کے افراد کی زندگی کو اتنی مہنگی کر دے گا کہ وہ اس کے اندر پس کر رہ جائیں۔

اگر کسی شخص کی پتنگ سمندر میں گر جائے تو وہ اس کو پکڑنے کے لیے سمندر کی موجوں میں نہیں کود ے گا۔ وہ ایک پتنگ کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ مگر ملی اور قومی معاملات میں ہر لیڈر یہی نادانی کر رہا ہے۔ کیسے عجیب ہیں لیڈر اور کیسے عجیب ہیں ان کی پیروی کرنے والے عوام۔

ہنر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیب است

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا ایک تردیدی مضمون الفرقان (ستمبر ۱۹۸۹) میں شائع ہوا ہے۔ ایک بزرگ عالم نے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی اور ان کی کتاب تقویۃ الایمان پر تنقید کی گئی تھی۔ مذکورہ کتاب کا ایک بیان یہ ہے کہ "خاندان شاہ ولی اللہ کے حالات پڑھنے اور سمجھنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مولانا اسماعیل نے واعظی کا پیشہ اپنا لیا تھا" صفحہ ۵۳

اس بیان کے ثبوت اور شہادت کے طور پر مصنف کتاب نے "ارواح ثلاثہ" کے حوالہ سے امیر شاہ خاں صاحب کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ "حج سے واپسی کے بعد چھ مہینہ دہلی میں قیام رہا اس زمانہ میں مولانا اسماعیل گلی کوچوں میں وعظ فرماتے تھے"

مگر یہ بالکل لغو اور بے دلیل بات ہے۔ مولانا اسماعیل شہید کے یہ مواعظ "بطور پیشہ" نہیں تھے بلکہ "بطور اصلاح" تھے۔ مسلمانوں کے اندر پھیلی ہوئی بدعات اور مشرکانہ اعمال کا انھیں بے پناہ درد تھا۔ وہ ان کو خالص توحید کی راہ پر لانا چاہتے تھے۔ اس تڑپ کے تحت وہ رات دن وعظ و نصیحت میں مشغول رہتے تھے۔ حتی کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی روایت کے مطابق، وہ ایک ایک دن میں بیس بیس جگہ وعظ کہتے تھے۔ یہ اصلاحی درد کی بنا پر تھا نہ کہ پیشہ ورانہ وعظ خوانی کی بنا پر۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے اپنے تردیدی مضمون میں اس سلسلہ کی بہت سی معلومات نقل کی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ مولانا اسماعیل شہید کی سرگرمیاں اصلاحی درد کی بنا پر تھیں نہ کہ پیشہ ورانہ وعظ خوانی کی بنا پر۔ اس مضمون کے آخر میں مولانا نعمانی نے فارسی کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے کہ عداوت کی آنکھ سے دیکھنے میں ہنر بھی بہت بڑا عیب بن جاتا ہے:

ہنر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیب است

رائے قائم کرنے کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ کسی بات کو آدمی کس نظر سے دیکھتا ہے۔ سیدھی نظر سے دیکھنے میں ایک چیز عین درست معلوم ہوگی۔ مگر اسی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھئے تو وہ سراسر غلط معلوم ہونے لگے گی۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ جو چیز سب سے بڑا ہنر ہے وہ سب سے بڑا عیب بن جائے۔

الٹی تفسیر

قرآن کی سورہ الفتح میں اس واقعہ پر تبصرہ ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس کی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب کہ وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، پس اللہ نے ان پر اطمینان (سکینت) اتارا اور ان کو ایک قریبی فتح دے دی۔ اور بہت سی غنیمت بھی جس کو وہ لیں گے، اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمت کا وعدہ کیا ہے جس کو تم لوگے۔ تو یہ تم کو فوراً دے دیا۔ اور اس نے لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے، اور تاکہ یہ اہل ایمان کے لیے ایک نشانی ہو اور تاکہ اللہ تم کو صراط مستقیم دکھائے (الفتح ۱۸-۲۰)

اردو کے ایک مفسر قرآن نے ان آیات میں سکینت اور صراط مستقیم پر جو تفسیری نوٹ لکھا ہے وہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"یہاں سکینت سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر ایک شخص کسی مقصد عظیم کے لیے ٹھنڈے دل سے پورے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو خطرہ کے منہ میں جھونک دیتا ہے۔ اور کسی خوف یا گھبراہٹ کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ کام بہر حال کرنے کا ہے خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔

یعنی تمہیں مزید بصیرت اور یقین حاصل ہو، اور آئندہ تم اسی طرح اللہ اور رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ اور اللہ کے اعتماد پر راہ حق میں پیش قدمی کرتے چلے جاؤ۔ اور یہ تجربات تمہیں یہ سبق سکھا دیں کہ خدا کا دین جس اقدام کا تقاضا کر رہا ہو، مومن کا کام یہ ہے کہ خدا کے بھروسہ پر وہ اقدام کر ڈالے، اس حیص بیص میں نہ لگ جائے کہ میری طاقت کتنی ہے اور باطل کی طاقتوں کا زور کتنا ہے"

اس موقع پر سکینت اور صراط مستقیم کی یہ تفسیر بالکل الٹی تفسیر ہے۔ یہاں سکینت سے مراد یہ ہے کہ دشمن کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود ان کا سکون قلب برہم نہیں ہوا۔ انتہائی نازک حالات میں بھی وہ رد عمل کی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ یہاں سکینت کا مطلب "تیجر کی پھلکی

بغیر اپنے آپ کو خطرات میں جھونک دینا" نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے مراد اپنے آپ کو ضد سے اور اس منفی نفسیات سے بچانا ہے جب کہ آدمی یہ نادانی کرتا ہے کہ وہ نتیجہ کی پروا کیے بغیر اپنے آپ کو خطرے کے منھ میں جھونک دیتا ہے۔

یہی معاملہ صراطِ مستقیم دکھانے کا بھی ہے۔ اس آیت میں صراطِ مستقیم سے مراد یہ نہیں ہے کہ آدمی "بس اقدام کر ڈالے، وہ اس حیص بیص میں نہ پڑے کہ میری طاقت کتنی ہے اور باطل کا زور کتنا" اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے جو مذکورہ تفسیری نوٹ میں پرجوش الفاظ میں بتایا گیا ہے۔ اس کا اصل مطلب اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونا ہے۔ صلح حدیبیہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے واقعاتی طور پر مسلمانوں کو یہ راستہ دکھایا کہ کامیابی کا راز اکثر اوقات ٹکراؤ میں نہیں ہوتا، بلکہ ٹکراؤ سے اعراض میں ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت کا اگر وہ مفہوم لیا جائے جو مذکورہ تفسیر میں بتایا گیا ہے تو اس کی سب سے پہلی خلاف ورزی کرنے والے خود رسول اور اصحاب رسول قرار پائیں گے جن کے اوپر قرآن کی یہ آیت اتری۔ کیوں کہ "حدیبیہ" کے موقع پر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ وہ مخالفین کی مخالفتوں کی پروا کیے بغیر عمرہ کا اقدام کر ڈالیں، وہ ہر حال میں مکہ میں داخل ہو جائیں، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

فتح بغیر جنگ

مسٹر رچرڈ نکسن ۱۹۶۸ سے ۱۹۷۴ تک امریکہ کے پریسیڈنٹ تھے ۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ــــ ۱۹۹۹، جنگ کے بغیر فتح :

Richard Nixon, 1999: Victory Without War

اس کتاب میں جو باتیں کہی گئی ہیں ، ان میں سے ایک بات امریکہ اور جاپان کے باہمی تعلق کے بارے میں ہے ۔ اس سلسلہ میں مسٹر نکسن نے جو باتیں لکھی ہیں ، ان میں سے ایک بات مختصر طور پر یہ ہے :

The Americans decimated Japan in 1945, and after World War II, rebuilt it with enormous economic backing as a model country to disprove the communist ideology that poverty cannot be removed through the process of capitalism. Democracy was planted on its territory in place of ancient monarchy. Its constitution was written by the Americans. Its defence was controlled from Washington DC. After 35 years of this experiment, bitter economic disagreements have clouded US-Japan relations in recent years. There is a terrific trade imbalance. In 1986 Japan sold goods to the US to the value of $60 billion in excess of the goods purchased from the States, contributing to the total American trade deficit of $170 billion. Indigenous rice production costs Japan $2,000 a ton, yet she is not prepared to buy rice from her benefactor, the US, offered at $180 a ton with a view "to protect Japanese farmers". The US is sore that the "Japanese have closed their markets to American goods" (p. 2).

امریکیوں نے ۱۹۴۵ میں جاپان کے بڑے حصہ کو تباہ کر دیا ۔ پھر دوسری عالمی جنگ کے بعد انھوں نے زبردست اقتصادی امداد کے ذریعہ جاپان کی دوبارہ تعمیر کی ۔ جاپان کے ساتھ یہ معاملہ انھوں نے اپنے ذاتی مقصد کے لیے ، ایک نمونہ کے ملک کے طور پر کیا ۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس اشتراکی نظریہ کو غلط ثابت کر سکیں کہ غریبی کو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ختم نہیں کیا جا سکتا ۔

چنانچہ جاپان میں قدیم بادشاہت کی جگہ جمہوریت لائی گئی ۔ امریکیوں نے خود وہاں کا دستور لکھ کر تیار کیا ۔ اس کا دفاع مکمل طور پر واشنگٹن کے تحت کر دیا گیا ۔

اس تجربہ کے ۴۰ سال بعد تلخ اقتصادی اختلافات کے بادل امریکہ اورجاپان کے تعلقات پر چھا گئے ۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی توازن ہولناک حد تک بگڑ گیا۔ ۱۹۸۶ میں امریکہ نے جتنا سامان جاپان کے ہاتھ بیچا، اس کے مقابلہ میں جاپان نے ساٹھ بلین ڈالر کے بقدر زیادہ سامان امریکہ کے ہاتھ فروخت کیا۔ واضح ہو کہ اس سال امریکہ کا کل تجارتی خسارہ ۱۷۰ بلین ڈالر تھا۔ جاپان اس پوزیشن میں ہو چکا ہے کہ اس نے امریکی چاول کی خریداری کے لیے ۱۸۰ ڈالر فی ٹن کی پیش کش کو رد کر دیا جب کہ اسے اپنے ملک میں چاول پیدا کرنے کے لیے ۲۰۰۰ ڈالر فی ٹن خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اب امریکہ کو یہ شکایت ہے کہ جاپانیوں نے امریکی سامان کے لیے اپنی مارکیٹ کو بند کر دیا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲ اپریل ۱۹۸۹)

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی حیثیت فاتح اور غالب کی تھی، اور جاپان کی حیثیت مفتوح اور مغلوب کی۔ مگر فاتح نے جو اقدامات اپنے مفاد کے لیے کیے، اس کو مفتوح نے اپنے مفاد میں تبدیل کر لیا۔ یہی موجودہ دنیا کا امتحان ہے۔ اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دشمن کے مخالفانہ منصوبوں میں اپنے لیے موافق پہلو تلاش کر لیں جو دشمن کی تدبیروں کو اپنے لیے زینہ بنا کر آگے بڑھ جائیں۔

اس دنیا میں شکست بھی فتح کا دروازہ کھولتی ہے۔ یہاں جنگ کے بغیر بھی کامیاب مقابلہ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ دانش مندوں کے لیے ہے۔ نادانوں کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی بھی حقیقی کامیابی مقدر نہیں۔ ان کے لیے فتح بھی شکست ہے اور شکست بھی شکست۔

مواقع کی بربادی

انڈین نیشنل کانگریس ۱۹ ویں صدی کے آخر میں قائم ہوئی۔ اس کا پہلا سشن ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس سشن میں کل ۷۲ ڈیلی گیٹ شریک تھے۔ اس سشن کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ لندن کے اخبار ٹائمس (The Times) میں اس کی خبر شائع ہوئی تو انگریز نامہ نگار نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے مزید یہ الفاظ لکھے کہ اس اجتماع میں جو بات سب سے زیادہ محسوس ہوئی وہ یہ کہ اس میں ایک عظیم نسل موجود ہی نہ تھی، یعنی ہندستانی مسلمان :

Only one great race was conspicuous by its absence; the Mahomedans of India were not there.
M.J. Akbar, Nehru: The Making of India, (p. 46).

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سو برس پہلے اس ملک میں مسلمانوں کا مقام کتنا اونچا تھا۔ کوئی سیاسی اجتماع یا کوئی سیاسی فیصلہ اس وقت تک نامکمل سمجھا جاتا تھا جب تک مسلمانوں کے نمائندہ افراد اس میں شریک نہ ہوں۔

تاہم "۱۸۸۵" میں مسلمانوں کا یہ مقام ان کے حال کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ یہ صرف ان کے ماضی کی بنیاد پر تھا۔ یعنی اس وقت مسلمانوں کے جو رہنما موجود تھے، ان کی اپنی بنائی ہوئی تاریخ کی وجہ سے انھیں یہ بلند مقام نہیں ملا تھا، بلکہ مسلمانوں کی سابقہ تاریخ کی بنا پر یہ مقام ان کے حصہ میں آیا تھا۔ یہ دراصل گزری ہوئی تاریخ کا تسلسل تھا جو اتفاقی طور پر ان کو حاصل ہو گیا۔

مگر وہ ماضی کے اس قیمتی اثاثہ کی قدر نہ کر سکے۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی کے نصف اول کے مسلم رہنماؤں نے اس کو مکمل طور پر کھو دیا۔ اگر وہ حاصل شدہ وسائل اور امکانی مواقع دونوں کو اچھی طرح سمجھتے اور حقیقت پسندانہ انداز سے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرتے تو یقیناً آج مسلمانوں کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مگر اس معاملہ میں ان کا حال اس نالائق اولاد کا ہوا جو اپنے باپ کی وراثت میں ایک بڑا سرمایہ پائے اور پھر اس کو جھوٹی سرگرمیوں میں خرچ کر کے ضائع کر دے۔ یہاں تک کہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے۔

زمانہ کے خلاف

ٹائمس آف انڈیا (۶ جولائی ۱۹۸۹) میں مسٹر رمن نندا کے قلم سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جو وزیر اعظم راجیو گاندھی کے صاحبزادہ راہل گاندھی سے متعلق ہے۔

راہل گاندھی نے نئی دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں ہسٹری (آنرز) کورس میں داخلہ لیا ہے۔ وہ اس مضمون کے لیے منتخب کیے جانے والے ۷۱ طلبہ میں سے ایک ہیں۔ راہل کے کالج جانے کے وقت کالج میں مسلسل پہرہ رہتا ہے۔ وہ کانڈوز (Black Cats) کے زبردست پہرہ کے اندر کالج جاتے ہیں اور واپس لوٹتے ہیں۔

کالج کے ایک استاد ڈاکٹر ایس سی بھارگوا (فزکس لکچرر) کو "ایک طالب علم" کا ٹیلیفون ملا کہ وہ ان سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے اپنے مکان پر ملاقات کے لیے بلایا۔ ڈاکٹر بھارگوا جب وقت پر گھر پہنچے تو وہاں سیکورٹی کے لوگوں نے ان کے مکان کو گھیر رکھا تھا۔ ان کو مکان کے اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ انھیں صرف اس وقت داخلہ کی اجازت ملی جب کہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ وہی ڈاکٹر بھارگوا ہیں جن سے ملنے کے لیے مذکورہ طالب علم یہاں آیا ہوا ہے۔

یہ وی وی آئی پی طالب علم وزیر اعظم راجیو گاندھی کا بیٹا راہل گاندھی تھا۔ رپورٹ میں بتایا ہے کہ راہل نے ڈاکٹر بھارگوا سے یہ مشورہ چاہا تھا کہ وہ اقتصادیات کا مضمون لے یا تاریخ کا مضمون۔ ڈاکٹر بھارگوا نے اس کو بتایا کہ طالب علم کے نمبر کو دیکھتے ہوئے اقتصادیات کے کورس میں اس کا داخلہ مشکل ہوگا، اس لیے اسکو اقتصادیات کے بجائے تاریخ کا مضمون لینا چاہیے:

Rahul, who sought Dr. Bhargava's advice on whether he should take up economics or history, was told by the lecturer that considering his percentage, admission to the economics course may be difficult and he should instead opt for history (p. 5).

جہاں تعلیمی مقابلہ کا یہ حال ہو کہ وزیر اعظم کے بیٹے کو بھی میرٹ کی بنیاد پر داخلہ ملے وہاں رعایتی داخلہ کا مطالبہ کرنا عجیب بھی ہے اور ناقابلِ حصول بھی۔

نئے دور کا آغاز

انگریزی کے ایک مسلم ہفت روزہ نے اپنی اشاعت ۱ ـ ۷ اکتوبر ۱۹۸۹ کے صفحہ اول کے مضمون میں لکھا ہے کہ بابری مسجد کے اشو کو لے کر آر ایس ایس، بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیو سینا مسلسل طور پر مسلمانوں کو مشتعل کرنے والی باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ مسلمان بھڑک کر تشدد کی کارروائی کریں تاکہ انھیں مسلمانوں کے خلاف فساد کرنے کا موقع ملے۔ مگر مسلمان صبر سے کام لے رہے ہیں۔ وہ اس سے انکار کر رہے ہیں کہ ان کی اشتعال انگیز باتوں سے وہ مشتعل ہو جائیں، جیسا کہ انھیں کرنا چاہیے :

Muslims are refusing to be provoked, as they should.

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ مسلمان بڑے پیمانہ پر صابرانہ پالیسی کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہیں ہو رہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل پہلی بار پیش آ رہا ہے کہ کسی مسلم اخبار کو مسلمانوں کے بارہ میں مذکورہ بالا الفاظ لکھنے کے لیے ملیں۔

ورنہ ۱۹۴۷ کے بعد سے مسلسل اس سے مختلف ذہن ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے تمام رہنما اور دانشور صرف ایک بات بولنا اور لکھنا جانتے تھے ـ وہ یہ کہ مسلمان جب کسی بات پر مشتعل ہوں تو وہ ان کے مشتعل ہونے کو فطری ردعمل قرار دے کر اس کی توجیہہ کریں۔ مثلاً اسی مذکورہ انگریزی اخبار نے اپنی اشاعت ۹ جون ۱۹۸۴ میں بھیونڈی اور بمبئی کے علاقہ میں مسلمانوں کے ردعمل کا ذکر کیا تھا جس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کے ردعمل کو جائز قرار دیتے ہوئے اخبار مذکور نے لکھا تھا کہ ـــــ مگر ایک شخص کو یہ کہنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا کہ اس سلسلہ میں ابتدائی اشتعال شیو سینا کے لیڈر کی طرف سے فراہم کیا گیا تھا :

But one need not strain one's commonsense to conclude that the initial provocation had come from the Shiva Sena chief.

حقیقت یہ ہے کہ چالیس سال سے تمام رہنماؤں اور دانشوروں کو ایک ہی بولی معلوم تھی ـــ وہ یہ کہ مسلمانوں کا ردعمل فطری ہے، کیونکہ وہ فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیزی کے بعد سامنے آیا ہے۔ "اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا" ایک ایسا تصور ہے جو لیڈروں اور دانشوروں کی پوری جماعت کے لیے

یکسر لامعلوم تھا۔ اسی بنا پر وہ عام مسلمانوں کے لیے بھی لامعلوم بنا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ انھیں بتایا ہی نہیں گیا تھا۔

الرسالہ نے پچھلے تقریباً پندرہ سال کے اندر اس نئے تصور کو اتنی طاقت کے ساتھ پھیلایا کہ آج وہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کا پسندیدہ فکر بن گیا۔ اس کا عملی ظہور اس طرح شروع ہو چکا ہے کہ ۱۹۸۹ء میں انتہائی گرم ماحول کے باوجود مقابلۃً بہت ہی کم فسادات ہوئے۔ رپورٹیں بتا رہی ہیں کہ جگہ جگہ مسلمان صبر اور اعراض کی پالیسی کو اختیار کر کے فساد کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے کچھ سطحی لیڈر اگرچہ اب بھی ردعمل کی آگ بھڑکانے میں مشغول ہیں، مگر اللہ تعالیٰ الرسالہ کے ذریعہ اس آگ کو مسلسل بجھا رہا ہے (المائدہ ۶۴)

الرسالہ مشن کی پیدا کردہ اسی صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارے اخباروں کو پرفخر طور پر وہ الفاظ لکھنے کو مل رہے ہیں جس کی ایک مثال اوپر نقل کی گئی۔ یہ اخبارات اگر دیانت دار ہوں تو ان کے لیے زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اپنے مضامین میں اس طرح کے الفاظ لکھیں کہ ــــــ ہم نے تو مسلمانوں کو ردعمل کی آگ میں جھونکنے کی پوری کوشش کی تھی، مگر یہ الرسالہ کا کارنامہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو جوابی اشتعال سے بچا لیا اور وہ فساد کی بھیانک آگ میں جلنے سے محفوظ رہے۔

بابری مسجد تحریک ہندستان میں جذباتی اندازِ کار کا خاتمہ اور حقیقت پسندانہ اندازِ کار کا آغاز ہے۔ اس تحریک نے ایک طرف نام نہاد مسلم قیادت کو ہمیشہ کے لیے پیچھے دھکیل دیا۔ اور دوسری طرف اس قیادت کے کھنڈرسے الرسالہ مشن کو نئی طاقت کے ساتھ اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ فللّٰہ الحمد۔

ایجنسی ایک پروگرام

اگر آپ الرسالہ کو پسند کرتے ہیں تو الرسالہ کی ایجنسی لیجئے۔ الرسالہ کی ایجنسی لینا اپنی پسند کو ایک متحرک مشن بنا دینا ہے۔

ایک نمونہ

مسٹر ششی پرشاد گوئل (۲۲ سال) میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۸۹ کے سول سروسز امتحانات میں انھوں نے ٹاپ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آئی اے ایس میں شرکت سے ان کا مقصد روپیہ کمانا نہیں ہے۔ بلکہ اس جاب کی باعزت حیثیت (Dignified status) ان کے لیے کشش کا باعث ہوئی۔

مسٹر گوئل کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۸ جون ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ سول سروس میں داخل ہونے کا ذہن ان کے اندر اس وقت بنا جب کہ انھوں نے مسٹر جاوید عثمانی کا انٹرویو پڑھا۔ مسٹر عثمانی نے محض اپنی ذاتی محنت سے ۱۹۸۱ کے سول سروس امتحان میں ٹاپ کیا تھا۔ وہ ان کے نمونہ سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ اس وقت سے ان کا یہ ذہن بن گیا کہ ایک شخص سول سروس کے ذریعہ قوم کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتا ہے:

> **His mind was made up after he read the interview of Mr. Javed Usmani, the topper in the civil services examinations in 1981. "I was so inspired by his example that since that day I have thought that one can serve the nation best only through the civil services" (p. 3).**

مسٹر جاوید عثمانی کے پاس کہنے کے لیے اگر یہ ہوتا کہ اس ملک میں تعصب ہے، یہاں ان کے لیے ترقی کے مواقع نہیں ہیں، تو مسٹر گوئل کو ان کے کلام سے کوئی تحریک نہ ملتی۔ مگر جب انھوں نے تعصب کو نظر انداز کر کے محنت کو ترقی کا زینہ بتایا تو مسٹر گوئل کو اس میں خود اپنی ترقی کا نسخہ مل گیا۔ اس کو اختیار کر کے وہ ایک باعزت عہدہ تک پہونچ گیے۔

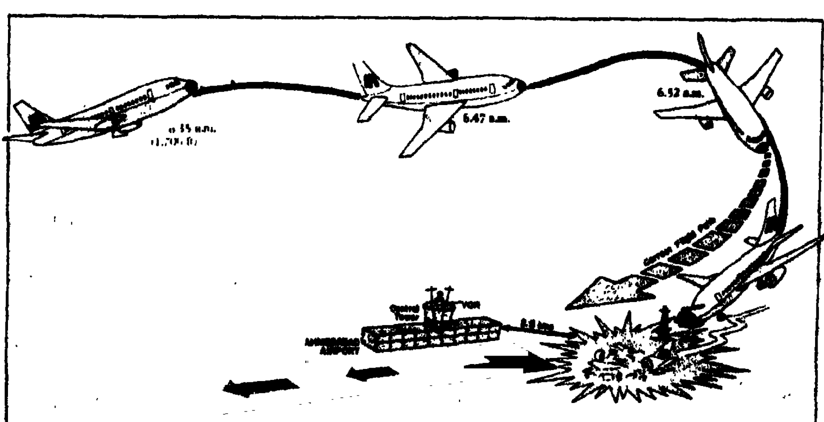
آج مسلمان اس ملک میں احتجاجی گروہ (Protestant group) بنے ہوتے ہیں۔ اگر وہ مسٹر جاوید عثمانی کی طرح اپنی افادیت ثابت کریں تو وہ اس ملک میں تخلیقی گروہ (Creative group) بن جائیں گے۔ احتجاجی لوگ نہ اپنے آپ کو کچھ دیتے ہیں اور نہ دوسروں کو۔ مگر جو لوگ تخلیقی گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں وہ خود بھی پاتے ہیں اور دوسروں کو بھی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس ملک میں تخلیقی گروہ بننے کے امکانات پوری طرح موجود تھے۔ مگر ان کے لیڈروں کی جھوٹی سیاست نے انھیں اس کے سوا کسی قابل نہ رکھا کہ وہ اس ملک میں بے اثر احتجاجی گروہ بن کر رہ جائیں۔

عبرت ناک حادثہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کا ایک سیدھا راستہ ہے، اور کچھ ٹیڑھے راستے بھی ہیں۔ سیدھے راستہ پر چلنے والا بحفاظت اللہ تک پہونچتا ہے، اور جو لوگ ٹیڑھے راستوں پر چلیں وہ آخر کار برباد ہو کر رہ جاتے ہیں (النحل ۹) دنیا میں بار بار ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس معاملہ کو تمثیل کے روپ میں بتاتے ہیں۔ جو آدمی کو اس سنگین حقیقت کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں ایسا ہی ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

انڈیا ٹوڈے (۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹) میں ایک ہوائی حادثہ کی باتصویر تفصیلات چھپی ہیں۔ یہ اس کورٹ آف انکوائری کی رپورٹ پر مبنی ہیں جو اس سلسلہ میں جسٹس اے کے ماتھر کی سربراہی میں حکومت کی طرف سے مقرر کی گئی تھی۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ کو انڈین ایر لائنز کا ایک جہاز (فلائٹ ۱۱۳) بمبئی سے احمد آباد کے لیے اڑا۔ روانگی سے ۳۰ منٹ پہلے فلائٹ ڈسپیچ آفیسر اے کے بنرجی نے جہاز کے پائلٹ کو ایک ٹائپ کی ہوئی شیٹ دی۔ پائلٹ کا نام مسٹر دلایا تھا۔ یہ معمول کی شیٹ تھی جس کو ایرپورٹ کی اصطلاح میں نوٹم (Notam) کہا جاتا ہے۔ یعنی ہوائی عملہ کے لیے ضروری اطلاع



(Notice to airmen) اس شیٹ میں درج تھا کہ احمد آباد ایرپورٹ کی رہنا روشنیاں اور لینڈنگ کے مددگار آلات ناکارہ (Non-functional) حالت میں ہیں۔ مگر آخری لمحات میں پائلٹ اور کو پائلٹ کے درمیان گفت گو کا جو ریکارڈ "بلیک باکس" کے ذریعہ ملا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پائلٹ نے مذکورہ معلوماتی شیٹ کو نہیں پڑھا۔ انھوں نے اس کو پڑھے بغیر ایک خانہ میں ڈال دیا اور اپنا سفر شروع کر دیا۔

وہ بے خبری کے ساتھ ہوائی جہاز کو اڑاتے ہوئے احمد آباد کے قریب پہونچے۔ پھر وہ اترتے ہوئے ایک ہزار فٹ کی بلندی تک آگئے۔ ان پر لازم تھا کہ وہ ان ضروری احتیاطوں کو ملحوظ رکھیں جو آلات کی مدد کے بغیر آنکھ سے دیکھ کر اترنے کی صورت میں اختیار کی جاتی ہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے ایرپورٹ کے آلات کی رہنمائی پر بھروسہ کیا جو اپنی ناقص کارکردگی کی وجہ سے انھیں غلط اطلاعات دے رہا تھا۔

جہاز جب ایرپورٹ سے تقریباً دو کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا تو وہ اپنے صحیح راستہ سے ہٹ گیا۔ فضا میں کہر ہونے کی وجہ سے ایرپورٹ بھی زیادہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاز رن وے پر اترنے کے بجائے باہر ناہموار زمین پر اتر گیا۔ ایک سکنڈ کے اندر جہاز کے اندر آگ لگ گئی۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ کو صبح ۷ بجے پیش آیا۔ ۱۳۸ مسافر ہلاک ہو گئے۔ صرف دو آدمی شدید زخمی حالت میں بچ سکے۔ بالمقابل صفحہ پر اس کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ ایک دنیوی مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کا ہر آدمی گویا ایک مسافر ہے۔ ہر آدمی آخرت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مگر ہر سفر یکساں نہیں۔ ایک سفر وہ ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے سیدھے راستہ پر جاری ہو۔ دوسرا سفر وہ ہے جس میں آدمی خود اپنی رائے کے تحت ٹیڑھے راستہ پر دوڑنے لگے۔

دونوں سفروں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ سیدھے راستہ پر اپنا سفر طے کریں گے، وہ آخرت میں صحیح منزل پر اتریں گے۔ ان کے لیے وہاں امن اور راحت کی زندگی ہو گی۔ اس کے برعکس جو لوگ ٹیڑھے راستہ پر سفر کریں گے، ان کی سواری جب آخرت کے عالم میں پہونچے گی تو وہ بربادی کے مقام پر گر پڑے گی اور ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہو جائے گی۔

روشن مستقبل

الرسالہ مارچ ۱۹۸۹ کے سرورق پر لکھا گیا تھا ـــــــ ہر قسم کے فساد کے خلاف سب سے بڑا روک صرف ایک ہے : اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔

اس میں شک نہیں کہ یہی فسادات کو روکنے کا واحد کارگر اصول ہے۔ اس کے سوا جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ سب کی سب صرف جھگڑے کو بڑھانے والی ہیں نہ کہ اس کو ختم کرنے والی۔ مزید یہ کہ اس اصول کا تعلق صرف ہندستان سے نہیں، بلکہ تمام دنیا سے ہے۔ خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ایک قوم کا معاملہ ہو یا کئی قوموں کا معاملہ، ہر جگہ فساد سے بچنے اور پر امن زندگی گزارنے کا یہی بے خطا اصول ہے۔ مسلمانوں کو جہاں کہیں بھی پر امن زندگی حاصل ہے، وہ اسی لیے حاصل ہے کہ وہاں انھوں نے یہ قیمت ادا کر دی ہے۔ اور جہاں کہیں انھیں پر امن زندگی حاصل نہیں، وہ اسی لیے حاصل نہیں کہ وہاں وہ یہ ضروری قیمت دینے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے لیڈر اور دانشور اب تک جس روش پر قائم رہے ہیں، اس کو، ایک لفظ میں، دل کی بھڑاس نکالنا کہا جا سکتا ہے۔ مگر الفاظ بول کر دل کی بھڑاس نکالنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ضرورت ہے کہ اب اس معاملہ میں اپنی کوششوں کو نتیجہ رخی (Result-oriented) بنایا جائے۔ مسئلہ کا حل تلاش کرنے پر ساری توجہ صرف کی جائے نہ کہ مسئلہ کے خلاف لفظی احتجاج کرنے پر۔

ہندستان کے فسادات

ہندستان میں پچھلی آدھی صدی سے فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔ ان فسادات کی کہانی ہمیشہ تقریباً ایک ہوتی ہے۔ انتہا پسند ہندوؤں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کارروائی کی جاتی ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کرتے ہیں۔ اب نزاع بڑھتی ہے، یہاں تک کہ باقاعدہ فساد ہو جاتا ہے جو بالآخر مسلمانوں کے سخت جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔

ایسے موقع پر مسلم رہنما اور دانشور ہمیشہ مسلمانوں کے ردعمل کو یہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ جوابی طور پر پیش آیا۔ اس سلسلہ میں کوٹہ (راجستھان) کے فساد کی مثال لیجئے۔ ایک مسلم انگریزی ہفت روزہ (۸۔۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹) کی اپنی رپورٹ کے مطابق، ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ کو کوٹہ میں ہندوؤں نے اننت چتردشی کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس مسلم علاقہ سے گزرا۔ وہاں اس نے اشتعال انگیز نعرے لگائے جو مسلمانوں کے جذبات

کو مجروح کرنے والے تھے۔ مسلمانوں نے جلوس والوں کو ایسے نعرے لگانے سے روکا۔ مگر وہ نہیں رکے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بھی جوابی طور پر نعرے بلند کیے۔ اس کے بعد (ہندوؤں کی طرف سے) مسلمانوں پر پتھر پھینکے گئے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی ان پر پتھر پھینکے۔ اس کے بعد فساد بھڑک اٹھا۔ ۱۰ مسلمان مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ ان کی بہت سی دکانیں اور مکانات جلا دیے گئے۔ (صفحہ ۳) نیز دعوت ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۹

اسی طرح بدایوں (یوپی) میں ۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ کو فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اتر پردیش کی کانگرسی حکومت نے اردو کو ریاست کی سکنڈ لینگویج قرار دینے کا بل پاس کیا۔ اس پر بدایوں کے شری کرشن انٹر کالج کے ہندو طلبہ نے اردو کی مخالفت میں ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں مشتعل کرنے والے نعرے لگائے گئے۔ یہ جلوس کلکٹریٹ تک جاکر ختم ہو گیا اور اس دن کوئی فساد پیش نہیں آیا۔

اگلے دن (۲۸ ستمبر) کو بدایوں کے اسلامیہ انٹر کالج کے مسلم طلبہ نے تقریباً تین سو کی تعداد میں جمع ہو کر جوابی جلوس نکالا۔ یہ جلوس نعرہ لگاتا ہوا شری کرشن انٹر کالج کے سامنے سے گزرا۔ وہاں مسلم طلبہ پر پتھراؤ ہوا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی ویسا ہی کیا۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا (قومی آواز ۹ اکتوبر ۱۹۸۹)

یہی اکثر فسادات کی کہانی ہے۔ مسلم ترجمانوں کے خود اپنے بیان کے مطابق، ہندوؤں کی طرف سے جلوس، لاؤڈ اسپیکر، ہولی کے رنگ، نعرہ بازی یا اور کسی صورت میں اشتعال انگیزی کا واقعہ پیش آتا ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو کر ان سے ٹکرا جاتے ہیں۔ اب لڑائی بڑھتی ہے اور باقاعدہ فساد کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو "نزلہ بر عضو ضعیف" کے اصول پر ہمیشہ مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتی ہے۔

منفی ردعمل

مسلمانوں کا یہ طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ ہے۔ اور ایسا طریقہ یقینی طور پر قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ ایسے مواقع پر قرآن نے اعراض کا حکم دیا ہے نہ کہ جوابی طور پر الجھنے کا۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ قسم کی جوابی کارروائی میں مسلمانوں کا ایک محدود طبقہ ہی ملوث ہوتا ہے۔ مگر دوسرے مسلمان، خاص طور پر مسلمانوں کا رہنما اور دانشور طبقہ، بھی پوری طرح اس میں شریک ہے، کیونکہ وہ ان کی مذمت نہیں کرتا، بلکہ ان کی جوابی کارروائی کو جائز قرار دے کر ان کا لفظی دفاع کرتا ہے۔ کچھ مسلمان اگر اس منفی ردعمل میں براہ راست طور پر شریک ہیں تو بقیہ مسلمان

اس میں بالواسطہ طور پر شریک قرار پاتے ہیں۔

مسلمان پچھلے پچاس برس سے اسی جوابی روش پر قائم ہیں اور وہ اس کو جہاد سمجھتے ہیں۔ مگر اصل مسئلہ کا حل نہ ہونا بلکہ اس کا بڑھتے رہنا ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی منشا کے خلاف ہے۔ اگر ان کا عمل خدا کی منشا کے مطابق ہوتا تو خدا کی مدد آتی اور مسئلہ کو حل کر دیتی۔ مگر جان و مال کی بے پناہ ہلاکت کے باوجود اب تک اس معاملہ میں خدا کی مدد نہیں آئی۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں کا یہ عمل خدا کے نقشہ کے مطابق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان اور ان کے رہنما اپنی اس روش کو مکمل طور پر بدل ڈالیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ صورت حال اور خراب ہو جائے۔ اب تک وہ انسانوں کی پکڑ میں تھے، آئندہ وہ خدائے ذوالجلال کی پکڑ میں آجائیں۔

قرآن وحدیث کی رہنمائی

مسلمانوں کا یہ طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ ہے، اور اس قسم کے ردعمل سے قرآن وحدیث میں صراحۃً منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات انھیں کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبہ والا ہے (حٰم السجدہ ۳۴ - ۳۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللّٰہ لا یمحوا السیئ بالسیئ ولکن یمحوا السیئ بالحسن۔ انّ الخبیث لا یمحوا الخبیث (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۸۴۵)	اللہ برائی کو برائی کے ذریعہ نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ مٹاتا ہے۔ بری چیز کبھی بری چیز کو نہیں مٹاتی۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے مذکورہ قرآنی آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

امر اللّٰہ المومنین بالصبر عند الغضب والحلم عند الجھل والعفو عند الإساءۃ فاذا فعلوا ذلک عصمھم اللّٰہ من الشیطان وخضع لھم عدوھم کانہ ولی حمیم	اللہ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے غصہ کے وقت صبر کا، جہالت کے وقت برداشت کا، اور برائی کے وقت معافی کا۔ جب وہ ایسا کریں تو اللہ انہیں شیطان سے محفوظ کر دے گا اور ان کے دشمن کو ان کے لیے جھکا دے گا گویا

(تفسیر ابن کثیر، الجزء السابع، صفحہ ۱۰۱) کہ وہ ان کا قریبی دوست ہو۔

مذکورہ آیت اور حدیث اور صحابی کی تشریح کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں مسلمان جو کچھ کر تے رہے ہیں وہ سراسر شریعت اسلامی کے خلاف ہے۔ مسلمان ردعمل کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمان اپنے نام نہاد رہنماؤں کے بتائے ہوئے حل پر پچاس برس تک کم از کم پچاس ہزار بار عمل کر چکے اور ہمیشہ ناکام رہے۔ اب انھیں خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کا تجربہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ مسلمان برائی کے بدلہ میں بھلائی کی روش اختیار کریں۔ وہ شور کا جواب خاموشی سے دیں اور نفرت کے مقابلہ میں محبت کا مظاہرہ کریں۔

خدا نے اپنی دنیا کا جو نظام بنایا ہے اس میں برائی کا خاتمہ جوابی برائی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے۔ خدا کی دنیا میں صبر کی طاقت غصہ سے زیادہ ہے۔ یہاں جہالت کے مقابلہ میں برداشت زیادہ وزن رکھتی ہے۔ یہاں انتقام کے بجائے معاف کر دینا اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ یہاں دشمن کو زیر کرنے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ دوستی اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے۔

نرمی اور تحمل کے طریقہ کی اہمیت حدیث میں مختلف طریقوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بتائی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ تعالیٰ رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف ومالا یعطی علی ما سواہ۔ ۔ ۔ ان الرفق لایکون فی شیٔ الا زانہ ولا ینزع من شیٔ الا شانہ ۔ ۔ ۔ من یحرم الرفق یحرم الخیر (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۰۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرم و مہربان ہے اور نرمی و مہربانی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی اور چیز پر دیتا۔ نرمی جس چیز میں بھی ہو وہ اس کو زینت دے گی۔ اور وہ جس چیز سے بھی اٹھ جائے وہ اس کو عیب دار بنا دے گی۔ جو شخص نرمی سے خالی ہو وہ ہر بھلائی سے خالی ہو جائے گا۔

صبر و اعراض ایک اعلیٰ ترین حفاظتی تدبیر ہے۔ اس تدبیر کے ذریعہ آپ فساد کے ہر مہم کو یقیناً ناکام

(De-fuse) کر سکتے ہیں۔ یہ حل ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے۔ اس کو اختیار کر کے مسلمان اپنا مسئلہ بھی حل کریں گے، اور اسی کے ساتھ انھیں عبادت کا ثواب بھی حاصل ہوگا، کیونکہ یہ حل خود خدا و رسولؐ کی طرف سے ہمیں بتایا گیا ہے۔

مثبت طرز عمل کی مثال

اوپر کوٹہ اور بدایوں کی مثال نقل کی گئی ہے جب کہ مسلمانوں نے منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کیا اور اس کا برا انجام ان کے سامنے آیا۔ اب اس کے برعکس دو مثالیں لیجیے جب کہ مسلمانوں نے جوابی کارروائی سے پرہیز کرتے ہوئے مثبت روش اختیار کی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے جان و مال بربادی سے محفوظ رہے۔

فروری ۱۹۸۹ میں شیو گنج (راجستھان) میں ہیڈگواڑ جنم شتابدی کے موقع پر ہندوؤں نے جلوس نکالا۔ جلوس مقامی جامع مسجد کے سامنے پہنچ کر اشتعال انگیز نعرے لگانے لگا۔ مگر وہاں کوئی مسلمان ان کا جواب دینے یا روک ٹوک کرنے کے لیے سامنے نہیں آیا۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسجد کے امام مولانا خدا بخش بلوچ باہر نکلے۔ انھوں نے جوابی اشتعال کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سادہ طور پر یہ کیا کہ جلوس کے افراد سے دوستانہ ملاقات شروع کر دی۔ ان کے "آداب عرض" کو دیکھ کر جلوس کے نوجوان بھی "مولوی جی نمستے، مولوی جی نمستے" کے الفاظ بولنے لگے۔ اس کے بعد جلوس کا سارا زور اپنے آپ ختم ہو گیا۔ پانچ منٹ میں لوگ ٹھنڈے ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

دوسری مثال دہلی کی ہے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو وشو ہندو پریشد کی طرف سے دہلی میں "وراٹ ہندو سمیلن" منایا گیا۔ بوٹ کلب پر بڑی تعداد میں ہندو جمع ہوئے۔ وہاں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور مخالفانہ نعرے لگائے گئے۔ ہندوؤں کا یہ ہجوم بوٹ کلب سے واپس ہوا تو وہ مسلم مخالف نعرے لگا رہا تھا۔ مثلاً "ہندو بن کر رہنا ہوگا، بندے ماترم کہنا ہوگا" وغیرہ۔ انھوں نے اپنے راستہ میں مسجدوں کی بے حرمتی کی۔ نئی دہلی کی ایک مسجد کا بورڈ توڑ ڈالا۔۔ وغیرہ

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر دہلی کے مسلمان پوری طرح اعراض کی پالیسی پر قائم رہے۔ انھوں نے سنا مگر اپنے کان بند کر لیے۔ انھوں نے دیکھا مگر اپنی نظریں پھیر لیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ ۲۲ ستمبر کو دہلی میں کوئی فساد ہوا اور نہ اس کے بعد۔ ہندوؤں کے مخالفانہ الفاظ وقتی شور وغل بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

یہ صرف دو مثالیں نہیں ہیں۔ اس طرح کی مثالیں بڑی تعداد میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ

ہے کہ فساد ہونے کے مقابلہ میں فساد نہ ہونے کے واقعات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ مگر اول الذکر واقعات اخباروں میں چھپ کر مشہور ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر واقعات اخباروں میں نہیں چھپتے، اس لیے وہ لوگوں کے علم میں بھی نہیں آتے۔

صحابی کی نصیحت

ہندستان کے فسادات کا بہترین حل وہ ہے جو ایک صحابی نے ۱۴ سو سال پہلے بتا دیا تھا۔ یہ حضرت عُمیر بن حبیب بن خُماشہ ہیں۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

من لا یرضی بالقلیل مما یأتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر (حیاۃ الصحابۃ، الجزء الثانی، صفحہ ۶۴۷)

جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والی چھوٹی تکلیف پر راضی نہ ہوگا اس کو نادان کی طرف سے بڑی تکلیف پر راضی ہونا پڑے گا۔

صحابی کے اس قول میں زندگی کی ایک حقیقت بتائی گئی ہے۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں جتنی بامعنی تھی، اتنی ہی بامعنی وہ آج بھی ہے۔ وہ جس طرح مسلم اکثریت کے ملک میں اہمیت رکھتی تھی، اسی طرح وہ غیر مسلم اکثریت کے ملک میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں بہر حال دوسروں کی طرف سے تکلیف کی باتیں پیش آتی ہیں۔ یہاں عقل مندی اور کامیابی یہ ہے کہ ابتدائی چھوٹی تکلیف کو برداشت کر لیا جائے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو معاملہ بڑھتا ہے اور زیادہ بڑی تکلیف سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بڑی تکلیف سے بچنے کا واحد راز چھوٹی تکلیف کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہی کامیاب زندگی کا واحد اصول ہے، خواہ گھر کا معاملہ ہو یا سماج کا معاملہ یا پورے ملک کا معاملہ۔

اس کی ایک مثال جلوس کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندوؤں کا جلوس باجا بجاتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا اس وقت مسلمانوں نے باجا کو برداشت نہیں کیا اور جلوس کی روٹ بدلنے پر اصرار کیا۔ اس سے مسئلہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ بعد کو مزید یہ خرابی پیدا ہوئی کہ ہندوؤں کا جلوس اسی کے ساتھ مسلم مخالف نعرے بھی لگانے لگا۔ اس پر مسلمانوں نے دوبارہ روک ٹوک کی۔ اب یہ ہوا کہ جلوس اور نعرہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ اس میں تیسری چیز کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ کہ جلوس باجے اور نعرے کے ساتھ ٹرک میں پتھر بھر کر چلنے لگا تاکہ مسجدوں اور مسلم محلوں پر خشت باری کرتا ہوا گزرے۔ مزید یہ کہ پہلے اگر جلوس سال میں چند بار

نکلتا تھا تو اب وہ روزانہ اور ہر جگہ نکلنے لگا۔

بڑھتے ہوئے مسائل کی یہ صورت حال صحابی کی نصیحت کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی ردعمل کی سیاست کو بالکل بے فائدہ ثابت کر رہی ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان صحابی کی مذکورہ نصیحت کی اہمیت کو سمجھیں اور ردعمل کی روش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔

دوسری غلطی نہیں

فساد کا حل سادہ لفظ میں صرف ایک ہے ——— "دوسری غلطی نہ کیجئے"۔ ایک فریق کی طرف سے کی جانے والی پہلی غلطی کبھی فساد تک نہیں پہنچ سکتی، جب تک فریق ثانی دوسری غلطی نہ کرے۔ جس طرح دونوں ہاتھوں کو حرکت میں لائے بغیر تالی نہیں بجتی، اسی طرح صرف پہلی غلطی فساد برپا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ مسلمان اگر یہ طے کرلیں کہ وہ فرقہ پرست عناصر کی پہلی غلطی کے باوجود کبھی دوسری غلطی نہ کریں گے تو صرف اس ایک فیصلہ سے وہ فساد کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔

پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا فساد کو پھیلنے کا موقع دینا ہے۔ اس کے برعکس جب پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کی جائے تو فساد اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو کر رہ جائے گا۔ پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا گویا آگ پر پٹرول ڈالنا ہے، اور پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کرنا گویا آگ پر پانی ڈالنا۔

مسلمان ہر سال بے شمار تعداد میں سیرۃ النبیؐ کے جلسے کرتے ہیں۔ ان جلسوں میں پر فخر طور پر کہا جاتا ہے کہ "سلام اس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں"۔ مسلم شعراء جوش و خروش کے ساتھ اس قسم کی نظمیں پڑھتے ہیں :

راہ میں جس نے کانٹے بچھائے گالی دی پتھر برسائے   اس پر چھڑکی پیار کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کی جس صفت کو بطور فخر پیش کرتے رہے ہیں، اس کو اپنی زندگیوں میں بطور نمونہ اختیار کرلیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے امتی بھی بن جائیں گے اور اسی کے ساتھ تعصب اور ظلم اور فساد کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا جس طرح وہ رسول اور اصحاب رسول کے لیے اسی طریقہ کو اختیار کرنے کی بنا پر ختم ہو گیا تھا۔

داعیانہ اخلاق

صبر و اعراض کی اہمیت صرف اس لحاظ سے نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس

سے بڑھ کر یہ کہ اپنی داعیانہ حیثیت کی بنا پر مسلمانوں کو لازماً ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مسلمان خدا کی طرف سے خدا کے دین کا داعی ہے۔ ہندو اور دوسری تمام قومیں اس کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جو لوگ مدعو کی حیثیت رکھتے ہوں، ان کے بارہ میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان تناؤ کی فضا پیدا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ تناؤ کی فضا میں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں کی داعیانہ حیثیت ان کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری قرار دیتی ہے کہ وہ برادران وطن سے حریف اور رقیب کا برتاؤ نہ کریں۔ بلکہ وہ ان کے ہمدرد اور خیر خواہ بنیں۔ مسلمانوں کے اوپر لازم ہے کہ وہ برادران وطن کی ایذا رسانی پر آخری حد تک صبر کریں۔ وہ ان کی ایذا رسانی کے باوجود ان کے حق میں دعائیں کریں۔ وہ دل سے ان کی اصلاح اور نجات کے حریص بن جائیں۔

آخرت میں امت محمدی کو جو سب سے بڑا اعزاز ملنے والا ہے وہ شہدا علی الناس کا اعزاز ہے۔ مگر یہ اعزاز صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے دنیا میں خدا کے دین کی شہادت دی ہو۔ اور اس شہادت (گواہی) کی راہ میں یک طرفہ صبر و اعراض کی وہ قربانی دی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔

آخری بات

اب موجودہ حالات میں مسلمانوں کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک، نام نہاد رہنماؤں کا طریقہ جو ان کو ردعمل کے راستہ پر چلنے کا سبق دے رہا ہے۔ دوسرا، خدا و رسول کا طریقہ جو انھیں پکار رہا ہے کہ ردعمل سے بچو اور صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ رہنماؤں کا طریقہ ذلت اور بربادی کی طرف لے جاتا ہے، اور خدا و رسول کا طریقہ عزت اور کامیابی کی طرف۔ اب مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس طریقہ کو اپنے لیے پسند کر رہے ہیں۔

تازہ واقعات امید افزا طور پر بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں نیا شعور جاگا ہے۔ اب تک مسلمانوں میں یہ روایت جاری تھی کہ جب بھی ہندوؤں کا کوئی جلوس مسجد کے سامنے سے گزرے یا ہندوؤں کی ایک جماعت کوئی مخالفانہ نعرہ لگا دے تو مسلمان فوراً اس کو اپنے لیے قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے تھے اور ایسے لوگوں سے لڑنے بھڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں بار بار فرقہ وارانہ فساد پیش آتا تھا۔ اب اس کے برعکس منظر سامنے آرہا ہے۔ جگہ جگہ مسلمان ایسا کر رہے ہیں کہ وہ ایسے واقعات کو ناقابل لحاظ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ ان

طرح فساد کا تمام بم اپنے آپ ناکارہ ہو کر غیر موثر ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نئے مستقبل کی علامت ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ صبر و اعراض کی نئی روایت مسلمانوں میں قائم ہو جائے جس طرح ماضی میں ردعمل کی روایت ان کے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ لوگ ناپسندیدہ باتوں کو اسی طرح نظر انداز کرنے لگیں جس طرح اس سے پہلے وہ ان سے الجھ جایا کرتے تھے۔ مستقبل کے افق پر صبح کا اجالا ظاہر ہو چکا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ایک روشن سورج ان کے اوپر اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگے۔

ایک سفر

۲۵ سے ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ تک طرابلس (لیبیا) میں ایک انٹرنیشنل سیمینار ہوا۔ اس سیمینار کا موضوع تھا ——— الدعوة الاسلامية على ابواب قرن جديد

Islamic call in the threshold of a new century.

اس سیمینار کے دعوت نامہ پر ایک سفر ہوا۔ وہاں پیش کرنے کے لئے میں نے جو مقالہ تیار کیا، اس کا عنوان یہ تھا:

Islam in 21st century

یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی اور اردو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہاں سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۹ کی شام کو دہلی سے پی آئی اے کی فلائٹ ۲۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کی سروس انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کے مطابق تھی۔ کراچی تک ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ کی پوری پرواز نہایت ہموار رہی۔ جہاز کے اندر مطالعہ کے لئے پاکستان کے اردو اور انگریزی اخبار موجود تھے۔

اخبارات کا مطالعہ میرے لئے کچھ زیادہ خوشی کا باعث نہ ہوسکا۔ اخبارات میں لفظی کشتی کا منظر دکھائی دیا۔ پنجاب کے ریاستی وزیر کی تقریر اسلام آباد کے مرکزی وزیر کے خلاف۔ اور مرکزی وزیر کی تقریر پنجاب کے ریاستی وزیر کے خلاف۔ جماعت اسلامی کے لیڈر کا بیان مہاجر لیڈر کے خلاف اور مہاجر لیڈر کا بیان جماعت اسلامی کے لیڈر کے خلاف۔ اسی قسم کی خبریں اخبارات کے صفحہ اول کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ اس سے یہ تو اندازہ ہوا کہ موجودہ پاکستان میں جمہوریت ہے مگر اہل پاکستان شعوری اعتبار سے شاید ابھی اس درجہ کو نہیں پہنچے کہ وہ جمہوریت کا تحمل کر سکیں۔

پاکستان ہندو اور مسلم اختلاف سے بچنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ "خداداد ملک" میں مسلم اور مسلم اختلاف اس سے بھی شدید صورت میں موجود ہے۔

ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے قریب ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ ہوابازی کے انجینئر ہیں اور انھوں نے پائلٹ کی ٹریننگ لی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ

طرح فساد کا تمام بم اپنے آپ ناکارہ ہو کر غیر موثر ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نئے مستقبل کی علامت ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ صبر و اعراض کی نئی روایت مسلمانوں میں قائم ہو جائے جس طرح ماضی میں ردعمل کی روایت ان کے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ لوگ ناپسندیدہ باتوں کو اسی طرح نظر انداز کرنے لگیں جس طرح اس سے پہلے وہ ان سے الجھ جایا کرتے تھے۔ مستقبل کے افق پر صبح کا اجالا ظاہر ہو چکا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ایک روشن سورج ان کے اوپر اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگے۔

ایک سفر

۲۵ سے ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ کو طرابلس (لیبیا) میں ایک انٹرنیشنل سینار ہوا۔ اس سینار کا موضوع تھا ——— الدعوۃ الاسلامیۃ علی ابواب قرن جدید

Islamic call in the threshold of a new century.

اس سینار کے دعوت نامہ پر ایک سفر ہوا۔ وہاں پیش کرنے کے لئے میں نے جو مقالہ تیار کیا، اس کا عنوان یہ تھا:

Islam in 21st century

یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی اور اردو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہاں سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۹ کی شام کو دہلی سے پی آئی اے کی فلائٹ ۲۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کی سروس انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کے مطابق تھی۔ کراچی تک ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ کی پوری پرواز نہایت ہموار رہی۔ جہاز کے اندر مطالعہ کے لئے پاکستان کے اردو اور انگریزی اخبار موجود تھے۔

اخبارات کا مطالعہ میرے لئے کچھ زیادہ خوشی کا باعث نہ ہو سکا۔ اخبارات میں لفظی کشتی کا منظر دکھائی دیا۔ پنجاب کے ریاستی وزیر کی تقریر اسلام آباد کے مرکزی وزیر کے خلاف۔ اور مرکزی وزیر کی تقریر پنجاب کے ریاستی وزیر کے خلاف۔ جماعت اسلامی کے لیڈر کا بیان مہاجر لیڈر کے خلاف اور مہاجر لیڈر کا بیان جماعت اسلامی کے لیڈر کے خلاف۔ اسی قسم کی خبریں اخبارات کے صفحہ اول کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ اس سے یہ تو اندازہ ہوا کہ موجودہ پاکستان میں جمہوریت ہے مگر اہل پاکستان شعوری اعتبار سے شاید ابھی اس درجہ کو نہیں پہنچے کہ وہ جمہوریت کا تحمل کر سکیں۔

پاکستان ہندو اور مسلم اختلاف سے بچنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ "خدا داد ملک" میں مسلم اور مسلم اختلاف اس سے بھی شدید صورت میں موجود ہے۔

ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے قریب ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ ہوابازی کے انجینئر ہیں اور انھوں نے پائلٹ کی ٹریننگ لی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ

یہ بتائیے کہ جہاز کیسے اڑتا ہے۔ انھوں نے اس کی کچھ تشریح کی۔ اس کے بعد کہا کہ جہاز کے اڑنے کا اصول اگرچہ بے حد سادہ ہے مگر اس کو قطعی صورت میں صرف ریاضیاتی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے، غیر ریاضیاتی زبان میں اس کو قطعیت کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں۔

یہی اصول دوسرے معاملات کے لئے بھی ہے۔ مثلاً قومی تعمیر یا اسلامی احیاء کے معاملہ کو بھی صحیح طور پر شعر وخطابت کی زبان میں یا چڑیا چڑے کی کہانی کے طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو لازماً علمی زبان میں بیان کرنا پڑے گا۔

آجکل یہ حالت ہے کہ ملی تعمیر یا اسلامی احیاء کے کام کو اگر زیادہ گہرائی کے ساتھ بتایا جائے تو بعض لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو فلسفہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے ایک معاملہ کو صحیح طور پر "فلسفہ" ہی کی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اس کو فلسفہ کی زبان میں سمجھنا نہ چاہیں وہ ہمیشہ کے لئے اس کی حقیقی معرفت سے محروم رہیں گے۔

جہاز میں ایک رفیق سفر نے کہا کہ قرآن میں صرف دو سفروں کا ذکر ہے۔ خشکی کا اور سمندر کا (وحملناہم فی البر والبحر)، مگر موجودہ زمانہ میں ہوائی سفر بھی ایک مستقل سفر بن گیا ہے۔ اس کا مطلب کیا یہ لیا جاسکتا ہے کہ قرآن "دو سفروں" کے دور کی کتاب ہے، وہ "تین سفروں" کے دور کی کتاب نہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں سفر کی قسمیں تین ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ ہیں۔ مثلاً انڈر گراؤنڈ ریلوں کا تحت زمین سفر، یا راکٹ کا بالائے خلا سفر۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک عام اسلوب کلام ہے کہ ایک معروف چیز کا ذکر کر کے اس کے ذیل کی دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے تابع ہونے کی بنا پر خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ مثلاً آپ کہیں کہ "جمہوری نظام میں حکمراں کو اپوزیشن کی طرف سے بہت سی تلخ باتیں سننی پڑتی ہیں۔" اس فقرہ میں بظاہر صرف "سننے" کا ذکر ہے مگر تبعیت کے اصول کے تحت اس میں "پڑھنا" بھی اپنے آپ شامل ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی تلخ باتیں سننا اور پڑھنا پڑتا ہے۔

یہی معاملہ قرآن کی مذکورہ آیت کا ہے۔ اس میں بظاہر اگرچہ صرف برّ اور بحر میں سفر کا ذکر ہے مگر سفر کے ذیل کے دوسرے تابع مفہوم بھی اس میں اپنے آپ شامل ہیں۔ مثلاً برّ کی تابعیت میں تحت زمین سفر، اور بحر کی تابعیت میں فوق زمین (ہوائی اور خلائی) سفر۔

اس سے پہلے ایک سفر کے دوران میں نے کراچی ایرپورٹ کی مسجد میں نماز ادا کی تھی (الرسالہ مئی ۱۹۸۷، صفحہ ۲۲) اس سفر میں دوبارہ کچھ وقت اس خوب صورت مسجد میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ اس مسجد کو دیکھ کر خیال ہوا کہ ایرپورٹ کے اندر مسجد کا ہونا شاید اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ ایرپورٹ کسی مسلم ملک میں واقع ہو۔ مگر پھر یاد آیا کہ اب زمانہ غیر معمولی طور پر بدل چکا ہے چنانچہ اب اٹلی اور اسپین جیسے ملکوں میں بھی شاندار مسجدیں بن رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے حالات میں ایسی تبدیلی کی ہے کہ اب خود سیکولر لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ "مسجد" ان کے سیکولرزم پر دھبہ نہیں۔ بلکہ مسجد ان کی سیکولرزم کی قبا پر ایک تصدیقی تمغہ ہے۔ چنانچہ فرانس میں پاکستان کا واقعہ دہرایا جا رہا ہے۔ فرانس کی راجدھانی پیرس میں اورلی ہوائی اڈہ (Orly International Airport) ہے۔ وہ دنیا کے ان ۲۴ بڑے ہوائی اڈوں میں شمار ہوتا ہے جہاں سالانہ ایک کروڑ سے زیادہ مسافر چڑھتے اور اترتے ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ اس فرانسیسی ہوائی اڈہ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے تاکہ یہاں سے گزرنے والے مسلمان مسافروں کو عبادت گزاری کی سہولت حاصل ہو سکے۔

کراچی ایرپورٹ پر کئی گھنٹے انتظار میں گزرے۔ میں ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا کچھ یادداشتیں نوٹ کرنے میں مشغول تھا۔ میرے پاس کی سیٹ پر ایک مسلمان لڑکی آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی: "انکل، آپ شاعر ہیں"۔ میں نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ میں نے اس سے مزید کچھ نہ کہا اور نہ کچھ پوچھا۔ تاہم میں سوچتا رہا کہ اس نے ایسا سوال کیوں کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لوگ لکھنے کے نام سے صرف تفریحی لکھنے کو جانتے ہیں، وہ سمجھ نہیں پاتے کہ کوئی شخص کسی سنجیدہ مقصد کے لئے بھی قلم کاغذ میں مشغول ہوگا۔

کراچی ایرپورٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے میں امیگریشن کی کھڑکی پر کھڑا تھا۔ میں کئی آدمیوں کے پیچھے تھا۔ پولیس کے آدمی نے مجھے آگے کر دیا۔ ایک مسافر نے کہا کہ یہ تو پیچھے تھے۔ "یہ بزرگ ہیں" اس نے جواب دیا۔ اس نے فوراً میرے پاسپورٹ پر ضروری اندراج کرلیا اور مجھے دیتے ہوئے کہا: ہمارے لئے دعا کیجئے گا۔ یہ میرے بڑھاپے کی قیمت تھی۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں اگر "طاقت ور" ہونا اپنے اندر کچھ ایڈوانٹج رکھتا ہے تو یہاں "کمزور" ہونے کے بھی کچھ ایڈوانٹج ہیں۔ مگر اس کا فائدہ اسی شخص کو ملتا ہے جو فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع دے اور عاجلانہ مداخلت کر کے فطرت کا نقشہ بگاڑ

نہ ڈالے۔

کراچی سے طرابلس کے لئے لیبین ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۶۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دروازہ پر پہنچا تو مسافروں کے کاغذات اور سامان کی زبردست چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرا حلیہ دیکھ کر جہاز کے عملہ کے ایک عرب رکن نے پوچھا کہ آپ کانفرنس میں جا رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد اس نے کسی قسم کی چیکنگ کئے بغیر اندر داخل کر دیا۔

دل سے دعا نکلی کہ کاش آخرت میں بھی ایسا ہی معاملہ ہو۔ صرف نام پوچھ کر آگے بڑھا دیا جائے۔ رحمتوں کے دروازہ میں بلاحساب کتاب داخلہ مل جائے۔ اور بلاشبہ یہ اللہ کے لئے مشکل نہیں۔

کراچی سے طرابلس کا سفر متواتر سات گھنٹہ کا تھا۔ شروع میں خیال آیا کہ یہ بڑا تکلیف دہ سفر ہوگا۔ مگر دوران پرواز نیند آتی رہی۔ اس لئے اس کا بڑا حصہ سونے میں گزر گیا۔ صبح کو ہمارے پیچھے کی طرف شفق کا اجالا ظاہر ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورا اجالا ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر جہاز گھنٹوں تک اسی حالت میں پرواز کرتا رہا۔ جب بھی میں باہر کی طرف دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ اجالا بے حد سست رفتار کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا یہ سفر مشرق سے مغرب کی طرف ہو رہا تھا۔ یعنی طلوع آفتاب کے الٹی طرف۔ یہی "سمت سفر" کا معاملہ تھا جس نے اجالا ہونے میں اتنی تاخیر کر دی۔ زمین کی گردش اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اگر آپ اپنے مقام پر صبح کے وقت کسی ٹیلہ پر کھڑے ہوں تو سورج آپ کی طرف ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آ رہا ہوگا۔ چنانچہ بہت جلد اجالا ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن ہوائی جہاز کے ذریعہ جب آپ مشرق سے مغرب کی طرف آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہے ہوں تو اس وقت آپ کے لئے سورج کے سفر کی رفتار گھٹ کر صرف دو سو میل فی گھنٹہ رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی حالت میں اجالے کے ظہور میں تاخیر ہو جاتی ہے۔

واپسی کے وقت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کو اس کے برعکس صورت پیش آئی۔ یہ سفر مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ صبح کو شفق کی سرخی ظاہر ہوئی۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ اجالا ہونے لگا۔ ایسے وقت میں اگر آپ ہوائی جہاز کے ذریعہ آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مغرب سے مشرق کی طرف اڑ رہے ہوں تو صبح کا اجالا آپ کی طرف ۱۸ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آتا ہوا دکھائی دینے لگے گا۔

وقت کی سمت کے خلاف چلنا بھی سفر ہے، اور وقت کی سمت کی طرف چلنا بھی سفر۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں میں اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ ایک شخص اگر "۲۰۰ میل" فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہو تو دوسرے کے سفر کی رفتار "۸۰۰ میل" فی گھنٹہ تک پہنچ جائے گی۔

لیبین ایرویز کا مخفف ایل اے (L.A.) ہے۔ اس سلسلہ میں بعض لیبیوں کے درمیان ایک لطیفہ مشہور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایل اے کا مطلب ہے Late Always ان کا کہنا ہے کہ لیبین ایر لائنز کے جہاز اکثر کافی لیٹ رہتے ہیں۔ مگر موجودہ سفر میں وہ تقریباً صحیح وقت پر پہنچا۔ اس دنیا میں ہر عموم میں استثنا ہے اور ہر استثنا میں عموم۔

لیبیا کے پاس دولت کی افراط ہے، اس کے باوجود لیبین ایر لائنز خستہ حالت میں ہے۔ اس کے پاس جہازوں کی بے مدکی ہے۔ موجودہ جہاز پرانے ہو چکے ہیں۔ فاضل پرزے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی مرمت سخت مشکل ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ نے لیبیا کو جہازوں کی سپلائی بند کر دی ہے۔ دوسری طرف خلیج کی ہوائی کمپنیاں نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ کیونکہ امریکا ان کے اوپر اپنی مشینی عنایتیں جاری کئے ہوئے ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو مسائل ہیں، ان کا سبب اغیار کا ظلم و تعصب نہیں۔ اس کا اصل سبب مسلمانوں کی اپنی پس ماندگی ہے۔ موجودہ مسلمان ہر جگہ پانے کی حد (Receiving end) پر ہیں۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو جائے ان کا انجام وہی ہوگا جو اس وقت ساری دنیا میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ افغانستان میں امریکہ نے ہتھیار دیا تو اس کی مدد سے افغانی مجاہدین نے روسیوں کو ملک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ فلسطین میں امریکہ مدد نہیں کر رہا ہے تو وہاں عرب مجاہدین اور سارا عالم اسلام نصف صدی سے بالکل عاجز ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان کو امریکہ نے اپنی سرپرستی میں لے رکھا ہے تو وہاں خوش حالی ہے۔ بنگلہ دیش کو امریکہ نے نظر انداز کر دیا تو وہ بدترین بدحالی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ مسلمان اس وقت ساری دنیا میں "حبل من الناس" کے تحت جی رہے ہیں نہ کہ "حبل من اللہ" کے تحت (آل عمران ۱۱۲)

۲۴ ستمبر ۱۹۸۹ کو میں طرابلس پہنچا۔ یہاں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ ۹۳۰) میں تھا۔

ہوٹل میں سب سے پہلی چیز جو پڑھنے کو ملی وہ اخبار الدعوۃ الاسلامیہ (۲۰ ستمبر ۱۹۸۹) تھا۔ اس میں پہلے صفحہ پر ایک خبر تھی۔ یہ خبر فائننشل ٹائمز سے نقل کی گئی تھی۔ لندن کے اس اخبار نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ انڈونیشیا میں بڑی تعداد میں غیرمسلم افراد اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مسیحی مبلغین کی زبردست مخالفانہ کوشش کے باوجود وہاں اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ فائننشل ٹائمز نے لکھا تھا کہ وہاں اس طرح اسلام کی اشاعت کی وجہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کی تمام مانگوں کی تکمیل کرتا ہے:

The reason for such increase, is that Islam fulfills all requirements of life.

ہر سچا مذہب ابتداءً انھیں صفات کا حامل تھا جو آج اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ مگر تحریف اور تبدیلی کے نتیجہ میں اب یہ تمام صفات صرف اسلام میں رہ گئی ہیں۔ دوسرے مذاہب کو انسان کی تحریفات نے ان صفات سے محروم کر دیا۔ لوگوں پر اگر یہ بات واضح ہو جائے تو وہ اسلام کی طرف آنے کو تبدیلی مذہب نہ سمجھیں۔ بلکہ اس کو خود اپنے ہی اصل مذہب کی طرف واپسی کے ہم معنی قرار دیں۔

سفر کے لئے روانگی سے ایک دن پہلے دہلی میں ہفت روزہ الجمعیۃ (۲۲ ستمبر ۱۹۸۹) دیکھا۔ اس کی ایک سرخی یہ تھی: قذافی کے رویہ میں حیرت ناک تبدیلی۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اب ایک سال سے معمر قذافی اپنی پالیسیوں میں زبردست تغیر کرتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اب امن اور مصالحت اور دوستی کی راہ اپنائی ہے۔ اس قسم کی باتوں کی وجہ سے عرب ملکوں کے ساتھ قذافی کے تعلقات میں سدھار آیا ہے۔ اور لوگوں کی طرف سے عام طور پر مثبت ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے (صفحہ ۲)۔

یہ "تبدیلی" لیبیا کے سفر میں مختلف اعتبار سے محسوس ہوئی۔ اس کو جوش سے ہوش کی طرف واپسی کہا جا سکتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ تک ترکی عالم عرب کا قائد تھا۔ عثمانی خلافت کے خاتمہ کے بعد کچھ لوگوں نے ناکام طور پر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔ جمال عبدالناصر کا عالم عرب کا قائد بننے کا خواب نہ صرف بے تعبیر رہا بلکہ انھوں نے عرب دنیا کی بربادی میں مزید اضافہ کیا۔ اس کے بعد آیات اللہ خمینی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے۔ مگر انھوں نے بھی اپنے پیچھے بربادی کے سوا کوئی تاریخ نہیں چھوڑی۔ بظاہر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی لیڈروں کو بھی اپنے بارہ میں یہی خوش گمانی ہوگئی تھی جو اب اپنے آپ ختم ہو رہی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف دو میں سے کوئی ایک چیز ممکن ہے۔ یا تو تمام مسلم ممالک اپنے اپنے دائرہ میں محدود ہو کر رہیں۔ اور اگر وہ کسی بھی درجہ میں اپنے آپ کو متحدہ بلاک کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو عمل طور پر اس کی صرف ایک ہی ممکن صورت ہے۔ وہ یہ کہ تمام ملک سعودی عرب کی علامتی قیادت کو تسلیم کرلیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعودی عرب کے پاس "مکہ مدینہ" ہے۔ مسلمانوں کے پاس عالمی اتحاد کی یہی ابدی بنیاد ہے۔ مذہبی سطح پر آج بھی یہی چیز ان کو متحدہ ملت کا شعور دئے ہوئے ہے، اسی طرح یہی وہ چیز ہے جو سیاسی سطح پر ان کے لئے اتحاد کی ممکن بنیاد بن سکتی ہے

اٹلی نے ۱۹۱۱ میں طرابلس پر حملہ کیا۔ وہ ۱۹۴۳ تک اس پر قابض رہے۔ اس وقت یہاں ترکوں کی حکومت تھی۔ ایچ جی ویلز (H.G. Wells) نے اپنی کتاب "آؤٹ لائن آف ہسٹری" میں لکھا ہے کہ اٹلی کے سامراجیوں نے اپنے ہم وطنوں کو ابھارا کہ وہ مزینی کو بھول جائیں اور جولیس سیزر کو یاد رکھیں:

> The Italian imperialists exhorted their countrymen to forget Mazzini and remember Julius Caesar (p. 1058).

جی مزینی (Giuseppe Mazzini) ۱۸۰۵ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۷۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ اٹلی کا مشہور قومی ریفارمر تھا۔ وہ لبرل نیشنلزم کا علم بردار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قوموں کے درمیان ہتھیار کا استعمال بند ہو جانا چاہئے اور ہمشیرگی اقوام (Sisterhood of nations) کے اصول پر باہمی تعلق قائم ہونا چاہئے (14/692)

مگر اٹلی کے پرجوش حکمراں اپنے حال کے لیڈر کو بھول گئے۔ انھوں نے دو ہزار سال پہلے کے حکمراں جولیس سیزر (Julius Caesar) کی سنت پر چلنا چاہا۔ جولیس سیزر ۱۰۰ ق م میں روم میں پیدا ہوا، اور ۴۴ ق م میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس نے رومی سلطنت کی توسیع کے لئے مختلف ملکوں پر حملے کئے۔ اور بالآخر ایک کمزور روم چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا۔ (3/579)

یہی اکثر قوموں کا حال ہے۔ انھیں اپنے جنگ جو ہیرو زیادہ پسند آتے ہیں۔ اصلاحی اور تعمیری

بات کرنے والوں کو وہ اکثر ختم کر کے نظر انداز کر دیتی ہیں۔ خواہ جنگ جو افراد نے انھیں بربادی کے سوا کچھ اور نہ دیا ہو۔

ہندستان جیسے ملکوں میں یہ مسئلہ ہے کہ ملک کی معیشت کو چلانے کے لئے پیسہ کہاں سے لایا جائے۔ لیبیا میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں، لیبیا کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تیل سے ملنے والی بے پناہ دولت کو کس طرح بہتر طور پر قوم کی ترقی کے لئے خرچ کیا جائے:

The main problem of the oil boom is how best to use the large sums of money available to promote the well-being of the nation as a whole (10/882).

رابطۂ عالم اسلامی کے تحت مکہ مکرمہ سے ایک انگریزی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام مسلم ورلڈ لیگ جرنل ہے۔ اس کے شمارہ مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۹ میں چار صفحہ کا ایک باتصویر مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Libya's New Oil Era

اس مضمون میں ایک بڑی سبق آموز بات کہی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے لیبیا پر تجارتی پابندیاں لگائیں اور اس کے تیل کے کارخانوں سے اپنے آدمیوں کو واپس بلالیا۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ لیبیا کی اقتصادیات تباہ ہو جائیں۔ مگر نتیجہ برعکس صورت میں برآمد ہوا۔ خود امریکی کانگرس کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ لیبیا سے امریکی کمپنیوں کی واپسی کا انھیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی آمدنی میں اور اضافہ ہو گیا۔ مشکل آسانی میں تبدیل ہو گئی۔

مسلم ورلڈ لیگ جرنل کے مذکورہ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکی کمپنیوں کی واپسی سے لیبیا کو مختلف فائدے پہنچے۔ اس سے انھیں موقع ملا کہ وہ ضروری ٹکنالوجی کو خود حاصل کریں، اس سے ان کی حب الوطنی اور محنت میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے لیبیا کی تیل کی صنعت کو مکمل طور پر لیبی بنالیا۔ اس کے ذریعہ سے لیبیا میں تیل کی صنعت کا ایک نیا دور آگیا (صفحہ ۶۱)

سعودی عرب کے "فیصل انعام" کی طرح لیبیا میں سالانہ "قذافی انعام" ۱۹۸۹ سے شروع کیا گیا ہے۔ لیبی حکومت نے اس مقصد کے لئے دس ملین ڈالر کا فنڈ سوئزرلینڈ کے ایک بینک میں جمع کیا ہے۔ مئی ۱۸۹ میں اس کے پہلے انعام کا اعلان کیا گیا۔ یہ انعام ساؤتھ افریقہ کے نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela

کو ان کی آزادی کی کوششوں (Liberation struggles) کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ 250,000 ڈالر کی رقم شامل ہے۔ ٹائم میگزین (۸ مئی ۱۹۸۹) نے اس واقعہ کی خبر دیتے ہوئے معنی خیز طور پر اس کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی ہے —— اور انعام پانے والا ہے ...

And the winner is .... (p. 21).

سعودی عرب کا فیصل انعام کسی شخص کی "اسلامی خدمات" کے اعتراف کے طور پر کسی مسلمان کو دیا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں لیبیا اگر سعودی عرب کی تقلید کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ اچھا ہوگا۔

یہاں میں نے اپنی گھڑی میں مقامی وقت کے مطابق تبدیلی نہیں کی تھی۔ جب مجھے وقت معلوم کرنا ہوتا تو میں ایسا کرتا کہ اپنی گھڑی میں ساڑھے تین گھنٹہ کا فرق کر لیتا تھا۔ اس طرح مجھے مقامی وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہندستان کے مقابلہ میں لیبیا کا وقت ساڑھے تین گھنٹہ پیچھے ہے۔ وقت کے آگے پیچھے ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان نے اپنی سہولت کے لئے رات اور دن کی مدت کو ۲۴ گھنٹے میں تقسیم کیا ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہر ملک میں دوپہر کا وقت ۱۲ بجے کا وقت ہوگا۔ اب چونکہ زمین کی محوری گردش کی بنا پر "دوپہر" کا لمحہ ہر ملک میں الگ الگ وقت پر آتا ہے، ہر ملک کا وقت الگ الگ ہو گیا ہے۔ مثلاً ہندستان میں جس وقت دوپہر ہوگا، اس وقت لیبیا میں ابھی دوپہر کا وقت آنے میں تقریباً ساڑھے تین گھنٹہ باقی ہوں گے۔ ہر ملک دوپہر کے وقت کو ۱۲ بجے کا وقت مان کر اپنی گھڑی کا آغاز کرتا ہے، اس لئے ہر ملک کا وقت نسبتی طور پر الگ الگ ہو جاتا ہے۔

وقت کا یہ فرق قدرت کا ایک سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "فرق" اس دنیا کی لازمی حقیقت ہے۔ اس دنیا میں ہمیں فرق کے باوجود مل کر رہنا ہے۔ یہاں اختلاف کے باوجود اتحاد قائم کرنا ہے۔

اپنے عام طریقہ کے مطابق، میں کانفرنس کے بارہ میں "رپورٹ" کے انداز میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ کانفرنس کے اندر اور کانفرنس کے باہر پیش آنے والی صرف کچھ باتوں کو یہاں نقل کروں گا۔

کویت کے شیخ راشد عبد اللہ الفرحان نے حقوق الانسان فی الاسلام پر عربی میں تقریر کی۔ اس دوران انھوں نے غلامی کا ذکر کیا اور کہا کہ اسلام کے مخالفین اس پر سب سے زیادہ اعتراض کرتے ہیں۔ مگر قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ ہدایت نہیں کہ تم لوگوں کو غلام بناؤ۔ اسلام نے غلامی کو شروع نہیں کیا۔ وہ پہلے سے دنیا میں موجود تھی۔ اسلام نے ایسے احکام دئے جن کے ذریعہ کمیت و کیفیت

کے اعتبار سے ختم ہو سکے۔ غلامی کے بارہ میں اسلام نے جو احکام وضع کئے ہیں، وہ دو مقصد کے تحت تھے۔ مزید غلام بنانے کو روکنا، اور موجودہ غلاموں کو ختم کرنا (النوع الذی شُرعت لہ الاحکام کلہا تدور حول مبدأین مُہمین ہما، تضییق المدخل وتوسیع المخرج)

غلامی کے مسئلہ کی یہ تشریح نہایت صحیح اور عین شریعت کے مطابق ہے۔ تضییق المدخل اور توسیع المخرج کا یہی اصول اسلام نے دوسری برائیوں کے استیصال کے لئے بھی اختیار کیا ہے۔

کانفرنس کی تقریریں اور مقالے زیادہ تر اصل موضوع سے غیر متعلق تھے۔ اس لئے ان کی کوئی تفصیل یہاں درج نہیں کی جا رہی ہے۔ ایک صاحب نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: صرف آپ کا مقالہ مقررہ موضوع کے پوری طرح مطابق تھا۔ یہی اکثر کانفرنسوں کا حال ہوتا ہے۔

۲۸ ستمبر کی نشست میں فلپائن کی مورو لبریشن فرنٹ کے نوجوان چیرمین مسٹر نوری مسواری (NUR MISVARI) نے تقریر کی۔ ان کی انگریزی تقریر انتہائی جوشیلے انداز میں تھی۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن کی مسلم آبادی کے علاقے میں آزادی کی جو لڑائی ہو رہی ہے، اس میں اب تک کم از کم ۱۲۵ ہزار مسلمان اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلپائن کے سابق صدر مارکوس کے ساتھ ہماری میٹنگ ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو میں ہر چیز دینے کے لئے تیار ہوں۔ مگر میں آپ کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں :

I am ready to give you anything except independence.

مگر مسلم لیڈروں نے جواب دیا کہ ہماری لڑائی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ہم کو صرف آزادی چاہئے، اس کے سوا کوئی اور چیز ہم کو منظور نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی جد و جہد ہر مقام پر اسی صورت حال کا شکار ہے۔ مسلمان ہر جگہ بے فائدہ قومی جنگ لڑ رہے ہیں، جس کا نام انھوں نے غلط طور پر جہاد فی سبیل اللہ رکھ لیا ہے۔ وہ دوسروں سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں جس کو دوسرے لوگ انھیں دینے کے لئے تیار نہیں۔ اور دوسرے لوگ جو کچھ انھیں دے رہے ہیں وہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں۔ اس قسم کی جنگ سراسر بے فائدہ ہے۔ اس کا تعلق عقل سے بھی نہیں، اسلام سے اس کا تعلق ہونا تو در کنار۔ (باقی)

خبرنامہ اسلامی مرکز - ۵۸

۱- قاہرہ (مصر) کا ایک مشہور مجلہ ہے جس کا نام روز الیوسف ہے۔ اس کے عرب نمائندہ دکتور محمد عودۃ ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹ کو اسلامی مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں نیز عالمی اسلامی تحریکوں کے بارہ میں تھے۔

۲- ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس تقریر کا عنوان تھا : رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ۔ یہ تقریر آئندہ انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳- ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ " بہار میں ہونے والے فسادات کے پیش نظر مولانا منت اللہ رحمانی کی دعوت پر ۱۷ ستمبر ۱۹۸۹ کو دفتر امارت شرعیہ (پھلواری) میں مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں مسلمانوں کو یہ رہنمائی دی گئی کہ وہ ضبط وتحمل سے کام لیں اور کسی حال میں مشتعل نہ ہوں (معارف ، اکتوبر ۱۹۸۹) اس طرح کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ الرسالہ کا فکر اب اس حد تک پھیل چکا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی زبانوں سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہ الرسالہ مشن کی کھلی ہوئی فتح ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو لوگ اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے کہ فساد کے بعد فرقہ پرستوں اور انتظامیہ کے خلاف بے فائدہ احتجاج و فریاد کرتے رہیں۔

۴- دلشاد گارڈن (دہلی) میں مسلم ویلفیر ایسوسی ایشن کی طرف سے سیرۃ النبی کا ایک جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو ہوا، اور اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر سیرت رسول کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۵- ستمبر ۱۹۸۹ میں صدر اسلامی مرکز کا بیرونی ملکوں کا ایک سفر ہوا۔ اس کی روداد انشاء اللہ آئندہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۶- الرسالہ کے مضامین ہندستانی پرچوں کے علاوہ بیرونی جرائد میں مسلسل نقل کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً کراچی کے اخبار مشرق نے اپنے شمارہ ۱۸ اگست ۱۹۸۹ میں الرسالہ کا

ایک مفصل مضمون (سائنس اور اسلام) شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار نے اپنی طرف سے حسب ذیل نوٹ شامل کیا ہے: "مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز و مدیر ماہنامہ "الرسالہ" اردو، انگریزی) عالم اسلام کی مایہ ناز اور نادر روزگار علمی ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی اردو انگریزی تصانیف دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ وہ عصری اسلوب اور جدید تقاضوں کے مطابق دین فطرت کی صداقت و حقانیت واشگاف کرنے میں موثر اور طاقت ور دلیل و براہان سے کام لیتے ہیں۔ انھیں گزشتہ برس حکومت پاکستان کے تحت سیرت کے عالمی مقابلہ میں ان کی انگریزی کتاب (پرافٹ آف ریوولیوشن) کو پہلا انعام ملا۔ اسلام کے موضوع پر منعقد ہونے والے عالمی مذاکروں اور سیمناروں میں ان کی شرکت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے"

۷۔ اخبار قومی فیصلہ (دہلی) کے لیے اس کے نمایندہ مسٹر محمد اجمل خاں نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۹ اکتوبر ۱۹۸۹ کو مرکز کے دفتر میں ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات زیادہ تر الرسالہ کے مشن اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے متعلق تھے۔

۸۔ ساہتیہ اکیڈمی (نئی دہلی) کی طرف سے ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو مدراس میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع "رادھا کرشنن اور مذہب" تھا۔ اس سیمنار میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی تھی۔ اگرچہ اپنی مصروفیات کی بنا پر وہ اس میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم اس طرح کے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں جو بتاتے ہیں کہ آج کس طرح "مدعو" خود اپنی طرف سے اسٹیج تیار کرکے "داعی کو بلا رہا ہے کہ آؤ اور اپنی بات کہو۔ ضرورت ہے کہ آج کثرت سے انگریزی داں علماء ہوں تاکہ ان مواقع دعوت سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

۹۔ ایک صاحب پونہ سے لکھتے ہیں: "پونہ میں ایک اسلامی جماعت کا پروگرام ۲۵ اگست ۱۹۸۹ کو ہوا۔ اس میں ان کے جنرل سکریٹری وغیرہ شریک ہوئے۔ وہاں جو تقریر ہوئی وہ تمام تر الرسالہ کی پالیسی پر تھی۔ ایک مقامی پریس کانفرنس بھی تھی۔ اس میں

بھی ایسے ہی ایڈجسٹمنٹ کی باتیں سکیں "۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا مشن کس طرح لوگوں کے فکر و خیال کو مسخر کر رہا ہے ۔

۱۰- سرینگر کے ہفت روزہ اخبار مسلم کے نمائندہ مسٹر ایم ایم شریف نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا ۔ یہ انٹرویو مرکز کے دفتر میں ریکارڈ کیا گیا ۔ سوالات کا زیادہ تر تعلق کشمیر کے مسئلہ سے تھا ۔ صدر اسلامی مرکز نے کشمیر کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ حقیقت پسند بنیں اور ماضی کو بھلا کر حال کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں ۔

۱۱- ۵ اکتوبر ۱۹۸۹ کو انبیٹھہ (سہارن پور) میں ایک سیرت کانفرنس ہوئی ۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر خطاب کی دعوت دی گئی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے شرکت کی اور سیرت کے موضوع پر تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی ۔ تقریر کا موضوع تھا ــــــــــ موجودہ حالت ــــ میں سیرتِ رسول کی رہنمائی ۔

۱۲- انجمن رفاہِ ملت (دانم باڑی) کی طرف سے ایک خط میں بتایا گیا ہے کہ ملت کی اصلاح کے لیے انجمن کی طرف سے شائع ہونے والے کیلنڈر میں ہر سال کچھ مضامین شائع کیے جاتے ہیں ۔ گزشتہ سال الرسالہ کے حوالہ سے اس کے مضامین " لڑائی کے بغیر بھی جیت ہوتی ہے " اور " اپنے آپ سے لڑنا ..... " اور ہاتھی کی خاموشی ..... " وغیرہ شائع کیا گیا ۔ اس سال آپ کی کتاب باغ جنت اور نار جہنم سے کچھ مواد لے کر کیلنڈر میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے "۔

۱۳- " نقش کوکن " بمبئی کا ایک قدیم ماہنامہ ہے ۔ وہ بیک وقت دو زبانوں (اردو ، انگریزی) میں نکلتا ہے ۔ نقش کوکن ہر مہینہ بالالتزام الرسالہ کا کم از کم ایک اردو مضمون اور ایک انگریزی مضمون اپنے صفحات میں اہتمام کے ساتھ شائع کرتا ہے ۔ اسی طرح اور بہت سے جرائد الرسالہ کے مضامین متفرق طور پر نقل کرتے ہیں ۔

۱۴- "سنت نرنکاری" دہلی کا ایک ماہنامہ ہے ۔ وہ سنت نرنکاری عالمی مشن کی طرف سے بیک وقت سات زبانوں میں شائع ہوتا ہے ۔ سنت نرنکاری میں تقریباً ہر مہینہ الرسالہ کا کوئی نہ کوئی مضمون نقل کیا جاتا ہے ۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام وسیع تر حلقہ میں مسلسل پہونچ رہا ہے ۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۹۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۰ — مارچ ۱۹۹۰

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 611128، 697333

تاریخ کا اشارہ

انتقام کا خاتمہ پشیمانی کا آغاز ہے۔ انتقام جب اپنی آخری حد پر پہنچتا ہے تو وہ پشیمانی اور اعتراف بن جاتا ہے ...... یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، اور تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

انفرادی سطح پر اس کی ایک مثال حضرت عمر بن الخطابؓ کا واقعہ ہے۔ ابتداءً وہ اسلام کے منکر اور دشمن تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ ان کی بہن اور بہنوئی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ ان کے گھر گئے۔ ان کے قبول اسلام پر ان کو اتنا غصہ تھا کہ وہ ان کو بری طرح مارنے لگے۔ یہاں تک کہ چوٹ کی وجہ سے ان کے جسم پر خون بہہ پڑا۔ عمر بن الخطاب نے جب اپنی بہن کے جسم پر خون دیکھا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو کر شرمندگی میں تبدیل ہو گیا۔ انھوں نے بہن سے قرآن مانگا۔ پشیمانی کی نفسیات میں جب انھوں نے قرآن کو پڑھا تو وہ ان کے دل میں اتر گیا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

اجتماعی سطح پر اس معاملہ کی ایک مثال تاتاریوں کا واقعہ ہے۔ عباسی دور کے آخر میں تاتاری قبائل موجودہ روس کے پہاڑی علاقوں سے نکلے۔ بعض اسباب کے تحت ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف انتقامی جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک بے شمار مسلمانوں کو قتل کیا۔ مسجدوں کو ڈھایا اور مسلم بستیوں کو ویران کر دیا۔ تاتاریوں نے جب یہ سب کچھ کر لیا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب ان کے اندر ندامت اور اعتراف کا جذبہ جاگ اٹھا۔ مسلم آبادیوں کے کھنڈر کو دیکھ کر ان کے دل کے اندر ایمان کی دنیا تعمیر ہونے لگی۔ مسلمانوں کے عقائد اور ان کی زندگی کے آداب نے ان کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بیشتر تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ہندستان میں بھی شاید یہی تاریخ دہرائی جانے والی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف یہاں جس شدت کے ساتھ انتقامی جذبہ بھڑک اٹھا ہے، وہ ابدی طور پر جاری رہنے والا نہیں۔ وہ لازماً اپنی حد پر پہنچے گا۔ اور جب وہ حد پر پہنچے گا تو عین قدرت کے قانون کے تحت پشیمانی اور اعتراف کا دور شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ لوگ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسلام کے دشمن تھے، وہ اسلام کے دوست بن گئے ہیں۔ انتقام کی شدت بتا رہی ہے کہ وہ دن اب شاید زیادہ دور نہیں۔

اسلام کا انکار خود اپنا انکار ہے، اور کون ہے جو خود اپنے انکار کا تحمل کر سکے۔

قرآن کا کرشمہ

اسلام سے پہلے عرب میں تعلیم بہت کم تھی۔ ۸ھ میں جو اثنا (بحرین، الحسار) جیسے بڑے مۃ پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک تبلیغی خط بھیجا۔ راوی کہتے ہیں کہ سارے علاقے اور قبیلہ میں ایک شخص بھی نہ جو خط کو پڑھ سکے۔ لوگ تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ ایک نوجوان ملا جس نے خط کو پڑھ کر سنایا۔ تقر

اسی زمانہ کا واقعہ ہے، النمر بن تولب مسلمان ہوئے۔ وہ ایک بڑے قبیلہ کے سردار تھے اور اتنے بڑ شاعر تھے کہ ان کے اشعار کا ایک دیوان تیار ہوا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کے قبیلہ عکل (یہ کا سردار مقرر کر کے ایک تحریری پروانہ عطا کیا۔ مگر وہ اس کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بازار میں آ کر پوچھنے "کیا آپ لوگوں میں کسی کو پڑھنا آتا ہے جو یہ خط پڑھ کر مجھ کو سنا دے"

کہا جاتا ہے کہ بعثتِ نبوی کے وقت شہر مکہ میں مشکل سے چند درجن آدمی ایسے مل سکتے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ مدینہ میں اس سے بھی کم عرب یہ فن جانتے تھے۔ لیکن دوسری صدی ہجری میں عربی زبان علمی نقطہ نظر سے دنیا کی متمول ترین زبان بن گئی۔ عربوں میں لسانی ترقی کا زمانہ اتنا مختصر کہ دنیا کی پرانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عربوں کی تیز رفتار علمی اور لسانی ترقی کا یہ واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ یہ حیرت انگیز واقعہ براہ راست قرآن کا کرشمہ تھا۔ قرآن ایک کتابِ دعوت ہے۔ جو شخص قرآن سے متاثر ہوتا ہے اور اس پر ایما لاکر اسے پڑھتا ہے، اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے اس کو داعی بنا دیا ہے۔ اس کا دل ود داعی کا دل و دماغ بن جاتا ہے۔ اس کے اندر یہ سیلاب امنڈ پڑتا ہے کہ اس نے جس ابدی صداق کو خدا کی کتاب کے ذریعہ پایا ہے، اس کو وہ تمام انسانوں تک پہنچا دے۔

یہ دعوتی جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ زبانوں کو سیکھے۔ وہ ہر طرح کی واقفیت حاصل کرے۔ اپنے آپ کو علمی اعتبار سے مسلح کرے۔ پہلے اگر وہ بے زبان تھا تو اب وہ بازبان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر بے علم تھا تو اب وہ باعلم ہو جاتا ہے۔ دعوت اپنی عین فطرت کے اعتبار سے آدمی کو صاحب اور صاحب شعور بنا دیتی ہے۔ دعوت کے ساتھ بے علمی اور بے شعوری کا جمع ہونا نہیں۔

کامیابی کی قیمت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جان لو کہ فتح ہمیشہ صبر کے ساتھ آتی ہے (اعلم ان النصر مع الصبر)

صبر کامیابی کی قیمت ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف باتوں کو چھوڑنا برداشت کیا جائے۔ امریکی سنگر اگور گورن (Igron Gorin) نے اپنے حالات کے ذیل میں بتایا ہے کہ پہلے وہ بہت زیادہ پائپ پیا کرتا تھا۔ اس کے استاد نے کہا کہ اگور، تم کو اپنے بارہ میں طے کرنا ہوگا کہ تم ایک عظیم سنگر بننا چاہتے ہو یا عظیم پائپ اسموکر۔ تم بیک وقت دونوں نہیں بن سکتے۔

اگور نے پائپ پینا چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک عظیم سنگر بن گیا۔ پانے کی خاطر چھوڑنے کے اسی فعل کا نام صبر ہے۔ اس صابرانہ اصول کو امریکہ کے ایک ماہر نفسیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ــــــ ہر انعام کی ایک قیمت ہے۔ اس دنیا میں انعام ہاں ہے، اور اس کی قیمت نہیں:

Every prize has its price. The prize is the yes; the price is the no (p. 68).

یہ قول نہایت بامعنی ہے۔ اگر آپ ایک منظم اور بااصول آدمی بننا چاہتے ہیں تو آپ کو غیر ضروری عادتیں چھوڑنی پڑیں گی۔ اگر آپ ایک صحت مند انسان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو وہ چیزیں چھوڑنی پڑیں گی جو صحت کو غارت کرنے والی ہیں۔ آدمی پہلے "نہیں" کو برداشت کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کو "ہاں" کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی گروہ یہ چاہتا ہے کہ وہ تعلیم اور روزگار اور صنعت و تجارت میں ترقی کرے، تو اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے بچے گا۔ وہ یک طرفہ اعراض کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ کی نوبت نہیں آنے دے گا۔ وہ ایسی ہر سرگرمی سے اپنے آپ کو بچائے گا جو دوسرے سماجی گروہوں سے رقابت اور دشمنی کا تعلق پیدا کرنے والا ہو۔ کیوں کہ ترقی پُرامن حالات میں حاصل کی جا سکتی ہے، نزاع اور فساد کے حالات میں ترقی کا سفر ممکن نہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ٹوٹی ہوئی ریلوے لائن پر ٹرین کا سفر ممکن نہیں ہوتا۔

4 الرسالہ مارچ ۱۹۹۰

پہلا اسکول

علم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر دوسری مصلحت پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ زمانہ میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے، ان کے اساتذہ زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ مسلمانوں کے رہنماؤں نے کہا کہ یہ غیر مسلم استاد ہمارے بچوں کو خراب کر دیں گے، اس لیے ان اداروں میں مسلمانوں کو داخل کرنا درست نہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے ہو گئے۔

یہ مصلحت درست نہ تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں جو سب سے پہلا اسکول کھولا گیا، اس کے تمام استاد غیر مسلم تھے۔ یہ اسکول مدینہ میں مشرک قیدیوں کے ذریعہ کھولا گیا۔ بعض لوگ صفہ کو پہلا اسلامی مدرسہ کہتے ہیں۔ مگر صفہ تربیت گاہ تھا نہ کہ تعلیم گاہ۔ اسلام کی پہلی تعلیم گاہ یقیناً وہ ہے جو غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ذریعہ مدینہ میں قائم کی گئی اور اس کے ٹیچر سب کے سب مشرک اور غیر مسلم تھے۔

حتی کہ اس تعلیمی نظام کی بنا پر مدینہ میں مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ وہ انصار کے لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس کے بعد ایک روز ایک لڑکا روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا۔ ماں نے پوچھا تمہارا حال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے معلم نے مجھ کو مارا ہے۔

(جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداءهم أن يعلّموا اولاد الانصار الكتابة. فجاء غلام يوماً يبكي الى امه فقالت ماشانك. فقال ضربني معلّمي (سیرۃ ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۵۱۲)

یہ قیدی سب کے سب اسلام کے دشمن تھے۔ ان کو چھوڑنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ دوبارہ اسلام کے خلاف مسلح ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود انھیں تعلیم کی قیمت پر چھوڑ دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر اندیشے کو نظر انداز کر کے اسے حاصل کرنا چاہیے۔

سبب اپنے اندر

مارٹن لوتھر کنگ (Martin Luther King, Jr.) کا قول ہے کہ کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کر سکتا جب تک وہ جھکی ہوئی نہ ہو :

A man can't ride your back unless it's bent.

یہ قول تمثیل کی زبان میں زندگی کی ایک حقیقت بیان کر رہا ہے۔ آپ بالکل سیدھے کھڑے ہوئے ہوں تو کسی شخص کو یہ موقع نہیں ملے گا کہ وہ کود کر آپ کی پیٹھ پر بیٹھ جائے۔ کسی شخص کو یہ موقع صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ آپ کی پیٹھ جھک جائے۔ جھکی ہوئی پیٹھ پر سواری ممکن ہے، نہ کہ سیدھی تنی ہوئی پیٹھ پر۔

یہی معاملہ زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں مغلوبیت دراصل اپنی کمزوری کی قیمت ہے۔ کوئی کوئی شخص آپ پر قابو صرف اس وقت پاتا ہے جب کہ آپ کمزور ہو کر اس کو اپنے اوپر قابو پانے کا موقع دیدیں۔ اس لیے عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص آپ پر غالب ہوتا ہوا نظر آئے تو سب سے پہلے اپنے آپ میں غور کرکے اپنی اس کمزوری کو دور کیجئے جس نے دوسرے شخص کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو استعمال کرکے آپ کے اوپر غلبہ حاصل کرلے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اُحد کی جو لڑائی ہوئی، اس میں مسلمان ابتداءً جیت رہے تھے۔ مگر ان کی جیت بعد کو ہار میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی وجہ خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی تھی۔ چنانچہ قرآن میں جب اس واقعہ پر تبصرہ نازل ہوا تو فریق ثانی کے ظلم وسرکشی پر کچھ نہیں کہا گیا۔ قرآن کے تبصرہ (آل عمران ۱۵۲) میں ساری تنبیہہ صرف مسلمانوں کو کی گئی۔ تاکہ مسلمانوں کے اندر اپنی کوتاہی کا شدید احساس پیدا ہو۔ وہ اپنی کوتاہی کی اصلاح کے ذریعہ اس بات کو ناممکن بنادیں کہ آئندہ کوئی شخص ان کے خلاف کارروائی کرکے ان کے اوپر کامیابی کی امید کرسکے۔

آدمی جب بھی کسی دوسرے کے مقابلہ میں ہارتا ہے تو وہ اپنی ذاتی کمی کی بنا پر ہارتا ہے۔ اپنی ذاتی کمی کو جان کر اسے دور کیجئے، اور اس کے بعد آپ کو نہ کسی کے خلاف فریاد کی ضرورت ہوگی اور نہ احتجاج کی۔

سادہ حل

ایک صاحب نے اپنا واقعہ لکھا ہے۔ کسی قدر لفظی تصرف کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک صحرائی علاقہ میں گیے۔ وہ تانگہ پر سفر کر رہے تھے، اتنے میں آندھی کے آثار ظاہر ہوئے۔ تانگہ والے نے اپنا تانگہ روک دیا۔ اس نے بتایا کہ اس علاقہ میں بڑی ہولناک قسم کی آندھی آتی ہے۔ وہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ بڑی بڑی چیزوں کو اڑالے جاتی ہے۔ اور آثار بتارہے ہیں کہ اس وقت اسی قسم کی آندھی آرہی ہے۔ اس لیے آپ لوگ تانگہ سے اتر کر اپنے بچاؤ کی تدبیر کریں۔

آندھی قریب آگئی تو ہم ایک درخت کی طرف بڑھے کہ اس کی آڑ میں پناہ لے سکیں۔ تانگہ والے نے ہمیں درخت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ چیخ پڑا۔ اس نے کہا کہ درخت کے نیچے ہرگز نہ جائیے۔ اس آندھی میں بڑے بڑے درخت گر جاتے ہیں۔ اس لیے اس موقع پر درخت کی پناہ لینا بہت خطرناک ہے۔ اس نے کہا کہ اس آندھی کے مقابلہ میں بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آپ لوگ کھلی زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ جائیں۔ ہم نے تانگہ والے کے کہنے پر عمل کیا اور زمین پر منھ نیچے کرکے لیٹ گیے۔ آندھی آئی اور بہت زور کے ساتھ آئی۔ وہ بہت سے درختوں اور ٹیلوں تک کو اڑالے گئی۔ لیکن یہ سارا طوفان ہمارے اوپر سے گزرتا رہا۔ زمین کی سطح پر ہم محفوظ پڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد جب آندھی کا زور ختم ہوا تو ہم اٹھ گیے۔ ہم نے محسوس کیا کہ تانگہ والے کی بات بالکل درست تھی۔ (ذکری، نومبر ۱۹۸۹)

آندھیاں اٹھتی ہیں تو ان کا زور ہمیشہ اوپر اوپر رہتا ہے۔ زمین کی نیچے کی سطح اس کی براہ راست زد سے محفوظ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آندھی میں کھڑے ہوئے درخت تو اکھڑ جاتے ہیں، مگر زمین پر پھیلی ہوئی گھاس بدستور قائم رہتی ہے۔ ایسی حالت میں آندھی سے بچاؤ کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر یہ ہے کہ اپنے آپ کو وقتی طور پر نیچا کر لیا جائے۔

یہ قدرت کا سبق ہے جو بتاتا ہے کہ زندگی کے طوفانوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کا سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ جب آندھی اٹھے تو وقتی طور پر اپنا جھنڈا نیچا کر لو —— کوئی شخص اشتعال انگیز بات کہے تو تم اس کی طرف سے اپنے کان بند کر لو۔ کوئی تمہاری دیوار پر کیچڑ پھینک دے تو اس کے اوپر پانی بہا کر اسے صاف کر دو۔ کوئی تمہارے خلاف نعرہ بازی کرے تو تم اس کے لیے دعا کرنے میں مصروف ہو جاؤ۔

غلط فہمی

ٹائمس آئی فاؤنڈیشن (Times Eye Research Foundation) کی طرف سے نئی دہلی میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کی کارروائیاں ۶ ستمبر ۱۹۸۹ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں انجام پائیں۔ اس سیمنار کا موضوع آنکھ کا عطیہ اور مذہب (Eye Donation and Religion) تھا۔ منتظمین کی کی دعوت پر راقم الحروف نے بھی وہاں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا موضوع تھا ——— آنکھ کا عطیہ اور اسلام :

Eye Donation and Islam

سیمنار کی کارروائی کے دوران ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ پروگرام منیجر مسٹر اے پی آتری نے ایک سوال کے جواب میں اپنا ایک ذاتی قصہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ کچھ دن پہلے میرے ایک پوتے کا انتقال ہوگیا۔ اس کی عمر تقریباً سات سال تھی۔ جب لڑکے کی آخری رسوم ادا کرنے کا وقت آیا تو مسٹر آتری کے دوست اور رشتہ دار ان کے گھر پر جمع ہوئے۔ ان کے ایک دوست نے لڑکے کے جسم کو دیکھ کر کہا کہ آتری جی، آپ لوگوں سے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد اپنی آنکھیں دان میں دو۔ مگر آپ نے خود اپنے پوتے کی آنکھ دان نہیں کی۔ اس کی آنکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ویسی کی ویسی ہی ہیں۔

یہ اعتراض محض غلط فہمی پر مبنی تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ لڑکے کی موت کے بعد مسٹر آتری نے اسپتال کو ٹیلی فون کیا۔ وہاں سے ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر مع ساز و سامان آیا۔ اس نے نہایت صفائی کے ساتھ اس کی آنکھیں نکالیں اور پھر حسب قاعدہ دونوں آنکھوں میں پلاسٹک کی مصنوعی آنکھ لگادی۔ اس واقعہ سے لاعلم ہونے کی بنا پر مسٹر آتری کے دوست کو غلط فہمی ہوئی۔ بچہ کے چہرہ پر انھوں نے جس آنکھ کو دیکھا وہ مصنوعی آنکھ تھی، اس کی اصل آنکھ تو اس سے پہلے عطیہ میں دی جاچکی تھی۔

اکثر بدگمانی محض غلط فہمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی کے بارہ میں غلط رائے قائم نہ کرے۔ اور اگر اس کو رائے قائم کرنا ہے تو پہلے تحقیق کرے۔ تحقیق سے پہلے کسی کے بارہ میں بری رائے قائم کرنا جائز نہیں۔

معیار کو بلند کرنا

قدیم عرب میں برابر کی اخلاقیات کا رواج تھا۔ ان کی زندگی کا اصول یہ تھا کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے ساتھ ویسا ہی کیا جائے۔ یعنی اچھا سلوک کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک اور برا سلوک کرنے والے کے ساتھ برا سلوک۔ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف قبیلہ کے بارہ میں کہتا ہے کہ زیادتی کی کوئی قسم ہم نے باقی نہیں چھوڑی۔ انھوں نے ہمارے ساتھ جیسا کیا تھا، ویسا ہی ہم نے ان کو بدلہ دیا:

فلم یبق من العدوان دناھم کما دانوا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے ان کے اس تصور اخلاق کو بدلا۔ مساویانہ اخلاق کے بجائے آپ نے ان کو بلند اخلاق کی تعلیم دی۔ آپ نے فرمایا کہ اَحسِنْ الیٰ من اساء الیک (جو شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے، اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو) ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

لاتکونوا اِمّعۃً تقولون ان احسن الناس احسنّا وان ظلموا ظلمنا۔ ولکن وطّنوا انفسکم، ان اَحسن الناس اَن تُحسنوا وان اساؤوا فلا تظلموا۔

(مشکاۃ المصابیح، الجزءالثالث، صفحہ ۱۴۱۸)

تم لوگ اِمّعہ نہ ہو کہ یہ کہنے لگو، اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھا کریں گے۔ اور اگر وہ زیادتی کریں تو ہم بھی زیادتی کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو کہ لوگ تمہارے ساتھ اچھا کریں تو تم ان کے ساتھ اچھا کروگے اور اگر لوگ تمہارے ساتھ برا کریں تب بھی تم ان کے ساتھ زیادتی نہیں کروگے۔

آپ کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ لوگوں کے شعور کو بلند کیا جائے۔ ان کے اخلاق کو اونچا کیا جائے۔ ان کی حالت کو ہر اعتبار سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

انسان کے انسانی معیار کو بلند کرنا، فکری، علمی، اخلاقی حیثیت سے اس کو اوپر اٹھانا، اہم ترین کام ہے۔ اسی میں فرد کی بھلائی ہے اور اسی میں پورے معاشرہ کی بھلائی بھی۔ یہ حسین سنت رسول ہے اور اس کو زندہ کرنا سنت رسول کو زندہ کرنا ہے۔

طلبہ کے نام

ایک عربی درس گاہ کے طلبہ کو ایک بار مجھے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ایک روایت آئی ہے۔ اس میں مسلم عاقل کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو اپنے زمانہ سے باخبر ہونا چاہیے (ان یکون بصیراً بزمانہ)

یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے۔ اس کے مطابق آپ کو چاہیے کہ آپ صرف واقفِ دین نہ بنیں بلکہ اسی کے ساتھ واقفِ زمانہ بھی بنیں۔ اس کے بعد ہی آپ موجودہ زمانہ میں دین کی صحیح خدمت کر سکتے ہیں۔

واقفِ زمانہ بننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے "ظلم اور سازش" کو جاننے کے ماہر بن جائیں۔ یہ میرے نزدیک سطحیت ہے نہ کہ علم۔ یہ ظواہر کو جاننا اور حقائق سے بے خبر رہنا ہے۔ اور علم بلاشبہ یہ ہے کہ آدمی اصل حقیقت کو جانے، نہ یہ کہ اس کی نگاہ ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جائے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف سازش اور ظلم میں مصروف ہیں۔ تب بھی اصل جاننے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جنھوں نے ان قوموں کو یہ حیثیت دیدی ہے کہ وہ ہمارے خلاف کامیاب سازشیں کر سکیں۔ وہ ہمارے خلاف اپنے ظالمانہ منصوبوں کی کامیاب تعمیل کریں اور ہمارے تمام اعاظم و اکابر اس کو روکنے میں مکمل طور پر عاجز ثابت ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی اصل کمی یہ ہے کہ وہ عصر حاضر سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ گزرے ہوئے ماضی کے واقعات کو جانتے ہیں۔ مگر آج کے واقعات کی انھیں مطلق خبر نہیں۔ ان میں سے کوئی شخص اگر کچھ جانتا ہے تو وہ بھی ظاہری نتائج کو جانتا ہے نہ کہ نتائج کے اصل اسباب کو۔

مدارسِ دینیہ کے طلبہ اگر صرف "حیوان کاسب" بن کر نہیں رہنا چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسلام اور ملتِ اسلام کے احیاء میں مفید طور پر لگائیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ عصرِ حاضر کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ جانیں، وہ موجودہ زمانہ کی ان تبدیلیوں سے واقفیت حاصل کریں جنھوں نے ہمارے مروجہ طریقوں کو عملی اعتبار سے بالکل غیر موثر بنا کر رکھ دیا ہے۔

حسرت کا دن

قرآن میں قیامت کے دن کو ندامت اور حسرت کا دن (مریم ۳۹) کہا گیا ہے۔ قیامت کے دن جب تمام حقیقتیں کھلیں گی تو آدمی اچانک محسوس کرے گا کہ دنیا میں کیسے کیسے قیمتی مواقع تھے جب کہ وہ خدا پرستی کا ثبوت دے کر آخرت میں اس کا انعام پا سکتا تھا۔ مگر اس وقت اس نے یہ مواقع کھو دیے اور اب یہ مواقع کبھی اس کے لیے آنے والے نہیں۔ مواقع کو کھونے کا یہ احساس بلاشبہ سب سے بڑی نفسیاتی سزا ہوگی جو ابدی طور پر آدمی کو تڑپاتی رہے گی۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وانہ لتذکرۃ للمتقین۔ وانا لنعلم ان منکم مکذبین۔ وانہ لحسرۃ علی الکافرین (الحاقۃ ۴۸ - ۵۰)

اور بلاشبہ یہ یاد دہانی ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے ہیں اور وہ منکروں کے لیے پچھتاوا ہے۔

دنیا میں بار بار آدمی کے سامنے وہ مواقع آتے ہیں جب کہ وہ ایک عمل کر کے آخرت کا انعام حاصل کر سکے۔ مگر آدمی ظلم اور علو (النمل ۱۴) کی بنا پر مطلوبہ عمل نہیں کرتا۔ ایسے لوگ جب دنیا سے نکل کر آخرت میں پہونچیں گے تو اچانک وہ محسوس کریں گے کہ یہاں ان کے لیے حسرت اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب ایک ایک کر کے انھیں وہ گزرے ہوئے لمحات یاد آئیں گے جب کہ ان کے سامنے آخرت کے لیے عمل کرنے کا ایک موقع آیا، مگر انھوں نے اس موقع کو بیدردانہ طور پر کھو دیا۔

اس وقت آدمی کہے گا کہ آہ، میرے سامنے امر حق ظاہر ہوا جس کا ساتھ دے کر میں حق کا اعتراف کرنے والا بن سکتا تھا۔ مجھے موقع ملا کہ میں حق کو اس کے حقدار کے حوالہ کر دوں۔ مجھے یہ موقع ملا کہ میں حق کی گواہی دینے والا بنوں۔ مجھے یہ موقع ملا کہ میں درست بات کہوں، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مجھے موقع ملا کہ میں ان لوگوں میں بنوں جو خدا کے خوف سے اپنی زبان بند کیے رہتے ہیں۔ مگر ان مواقع کو میں نے کھو دیا۔ میں اپنے آپ کو خدا کے مطلوب بندوں کی فہرست میں درج نہ کرا سکا۔ میں نے دنیا میں نیکی کے موقع کو کھویا تھا، اس لیے آخرت میں انعام کے مواقع میں بھی اب میرا کوئی حصہ نہیں۔

اللہ کی مدد

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور اس کے بعد مسلمانوں کو جو غیر معمولی قسم کی عالمی فتوحات حاصل ہوئیں، اس کی توجیہہ پر تاریخ دانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا مقالہ نگار اس سلسلہ میں لکھتا ہے:

> At least three aspects of the contemporary situation of Byzantium and Persia account for the phenomenal ease with which the Arabs overcame their enemies: first, both empires, exhausted by wars, had demobilized before 632 (vol 3, p. 557).

اس زمانہ کی بازنطینی اور ایرانی شہنشاہیت کے کم از کم تین پہلو ہیں جو اس بات کی تشریح کرتے ہیں کہ ان کے اوپر عربوں کو اتنی آسانی سے اتنی نمایاں کامیابی کیسے حاصل ہوئی۔ ان میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ دونوں شہنشاہیتیں آپس کی جنگ کے نتیجہ میں اتنا برباد ہوئی تھیں کہ وہ ۶۳۲ء سے پہلے ہی فوجی اعتبار سے ختم ہو چکی تھیں۔

یہ بات تاریخی اعتبار سے صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ دونوں شہنشاہیتوں نے غیر معمولی فوجی طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ تاہم اس سے قطع نظر، مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ پیش آنے کے عین پہلے دونوں شہنشاہیتوں میں طویل خونی جنگ کا پیش آنا، اسلام کے حق میں براہ راست خدائی مدد تھا۔ موجودہ دنیا میں خدا کی مدد اسباب کے پردہ میں آتی ہے۔ اور روم و ایران کی باہمی جنگ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دشمنوں کو اتنا کمزور کر دیا کہ وہ اسلام کے لیے کوئی طاقت ور خطرہ نہ بن سکیں۔

آج بھی خدا کی یہ مدد ظاہر ہو سکتی ہے بشرطیکہ اہل اسلام اپنے عمل سے اس کا وہی استحقاق ثابت کر سکیں جو دور اول کے مسلمانوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا تھا۔

اللہ کی مدد کی بے شمار صورتیں ہیں۔ یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کس صورت سے کسی کے لیے اپنی مدد بھیجے گا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ جو لوگ اللہ پر سچا ایمان لائیں اور اس کے لیے مطلوبہ عمل کریں، ان کے حق میں اللہ کی مدد ضرور آتی ہے، خواہ وہ ایک صورت میں آئے یا دوسری صورت میں۔

اصلی معیار

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مریم کے یہاں جب حضرت مسیح کی ولادت ہوئی اور وہ اشارۂ ربانی کے مطابق بچہ کو لے کر یہودیوں کی بستی میں آئیں تو یہودی علماء ان کے گرد جمع ہوگیے۔ انھوں نے کہا کہ اے مریم، تم نے بڑا طوفان کرڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تمہارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی (مریم ۲۷ - ۲۸)

یہودی علماء کے اس کلام سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست اور حق پسند لوگ تھے۔ وہ لوگوں کو برائی سے روکنے والے اور انھیں نیکی کا حکم دینے والے تھے۔ اس کے باوجود وہ اللہ کے یہاں خدا پرست اور حق پسند مانے نہیں گیے، اور نہ انھیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے والا قرار دیا گیا۔ اس کے بجائے وہ خدا کی نظر میں ملعون ٹھہرے اور عذاب کے مستحق قرار پائے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے "حضرت مریم" کے خلاف تقریر کرنے میں تو حق پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مگر جب خود اپنے آپ کو حق پسند بنانے کا وقت آیا تو وہ اپنے آپ کو حق پسند بنانے پر راضی نہ ہوسکے۔ دوسرے کے معاملہ میں وہ بظاہر مصلح تھے، مگر اپنی ذات کے معاملہ میں وہ سرکش اور مفسد بن گیے۔

ان کی ذات کا یہ امتحان اس وقت ہوا جب کہ حضرت مسیح، جو کہ ابھی نومولود بچہ کی حیثیت سے ماں کی گود میں تھے، اچانک معجزۂ الٰہی کے تحت بول پڑے اور اپنے بارہ میں سچے نبی ہونے کا اعلان کیا۔ اس معجزاتی واقعہ نے حضرت مریم کی برأت اور حضرت مسیح کی نبوت دونوں کو آخری حد تک ثابت کردیا۔ مگر یہودی علماء نے نہ حضرت مریم کی پاک دامنی کا اعتراف کیا اور نہ حضرت مسیح کی نبوت کا۔

دوسروں کے سامنے تقریر کرنے میں مصلح اور حق پسند ہونا کسی کو مصلح اور حق پسند نہیں بناتا۔ مصلح اور حق پسند صرف وہ ہے جو اپنی ذات کے معاملہ میں مصلح اور حق پسند ثابت ہو۔

خیر کثیر

عبداللہ بن عباس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے تھے۔ نوجوانی کی عمر میں ایک بار وہ اونٹ پر رسول اللہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو ایک لمبی نصیحت فرمائی۔ اس حدیث کا ایک حصہ یہ ہے:

اعلم ان فی الصبر علی ما تکرہ خیراً کثیراً۔ وان النصر مع الصبر وان الفرج مع الکرب وان مع العسر یسراً۔ (مسند الامام احمد)

جان لو کہ ناپسندیدہ بات پر صبر کرنے میں بہت زیادہ بھلائی ہے۔ اور صبر کے ساتھ اللہ کی مدد آتی ہے۔ اور تکلیف کے ساتھ کشادگی ہے اور مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

یہ پیغمبرانہ الفاظ زندگی میں کامیابی کی حقیقت کو بتا رہے ہیں۔ ایسی حقیقت جس کا تعلق ذاتی زندگی سے بھی ہے اور قومی اور اجتماعی زندگی سے بھی۔

آپ کو ایک گھر یا ایک دکان یا ایک آفس چلانا ہے تو لازماً اس میں ایسی چیزیں سامنے آئیں گی جو آپ کو پسند نہ ہوں گی۔ ان ناپسندیدہ چیزوں پر اگر آپ بھڑک اٹھیں یا بے برداشت ہو جائیں تو آپ کبھی گھر یا دکان یا آفس کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر آپ وقتی ناپسندیدگی کو برداشت کریں اور جذباتی ہیجان سے ہٹ کر عقلی فیصلہ کے تحت کام کریں تو یقیناً آپ اپنے مستقبل کو کامیابی کی طرف لے جائیں گے۔

یہی معاملہ قومی اور اجتماعی زندگی کا بھی ہے۔ قومی زندگی میں بھی دوسروں کی طرف سے ناخوشگوار باتیں پیش آتی ہیں۔ اشتعال انگیز الفاظ کان میں پڑتے ہیں۔ ان مواقع پر دوبارہ صبر ہی کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ اگر ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی ناخوشگوار باتوں کو نظر انداز نہ کریں، اور ہر ناپسندیدہ بات پیش آنے پر دوسرے گروہ سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ایسے بے برداشت لوگ ہمیشہ ناکام اور برباد رہیں گے۔ پیغمبر کی نصیحت کے مطابق، کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اپنے منفی جذبات کو قابو میں رکھا جائے۔ دوسروں کے خلاف اٹھنے کے بجائے اپنے آپ کو دبایا جائے۔ یہ صابرانہ طریقہ تنگی کے بعد کشادگی لائے گا، وہ مشکل کو بالآخر آسانی میں تبدیل کرنے کا سبب بن جائے گا۔

اسلام کا طریقہ

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو اپنے قول وعمل کی آزادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک اور دوسرے کے درمیان مقابلہ اور ٹکراؤ پیش آتا ہے جو بعض اوقات عداوت تک پہونچ جاتا ہے (البقرہ ۳۶) ایسی حالت میں کرنے کا کام کیا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں پہلا حفاظتی انتظام وہ ہے جو خود خالق نے پیشگی طور پر کر رکھا ہے۔ اس نے ایسے داخلی اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ لوگوں کی عداوتی نفسیات عام حالت میں سوئی ہوئی رہتی ہے۔ انسان کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ سوئے ہوئے کو سویا ہوا رہنے دے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ فتنہ سویا ہوا ہے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے (ان الفتنة نائمة لعن الله من ایقظها)

۲۔ تاہم احتیاط کے باوجود اگر فتنہ جاگ اٹھے تو اس وقت اس کو دوبارہ ختم کرنے کی اولین کارگر تدبیر یہ ہے کہ آدمی جوابی اشتعال میں مبتلا نہ ہو۔ وہ اس کے معاملہ میں خاموشی اور اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اکثر حالات میں صرف خاموشی اور اعراض اس کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق کی یہ نصیحت نہایت بامعنی ہے کہ باطل کو ہلاک کرو اس کے بارہ میں چپ رہ کر (امیتوا الباطل بالصمت عنه)

۳۔ اگر بالفرض جاگی ہوئی عداوت صرف خاموشی اور اعراض سے ختم نہ ہو تو اس کے بعد دوسری موثر تدبیر قرآن میں یہ بتائی گئی کہ برائی کے جواب میں بھلائی کا انداز اختیار کیا جائے۔ اخلاق کی اس قسم میں تسخیر کی طاقت ہے۔ وہ دشمن کو بھی دوست بنا دیتا ہے (حم السجدہ ۳۴)

۴۔ بعض استثنائی واقعات میں ایسا ہوسکتا ہے کہ یہ فطری تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو۔ اس وقت مظاہرۂ طاقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ طاقت کا استعمال اب بھی نہ کیا جائے۔ صرف یہ کیا جائے کہ طاقت کے مظاہرہ سے فریق ثانی کو اتنا مرعوب کیا جائے کہ وہ مخالفانہ اقدام سے رک جائے (الانفال ۶۰)

۵۔ اگر سنجیدہ کوشش کے باوجود یہ تمام تدبیریں ناکام ہوجائیں اور فریق ثانی سے مقابلہ بالکل ناگزیر ہوجائے تو اس وقت اپنے دفاع میں حسب استطاعت مقابلہ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

تجارتی کامیابی

امریکہ کے تاجر اپنی تجارت کو بڑھانے کے لیے ہر قابل قیاس اور ناقابل قیاس تدبیریں کرتے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ضرورت کی تمام چیزیں قسطوں پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ویکوم کلینر ہو یا کئی ایکڑ آراضی پر پھیلی ہوئی عالی شان عمارت، موٹر کار ہو یا جیٹ طیارہ، ہر چیز آسان قسطوں پر حاصل کی جاسکتی ہے۔ حتی کہ امریکیوں کے درمیان یہ کہاوت عام ہوگئی ہے کہ اگر آپ کے اندر اقساط ادا کرنے کی استطاعت ہو تو آپ امریکہ کو بھی خرید سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بک رہا ہو۔

امریکہ کے تجارتی ادارہ کی ایک اہم ترین خصوصیت وہ ہے جس کو گاہک نوازی کہا جاتا ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے تاجر ہمہ وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ اپنے گاہک کو خوش کریں اور انھیں اپنے بارے میں مطمئن کر سکیں۔

اسی گاہک نوازی کے اصول کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ کسی تجارتی ادارہ کی ایک شاخ سے خریدا ہوا مال، ناقص ہوتے یا پسند نہ آنے کی صورت میں ادارے کی کسی بھی شاخ کو، کسی بھی شہر میں، یہ کہہ کر لوٹایا جاسکتا ہے کہ خریدنے کے بعد پسند نہیں آیا۔ نہ جھنجھلاہٹ نہ استفسار۔ بس رسید پاس ہونی چاہیے۔ قیمت فی الفور لوٹا دی جاتی ہے۔ "خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا" کا لفظ امریکی کاروباری لغت کے لیے اجنبی ہے۔

اگر ہندستان میں کچھ لوگ ایسا کریں کہ وہ ایک لمیٹڈ کمپنی یا کوآپریٹو سوسائٹی قائم کریں او[ر] مشترک سرمایہ سے ہندستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھولیں جہا[ں] ہر طرح کا سامان بکتا ہو، اور یہ ضمانت دیں کہ کسی بھی اسٹور سے خریدا ہوا سامان کسی بھی اسٹو[ر] پر واپس کیا جاسکتا ہے تو ایسے کاروبار کی سارے ہندستان میں دھوم مچ جائے گی۔ اور ا[یسا کاروبار] یقینی طور پر زبردست کامیابی حاصل کرے گا۔

یہ تجارتی میدان اس ملک میں مکمل طور پر خالی ہے۔ یہاں کسی کے لیے اجارہ داری کی حد تک کامیابی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ تاہم اس امکان سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے اند[ر] ضروری صفات پائی جاتی ہوں — محنت، دیانت داری اور اشتراک عمل۔

اصلاحی کام

۲۸ اگست ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ تین صاحبان ملاقات کے لیے ہمارے دفتر (نئی دہلی) میں آئے۔ یہ تینوں بہار (مظفر پور) سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

محمد مطیع الرحمٰن چترویدی (۴۰ سال)، محمد ابراہیم (۵۰ سال)، محمد داؤد (۴۰ سال)

یہ لوگ "تبلیغی تحریک" کے انداز پر "اصلاحی تحریک" چلا رہے ہیں۔ وہ یکم اگست کو اپنے وطن سے نکلے۔ بہار اور یوپی کے مختلف شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے وہ دہلی پہونچے۔ ایک ماہ کے دوران وہ تقریباً سو بستیوں میں گیے اور لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔

مظفر پور سے مذکورہ تین آدمی چلے تھے۔ اس کے بعد اور آدمی ان سے ملتے گیے۔ یہاں تک کہ ان کا قافلہ ۳۵ آدمیوں پر مشتمل ہو گیا۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنا برتن اور سامان خوراک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مسجدوں میں قیام کرتے ہیں۔ ہر آدمی اپنا خرچ خود ادا کرتا ہے۔ جہاں پہونچتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے معاملات میں عملی مداخلت کر کے انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس ایک مہینہ کے سفر میں انھوں نے بہت سے اصلاحی کام کیے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ بیوہ خاتون کا نکاح کرایا۔ ایک جگہ لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ جہیز وغیرہ کے بغیر شادی کریں۔ چنانچہ کئی لوگ تیار ہوتے اور بالکل سادہ طور پر ان کی شادیاں کرائیں۔ لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ کم مہر مقرر کریں اور مہر معجل کے اصول پر اس کو بوقت نکاح ادا کر دیں۔ کہیں دو مسلمانوں میں جھگڑا قائم تھا۔ اس کو ختم کرا کر دونوں کے درمیان صلح کرائی۔ ایک جگہ مسجد کی تقسیم کر کے دو جماعتیں جاری ہو گئی تھیں۔ وہاں تقسیم کو ختم کرایا اور ایک جماعت جاری کرائی۔ وغیرہ وغیرہ

یہ بلاشبہ عین اسلامی کام ہے۔ جس طرح تبلیغی جماعت "کلمہ و نماز" کے میدان میں کام کر رہی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کے لیے وسیع پیمانہ پر تحریک چلائی جائے۔ اس کا انداز کار وہی ہو جو تبلیغی جماعت کا انداز کار ہے۔ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اسی طرح کی عملی کوششوں سے ہوگی نہ کہ تقریروں اور جلسوں کی دھوم مچانے سے۔

ایک پروگرام

ڈاکٹر ایم سی شرما (عمر ۴۱ سال) سے ۱۹ جولائی ۱۹۸۹ کو ملاقات ہوئی۔ وہ آر ایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی پیدائش چورو (راجستھان) میں ہوئی۔ اسکول میں طالب علمی کے زمانہ میں وہ آر ایس ایس سے وابستہ ہوئے۔ وہ اس کے ایک کٹر ممبر تھے۔ ان کا خیال یہ ہو گیا کہ ہندستان کی تمام مصیبتوں کے ذمہ دار گاندھی تھے۔ وہ گاڈسے کو ہیرو کے روپ میں دیکھنے لگے جس نے ۱۹۴۸ میں گاندھی جی کو گولی مار کر قتل کر دیا۔

وہ اپنے انھیں انتہا پسندانہ خیالات پر تھے کہ ۱۹۷۵ میں سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ہندستان میں ایمرجنسی نافذ کی۔ آر ایس ایس کے کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں میں سے ایک ڈاکٹر شرما بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جیل کی نظر بندی کے زمانہ میں ان کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے مہاتما گاندھی کا مطالعہ شروع کر دیا۔ گاندھی جی کی کتابیں جیل میں آسانی کے ساتھ دستیاب تھیں۔ اس لیے مطالعہ کو جاری رکھنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

انھوں نے بتایا کہ اس مطالعہ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ جب میں جیل سے نکلا تو میں ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ گاندھی اس ملک کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ ساورکر جیسے لوگ جدید ہندستان کے رہنما نہیں بن سکتے تھے۔ اس کام کو کرنے کے لیے گاندھی اور نہرو جیسے لوگ درکار تھے۔

ڈاکٹر شرما کی روداد سننے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ ہندستان میں کرنے کا ایک ضروری کام یہ ہے کہ شہر سے الگ کسی پرسکون مقام پر ایک مرکز بنایا جائے۔ یہاں اسلام کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں جدید معیار پر موجود ہوں۔ اسی کے ساتھ وہاں قیام کا اچھا بندوبست ہو۔ اس کے بعد تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں کو یہاں بلایا جائے، اور چند دن یا چند ہفتہ ٹھہرا کر انھیں اسلام سے واقف کرانے کی کوشش کی جائے۔ اگر ایسا مرکز قائم کیا جا سکے تو اس سے وہی فائدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر حاصل ہو گا جو ڈاکٹر شرما کے حق میں جیل کا ہوا۔

اگر ایسا مرکز قائم ہو تو وہ ہندو نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ مرکز اس ملک میں اسلام کی جدید تاریخ بنانے کا دروازہ کھول دے۔

ضمیر کی طاقت

ابوالبرکات علوی (۶۳ سال) نظام پور ضلع اعظم گڈھ (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ ۲۹ اگست ۱۹۸۹ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے علاقہ کا ایک واقعہ بتایا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

اعظم گڈھ کے شمال مغرب میں ایک گاؤں ریدا ہے جو مجھوئی ندی کے کنارے فیض آباد کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں چار گھر مسلمانوں کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کے دو سو گھر آباد ہیں۔ نومبر ۱۹۸۷ میں ایسا ہوا کہ باہر سے ایک نیل گائے آیا اور گنّے کے کھیت میں داخل ہوگیا۔ ایک مقامی مسلمان جھنو درزی نے چاہا کہ اس کا شکار کیا جائے۔ انھوں نے پڑوس کے گاؤں مخدوم پور میں ایک مسلمان کو اس کی خبر کی جس کے پاس بندوق ہے۔ وہ اپنی بندوق لے کر آئے اور نیل گائے پر فائر کیا۔

اگر نیل گائے موقع پر مرگیا ہوتا تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مگر نشانہ صحیح نہیں لگا۔ نیل گائے زخمی ہوگیا اور خون بہاتا ہوا بھاگا۔ ہندوؤں نے جب جا بجا خون دیکھا تو وہ مشتعل ہوگیے۔ ان کو معلوم ہوا کہ جھنو درزی نے مخبری کرکے نیل گائے پر گولی چلوائی ہے تو انھوں نے گاؤں میں پنچایت کی اور جھنو کو بلا کر اس کو یہ سزا سنائی کہ تم نے جو قصور کیا ہے اس کے بدلے تمہارے اوپر ایک ہزار روپیہ جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔

اس گاؤں میں کوئی سطحی لیڈر جھنو درزی کو بھڑکانے کے لیے موجود نہ تھا اور نہ مسلمانوں کا وہاں کوئی زور تھا جو جھنو درزی کو جھوٹے بھرم میں مبتلا کرے۔ چنانچہ فطرت نے جھنو درزی کی رہنمائی کی۔ وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہوگیا اور کہا: پنچوں کا فیصلہ مجھ کو منظور ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس نقد روپیہ موجود نہیں۔ مگر میں اپنے گھر کا سامان بیچ کر اس کو ادا کروں گا۔

تین دن گزرے تھے کہ ہندوؤں کا ضمیر جاگ اٹھا۔ انھوں نے دوبارہ اپنے لوگوں کی پنچایت بلائی۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ یہاں مسلمان بہت تھوڑے اور کمزور ہیں۔ باہر کے لوگ جب سنیں گے کہ ہم نے ان سے جرمانہ وصول کیا ہے تو وہ ہم لوگوں کو بہت گرا ہوا سمجھیں گے اور ہماری بے عزتی ہوگی کہ ہم نے مسلمانوں کو کمزور پاکر انھیں دبا لیا۔ اتفاق رائے سے یہ طے ہوا کہ جھنو درزی سے جرمانہ نہ لیا جائے۔ چنانچہ اس متفقہ فیصلے کے مطابق جھنو درزی کا جرمانہ معاف کردیا گیا۔

اسلام کی تصدیق

امریکی خواتین میں آج کل ایک نئی تحریک ابھر رہی ہے جس کو تحریک نسواں ثانی (Women's Movement II) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علم برداروں کے دعوے کے مطابق، یہ قدیم تحریک نسواں ہی کی توسیع ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ قدیم تحریک نسواں ایک غیر حقیقی تحریک تھی، اس لیے اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک مبصر نے بجا طور پر اس کو تحریک میں ایک خاموش تبدیلی (quiet shift) قرار دیا ہے۔ امریکی ماہنامہ اسپان (Span) جولائی ۱۹۸۹ میں اس تحریک کا تعارف شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ موجودہ امریکہ کی عورتیں بدحالی کا شکار ہیں۔ کام کرنے والی عورتوں کی دو تہائی تعداد ۱۰۰۰۰ ڈالر سالانہ سے کم کماتی ہے جو امریکہ میں زندگی گزارنے کے لیے ناکافی ہے۔ حمل، بچوں کی نگہداشت اور دوسرے نسوانی مسائل نے عورت کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ واضح ہو کہ امریکہ میں ۲۵۔ ۵۴ سال کے درمیان کی عورتوں کی ۷۰ فی صد تعداد دفتروں اور کارخانوں میں کام کرتی ہے۔ مگر عورتوں کو عام طور پر مردوں سے کم تنخواہ ملتی ہے۔ بڑے عہدے انھیں حاصل نہیں۔

تحریک نسواں اول کا سارا زور اس پر تھا کہ عورت اور مرد ہر اعتبار سے برابر ہیں۔ عورتوں کو اگر آزادی مل جائے تو وہ مردوں ہی کی طرح اپنی زندگی کی تعمیر کر سکتی ہیں۔ عورتوں کو مکمل آزادی مل گئی۔ مگر اب معلوم ہوا کہ عورت کو آزادی کے ساتھ تحفظ (protection) کی ضرورت ہے۔ صرف اپنی ذاتی بنیاد پر وہ کھڑی نہیں ہو سکتی۔

تحریک نسواں دوم کی ایک خاتون لیڈر ٹار وہلم (Tarr-Whelam) نے کہا کہ —— یہ بات واضح ہے کہ عورتوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے اب ریاستیں ہی ہمارے لیے عمل کا مقام ہیں:

> But it is clear that to win women's rights, the states are now the place for action (p. 37).

مغربی عورت نے پہلے برابری کا حق مانگا تھا۔ اس کو برابری کا حق مل گیا۔ اب اس کو معلوم ہوا کہ صرف برابری کا حق کافی نہیں۔ اس کو اسی کے ساتھ مزید سپورٹ کی ضرورت ہے۔ وہ گھریلو قوام کو اپنا قوام بنانے پر راضی نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کو حکومت کو اپنا قوام بنانا پڑا۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ زمانہ آج اسلام کے موافق سمت میں جا رہا ہے۔ انسان کے تجربے

اس کو اس طرف لے جا رہے ہیں کہ وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جائے کہ خدا کا قانون ہی زندگی کا صحیح قانون ہے۔

تجربہ کے بعد

ایک امریکی خاتون لنڈا برٹن (Linda Burton) نے اپنے خاندانی تجربات پر ایک کتاب لکھ کر شائع کی ہے جس کا نام ہے ـــــ تمہارے جیسی ایک تیز عورت گھر پر رہ کر کیا کام کرتی ہے:

What's a Smart Women Like You Doing at Home?

مذکورہ خاتون کی کہانی کا خلاصہ، ان کے لفظوں میں یہ ہے کہ میرا گھر پر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ایک کمپنی میں پورے وقت کی ملازم تھی۔ ۳۳ سال کی عمر میں میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کو سنبھالنے میں مجبورانہ طور پر مجھے اپنی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ یہاں تک کہ میرے لیے معاشی مسائل پیدا ہوگیے۔ اور میں نے دوبارہ باہر کا کام کرنا شروع کر دیا۔

میں اپنے بچے کے لیے شام کا وقت اور ہفتہ کی چھٹی کا دن دے سکتی تھی۔ مگر وہ ناکافی تھا۔ اب میں نے اس کے لیے تحفظ اطفال کا ایک ادارہ تلاش کیا۔ مگر ایک مہینہ کے بعد ہی اس کو ناقص سمجھ کر مجھے چھوڑ دینا پڑا۔ میں ملازمت ترک کر کے دوبارہ گھر پر رہنے لگی تاکہ بچے کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں دو سال تک کسی زیادہ بہتر ادارہ کی تلاش میں رہی۔ یہاں تک کہ میرے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہوگیا۔

میں نے دوبارہ ایک ملازمت کر لی اور اپنے دونوں بچوں کو گھریلو قسم کے تحفظ اطفال کے ادارہ میں ڈال دیا۔ مگر اس کی کارکردگی پر مجھے اطمینان نہ ہو سکا۔ آخر کار میں نے خود اپنے گھر پر انفرادی خدمات حاصل کیں۔ میں نے پایا کہ آپ خواہ کتنا ہی قاعدہ قانون بنائیں۔ کتنا ہی زیادہ رقم خرچ کریں مگر یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے لیے محبت کر سکے:

In time, my search for child care taught me a critical lesson: no matter how many licences we issue, how many guidelines we establish or how much money we pay, it is impossible to have quality controls over the capacity of one human being to love and care for another (p. 94).

میں ایک ایسا شخص چاہتی تھی جو نرم مزاج اور محبت کرنے والا ہو۔ جو مستعد اور کسی قدر پُر مزاح ہو۔ ایک زندہ شخص جو میرے بچوں کی تخلیقیت کو بڑھائے۔ وہ ان کو تفریح کے لیے باہر بھی لے جائے۔ وہ ان کے تمام چھوٹے چھوٹے سوالوں کا جواب دے۔ وہ ان کو میٹھی نیند سلائے۔ آہستہ آہستہ اور تکلیف

طور پر میں اس حیرت ناک واقفیت تک پہونچی کہ جس شخصیت کو میں برسوں سے تلاش کر رہی تھی وہ میری اپنی ناک کے نیچے موجود ہے، یعنی میں خود۔ یہ ہے وہ کام جو میرے جیسی تیز عورت اپنے گھر کے اندر کر رہی ہے :

I had wanted someone who was loving and tender, with a sense of humour and an alert, lively manner — somebody who would encourage my children's creativity, take them on interesting outings, answer all their little questions, and rock them to sleep. Slowly, painfully, I came to a stunning realization: the person I was looking for was right under my nose. I had desperately been trying to hire me. And that's what a smart woman like me is doing at home.

Reader's Digest, August, 1988

مذہب کی تعلیم کے تحت معاشرت کا یہ اصول مقرر کیا گیا تھا کہ مرد کمائے اور عورت گھر کی دیکھ بھال کرے۔ اس طرح تقسیم کار کے اصول پر دونوں زندگی کا کاروبار چلائیں۔

یہ ایک انتظامی بندوبست تھا، نہ کہ کسی کو بڑا درجہ اور کسی کو چھوٹا درجہ دینا۔ مگر جدید دور میں "آزادیٔ نسواں" کی تحریک اٹھی جس نے اس طریقہ کو عورت کی تصغیر کے ہم معنی قرار دیا۔ اور یہ نعرہ دیا کہ دونوں صنفوں کو کسی تقسیم یا حد بندی کے بغیر ہر کام کرنا چاہیے۔ یہ نظریہ اتنا پھیلا کہ عورتوں کی ایک پوری نسل گھر سے باہر نکل پڑی۔

نام نہاد مساوات کے اس تجربہ پر اب تقریباً سو سال بیت چکا ہے۔ خاص طور پر مغربی دنیا میں اس کا تجربہ آخری ممکن حد تک کیا گیا ہے۔ مگر ان تجربات نے اس کی افادیت ثابت کرنے کے بجائے صرف اس کا نقصان ثابت کیا ہے۔ موجودہ مغربی معاشرہ میں مختلف انداز سے مسلسل اس کی مثالیں سامنے آ رہی ہیں۔ انھیں میں سے ایک مثال وہ ہے جس کو اوپر نقل کیا گیا۔

مذہب نے مرد اور عورت کے عمل کے درمیان یہ تقسیم رکھی تھی کہ مرد معاش فراہم کرے، اور عورت نئی نسل کی اخلاقی تعمیر کرے :

Man the bread-earner, woman the character-builder

جدید تہذیب نے اس مذہبی تعلیم سے انحراف کیا۔ مگر جدید تہذیب کے تجربات نے صرف یہ کیا ہے کہ اس نے مذہب کی تعلیمات کی صداقت کو از سر نو مزید قوت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔

عورت جنگ میں

روسی زبان میں ایک کتاب عورتوں کے بارہ میں چھپی ہے جس کا انگریزی ترجمہ ماسکو سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی تفصیل یہ ہے:

S. Alexiyerich, *War's Unwomanly Face*, Progress Publishers, Moscow

دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۱) چھڑی تو روسی حکومت نے اپنے شہریوں سے جذباتی اپیلیں کیں اور مادر وطن (Motherland) کو بچاؤ کا نعرہ دیا۔ اس سے متاثر ہو کر جو روسی نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ان میں ۸ لاکھ (800,000) عورتیں تھیں جن کی عمریں ۱۵-۱۶ سال کے درمیان تھیں۔

مذکورہ کتاب انھیں خواتین سے متعلق ہے۔ خاتون مصنف نے اپنی ۴ سالہ تحقیق کے دوران ایک سو شہروں کا سفر کیا، انھوں نے دو سو شریک ہونے والی عورتوں کا انٹرویو لیا۔

یہ کتاب مذکورہ عورتوں کے بارے میں بہت سبق آموز معلومات پیش کرتی ہے۔ مثلاً کتاب میں بتایا گیا ہے کہ جنگ کے بعد اکثر عورتوں نے اس حقیقت کو چھپانا شروع کیا کہ وہ جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔ "ہم نے چاہا کہ دوبارہ عام لڑکیوں کی طرح ہو جائیں، شادی کے قابل لڑکیاں"۔

We wanted to become ordinary girls again. Marriageable girls.

کتاب کی مصنف جنگ میں شریک ہونے والی ایک تعلیم یافتہ خاتون سے ملیں جن کا نام ویرا سفرمونا ڈوڈوا (Vera Safrmovna Davdova) تھا۔ انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات کتاب کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ وہ یقین رکھتی ہیں کہ جنگ میں عورتوں کا رد عمل مکمل طور پر مردوں سے مختلف تھا۔ مردوں کا فیصلہ کسی تجربہ کے بارے میں زیادہ وقتی اور مبنی بر حقیقت ہوتا تھا۔ جب کہ عورتیں بہت زیادہ جذباتی انداز میں اپنا رد عمل ظاہر کرتی تھیں:

She believes that women reacted to war in a completely different way from men. The men were more matter-of-fact and casual about the experience, whereas the women reacted in an overwhelmingly emotional manner.

موجودہ زمانہ میں عورتوں کی فطرت اور ان کی پیدائشی صلاحیت کے بارہ میں کثرت سے تحقیقات کی گئی ہیں۔ عورت کی صنف کو خالص سائنسی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر عورت کے بارہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں۔

جدید تحقیقات نے بتایا ہے کہ عورت پیدائشی طور پر زود حس ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں جذباتی (Emotional) واقع ہوئی ہے۔ یہ دریافت واضح طور پر بتاتی ہے کہ عورتوں کو زندگی کے ایسے شعبوں میں داخل کرنا درست نہیں جہاں ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کرنے کی ضرورت ہو۔ جہاں حالات کا تاثر قبول کیے بغیر رائے قائم کرنا پڑے۔ جہاں "مردانگی" کی ضرورت ہو نہ کہ "نسوانیت" کی۔

سیاست کا شعبہ، جنگ کا میدان، بین اقوامی معاملات، عدالتی قضیے، بڑے بڑے صنعتی منصوبے، اس طرح کے تمام شعبوں میں ذہنی ڈسپلن اور غیر جذباتی فیصلوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ ان امور میں وقتی محرکات سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسے تمام مواقع پر عورتیں اپنی فطری جذباتیت کی بنا پر غیر موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ جب کہ مرد نسبتاً غیر جذباتی ہونے کی بنا پر زیادہ بہتر ردعمل پیش کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

عورت اور مرد کا یہی پیدائشی فرق ہے جس کی بنا پر اسلام میں دونوں کا میدان کار الگ الگ رکھا گیا ہے۔ یہ درجہ کے فرق کی بات نہیں ہے بلکہ عمل کے میدان میں فرق کی بات ہے۔ یہ تفریق سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں نام نہاد آزادیٔ نسواں کے علمبرداروں کا طریقہ غیر سائنسی ہے نہ کہ اسلام کا طریقہ۔

ایک کتاب

لندن سے مذاہب کی ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا چھپی ہے۔ اس میں مختلف مغربی علماء کے ۲۴ مقالات درج ہیں۔ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک کے تمام مذاہب کی معلومات نہایت سلیقہ کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ بڑی تعداد میں تاریخی تصویریں شامل ہیں۔ طباعت اور ترتیب کی موزونیت نے کتاب کو ایک خوبصورت البم بنا دیا ہے۔ کتاب کا نام یہ ہے:

Man and His Gods, The Hamlin Publishing Group Ltd., London, 1974, pp. 440

قدیم زمانہ میں مذہب پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ یا تو کسی مذہب کی موافقت میں ہوتی تھیں یا اس کی مخالفت میں۔ مذاہب کا غیر جانب دارانہ تاریخی تعارف قدیم زمانہ میں ایک لامعلوم چیز تھی۔ موجودہ زمانہ میں جو چیزیں پیدا ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذاہب اور دوسرے موضوعات پر اس انداز سے کتاب لکھی جاتی ہے گویا لکھنے والا اپنے موضوع پر کوئی موافق یا مخالف رائے نہیں رکھتا، وہ صرف ایک قلمی کیمرہ کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی اصل صورت حال کی تصویر کشی سے ہے نہ کہ اس کے بارے میں اپنی کوئی رائے دینے سے۔

زیر نظر کتاب بھی اسی انداز پر لکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے مرتب نے کتاب کا خاتمہ حسب ذیل سطروں پر کیا ہے: "اس انسائیکلو پیڈیا نے حقائق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا کام حکم لگانا یا کوئی معیار قائم کرنا نہیں، اس نے صرف سچائی کو پیش کر دیا ہے (صفحہ ۴۳۱)

قدیم طرز کی متکلمانہ کتابیں "پروپیگنڈا لٹریچر" سمجھی جاتی ہیں۔ مگر اس طرز تصنیف نے آج کے متکلمین کو موقع دیا ہے کہ وہ بظاہر لوگوں کو علوم کی تدوین کرتے ہوئے نظر آئیں، حالانکہ حقیقۃً وہ اپنا کلامی لٹریچر تیار کر رہے ہوں۔ پھر یہی کتابیں تعلیم گاہوں میں عمومی نصاب کے طور پر داخل ہوں۔ لائبریریوں کے ریفرنس سکشن میں سجائی ہوئی ہوں۔ علمی تحقیق کے لئے ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اس طرز تصنیف کے رواج سے یہودیوں اور عیسائیوں نے کافی فائدہ اٹھانے کی کوشش

کی ہے۔ وہ انداز ترتیب کے لحاظ سے مکمل طور پر غیر جانب دار رہ کر مذہب اور تاریخ کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہیں۔ ان کو آدمی اس طرح پڑھتا ہے گویا کہ وہ ایک موضوع کا علمی مطالعہ کر رہا ہے نہ کہ اس کے بارے میں کسی موافق یا مخالف کا تبصرہ پڑھ رہا ہے۔ پھر نہایت ہوشیاری سے وہ اس کے بین السطور میں اپنا نقطۂ نظر شامل کر دیتے ہیں۔

اس انسائیکلوپیڈیا میں جس کے ایک مقالہ نگار ہندو اور باقی سب یہودی یا عیسائی ہیں، اسلام کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بظاہر اس میں اسلام کی دعوتی، تہذیبی اور سیاسی کامیابیوں کا فیاضانہ اعتراف موجود ہے۔ حتی کہ اس میں یہ جملہ بھی ہے کہ اسلام نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا:

Its advent changed the course of human history (p. 38).

اس کتاب میں تسلیم کیا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بھی اسلام نے پر امن ذرائع سے نئی کامیابیاں (new gains) حاصل کی ہیں۔ افریقہ میں تیزی سے نومسلموں کا اضافہ کسی تبلیغی کوشش سے زیادہ اسلام کی اپنی کشش کی بنیاد پر ہو رہا ہے (۴۰۴) تاہم اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لکھنے والے نے یہ سطریں کیوں کر لکھیں۔ مثال کے طور پر صفحہ ۳۹۵ پر درج ہے:

" محمد کو اپنی زندگی میں عرب سے باہر کسی علاقہ کا قبضہ حاصل نہیں ہوا۔ کسی طرح یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سمجھتے ہوں کہ عربوں کے علاوہ بھی اسلام میں کسی کے لئے کوئی معنویت ہے۔ اگرچہ بعد کا مسلم نظریہ ان کے عالمی مقاصد کی توثیق کرتا ہے۔ تاہم اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں انھوں نے عرب کی بعض سرحدی عیسائی ریاستوں کے خلاف مہم بھیجی جو جزیرہ نما کے شمال میں واقع تھیں۔ ان مہموں نے مسلمانوں کو عظیم بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں سے ٹکرا دیا اور پیغمبر کی وفات کے جلد ہی بعد تیز رفتار اور دائمی فتح کا سبب بن گئیں "

اس پیراگراف نے اسلام کو اس سطح پر کھڑا کر دیا جہاں موجودہ مسیحیت ہے۔ بائبل کے مطابق، حضرت مسیح اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجے گئے (متی ۱۵: ۲۴) مگر بعد کو سینٹ پال اور دوسرے مسیحی راہبوں نے کشف و رویا کا سہارا لے کر

مسیحیت کو عالمی بنا دیا۔ مگر پیغمبر اسلام کی بابت یہ بیان بالکل خلاف واقعہ ہے۔ قرآن میں صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ آپ تمام دنیا کے لئے ڈرانے والے (فرقان - ۱) بنا کر بھیجے گئے۔ آپ نے خود فرمایا کہ اُرسِلتُ الی الناس کافۃ (میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں) آپ نے اپنی زندگی ہی میں عرب کے باہر دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے۔ اور صریح طور پر پیشین گوئی فرمائی کہ اسلام عنقریب ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ وغیرہ۔

اسی طرح اس کتاب میں وہ غلطی بھی کی گئی ہے جو موجودہ زمانہ کے رواجی مطالعہ کی بنا پر اکثر مذہبی مصنفین کرتے ہیں۔ اسلام کسی تاریخ کا نام نہیں، وہ قرآن، رسول کی سنت اور آپ کے اصحاب کے چھوڑے ہوئے نمونہ کا نام ہے۔ اس لئے اسلام کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات، رسول کی ثابت شدہ سنت اور صحابہ کرام کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر اسلام کو سمجھا جائے۔ اسلام صرف اسی چیز کا نام ہو جو ان معیاری ذرائع سے معلوم ہو۔ اس کے سوا کسی چیز کا نام اسلام نہ ہو۔ بعد کے دور میں اسلام کی جو تاریخ بنی، اس کو مذکورہ بالا معیار پر جانچا جائے اور اتنے ہی حصہ کو اسلام قرار دیا جائے جو اس معیار پر پورا اترے۔ باقی کو "انحراف" قرار دے کر اسلام کی حقیقی تاریخ سے الگ کر دیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مصنفین اس کے بجائے یہ کرتے ہیں کہ اسلام کے نام پر مسلمانوں میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، اس کو اکٹھا کرتے ہیں اور اس پورے مجموعہ کو اسلام قرار دے دیتے ہیں۔ اس طرح توحید سے لے کر بزرگ پرستی تک ہر چیز کا نام اسلام ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کبھی کسی "مسلمان" نے گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہو کر ایک تصویر بنائی جس میں دکھایا کہ فرشتہ ایک پردار خاتون کی شکل میں آیا ہے اور پیغمبر اسلام کو خدا کی وحی پہنچا رہا ہے۔ اس تصویر کو نہایت اہتمام سے اڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا اور کتاب میں اس کا فوٹو (۳۹۱) چھاپ دیا گیا۔ اسی طرح چودھویں صدی عیسوی میں کسی مسلمان یا عیسائی نے دو صاحب ریش بزرگوں کی تصویر بنائی اور ان کے سر پر پگڑی رکھی۔ ایک کو اونٹ پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا، دوسرے کو گدھے پر۔ گدھے کے مسافر کے نیچے لکھ دیا "عیسیٰ" اونٹ کے مسافر کے لئے لکھ دیا: "محمد" یہ تصویر بھی اسلامی تاریخ کے ایک مستقل عنصر کی حیثیت سے (۴۳۱) اس کی زینت بن گئی۔ مسلمانوں میں

ایک گروہ پیدا ہوا جس نے دوسری قوموں کے اثر سے "وجد" کا نظریہ نکالا۔ ایسے لوگوں کی ایک مجلس کا فوٹو دے دیا گیا (۴۱۱) اور دکھایا گیا کہ اسلام کے مطابق جب خدائی راگ چھیڑا جاتا ہے تو لوگوں کو وجد آجاتا ہے اور وہ کھڑے ہو کر ناچنے لگتے ہیں۔

اسی طرح مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بعض معاملات میں قرآن کے بیانات متضاد (contradictory) ہیں۔ مثال کے طور پر کبھی قرآن کہتا ہے کہ انسان کو عمل کی آزادی حاصل ہے، اور کبھی قرآن ہی یہ زور دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ انسان کے تمام معاملات پر خدا کا مکمل کنٹرول قائم ہے (۴۰۷)۔ قرآن کی بابت مقالہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ اس کے کسی ماقبل انسانی ماخذ کا ثبوت نہیں ملتا (۴۰۲)، حتیٰ کہ قرآن کی زبان بھی محمد کی اپنی روزمرہ کی زبان سے مختلف ہے (۳۹۸)۔ پھر بھی معروف رواج کے مطابق انھیں تلاش ہے کہ سابق مذہبی کتابوں میں اس کا کوئی ماخذ مل جائے وغیرہ۔

یہ باتیں بلاشبہ ہمارے لئے تکلیف دہ ہیں۔ مگر اس قسم کی جو کتابیں چھپ رہی ہیں، ان کا توڑ یہ نہیں ہے کہ ان کے خلاف ایک جلی کٹی تنقید لکھ کر چھاپ دی جائے یا ناشر اور مصنف کے نام احتجاجی تار روانہ کر دئے جائیں۔ اس قسم کی کوشش خدمت اسلام کا جھوٹا کریڈٹ لینے کے ہم معنی ہے۔ ان کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ کچھ خبریں اخبار میں چھپ جائیں اور وہ بھی دینی نقصان میں مالی نقصان کے اضافہ کی قیمت پر۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ان کتابوں کا علمی بدل فراہم کیا جائے، ہمارے درمیان اعلیٰ سطح پر ایسے ادارے قائم ہوں جو خود علوم کو نئے ڈھنگ پر مرتب کر ڈالیں۔ موجودہ قسم کی اشتہاری کتابوں کے بجائے وہ علمی طرز کی کتابیں تیار کریں۔ اسلام کی قلمی خدمت کے کام کو مناظرہ بازی یا دوسرے لفظوں میں "مذہب کے پروپگنڈہ لٹریچر" کی سطح سے اٹھا کر تدوین علوم کی سطح پر پہنچا دیں۔ وہ انسانی ذہن کو تحقیق و تصنیف کے اس مقام پر پہنچ کر خطاب کریں جہاں سے دوسرے لوگ اس کو خطاب کر رہے ہیں۔ دوسری کوئی بھی صورت اس فتنہ کے مقابلہ کی نہیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ کو طرابلس سے پی آئی اے کی فلائٹ ۷۱۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں جہاز ایک بار نیچے اوپر ہونے لگا۔ ہوائی جہاز کے ساتھ جب یہ صورت پیش آتی ہے تو اکثر وہ دو ہزار فٹ تک نیچے چلا جاتا ہے۔ مگر بلندی پر اڑتے ہوئے مسافر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۔۲۰ فٹ نیچے اوپر ہو رہا ہے۔ ہوائی جہاز جب ۳۰ ہزار فٹ کی اونچائی پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اسی طرح ہلکا ہو جاتا ہے جیسے کوئی آدمی پانی پر تیرتے ہوئے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرتا ہے۔ اس ہلکے پن کی وجہ سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ جہاز دو ہزار فٹ کے بقدر نیچے اوپر ہو رہا ہے۔

جہاز جب اس طرح ہلتا ہے اور جھٹکے کے ساتھ نیچے اوپر ہوتا ہے تو عام مسافر اس کو دیکھ کر گھبرا اٹھتے ہیں۔ مگر یہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ کم از کم ہوابازی کی تاریخ میں اب تک صرف اس کی وجہ سے کوئی جہاز حادثہ کا شکار نہیں ہوا۔

واپسی کے سفر میں ہماری پہلی منزل دمشق تھی۔ جہاز دمشق کے ہوائی اڈہ پر اترا تو اس "قدیم ترین شہر" کی نسبت سے بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

"دمشق" کے نام کے ساتھ اتنی زیادہ یادیں وابستہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے بعد اصحاب رسول کی سب سے زیادہ تعداد جہاں مدفون ہے وہ شام، خاص طور پر دمشق ہے۔ اس کے علاوہ علماء اسلام اور مختلف قسم کی اسلامی شخصیتوں کی بہت بڑی تعداد یہاں مدفون ہے۔

دمشق نے اپنی تاریخ کے طویل دور میں بڑے عجیب عجیب منظر دیکھے ہیں۔ قدیم عہد کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو حضرت حسین کا سر کاٹ کر اسی دمشق میں یزید کے پاس لایا گیا۔ فتح اسپین (۷۱۱) کے چار سال بعد موسیٰ بن نصیر دمشق واپس آئے تو ان کے ساتھ تقریباً ۴۰۰ کی تعداد میں اسپینی شہزادے تھے جن کے سروں پر تاج تھے اور کمر میں سونے کے پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ دمشق اس قدیم تقریباً پانچ سو سالہ مسلم عہد کی یاد دلاتا ہے جب کہ دمشق سے لے کر فرانس کی سرحد تک عثمانی ترکوں کی حکومت قائم تھی، وغیرہ وغیرہ۔

جدید فلسطینی تحریک کے ایک لیڈر خلیل الوزیر تھے۔ ان کو عام طور پر ابو جہاد کہا جاتا تھا۔ ان

فلسطین میں پیدا ہوئے۔ آخری دنوں میں وہ پی ایل او کے فوجی کمانڈر کی حیثیت سے تیونس میں مقیم تھے۔ ان کی تدفین دمشق میں ہوئی۔

ابوجہاد اپنی خطرناک سرگرمیوں کی وجہ سے اسرائیل کے لئے دردسر بنے ہوئے تھے۔ وہ اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی گوریلا جنگ کے کمانڈر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مارچ ۱۹۷۸ میں انھیں کے منصوبہ کے مطابق ایک اسرائیلی سڑک سے ایک بس کا اغوا کیا گیا تھا اور اس کے ۳۵ یہودی مسافر قتل کردئے گئے تھے۔

اس طرح کے مختلف واقعات کی بنا پر اسرائیل کے حکمراں ابوجہاد سے بگڑے ہوئے تھے۔ آخر کار ایک نہایت منظم منصوبہ کے تحت ۱۶ اپریل ۱۹۸۸ کو انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس خفیہ منصوبہ کی تفصیل امریکی ہفتہ وار ٹائم (۲۵ اپریل ۱۹۸۸ اور ۲ مئی ۱۹۸۸) میں شائع ہوئی ہے۔ ٹائم (۲ مئی ۱۹۸۸) کے مطابق اسرائیلی پارلیمنٹ کے ایک ممبر یوسی سرید (Yoshi Sarid) نے کہا کہ ایک کے بعد ایک ابوجہاد ختم کئے جاسکتے ہیں مگر یہ چیز فلسطینی مسئلہ کو ختم نہیں کرسکتی:

Abu after Abu can be liquidated. But this will not liquidate the Palestinian problem (p. 17).

ہندستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جون ۱۹۸۸ کے پہلے ہفتہ میں شام کا دورہ کیا تھا۔ دمشق میں انھوں نے ۴ جون ۱۹۸۸ کو ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے دمشق کی خصوصیت بتاتے ہوئے کہا کہ محمد بن قاسم یہاں سے روانہ ہو کر ہندستان پہنچے تاکہ وہاں اسلام کے پیغام کو پھیلائیں:

Mohammad bin Qasim set sail from here to India to spread the message of Islam.

راجیو گاندھی کے اس بیان پر ہندستان کے کچھ فرقہ پرستوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا دہلی کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (۱۹ جون ۱۹۸۸) نے لکھا تھا کہ راجیو گاندھی اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ ورنہ محمد بن قاسم ہندستان میں اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں آیا۔ وہ قتل اور لوٹ اور زناکاری کے لئے یہاں آیا تھا (صفحہ ۱۶)۔ یہی بات ہندو مہاسبھا کے

صدر جینیت پاٹل نے اپنے ایک مراسلہ میں بھی جو ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جون ۱۹۸۸) میں چھپا تھا۔

مسٹر جینیمت پاٹل نے اپنے دعوے کی تائید میں مورخ بلاذری کا حوالہ دیا تھا۔ مگر یہ حوالہ سراسر غلط ہے۔ احمد بن یحییٰ البلاذری (م ۸۹۲ء) کی کتاب فتوح البلدان میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں۔ بلکہ اس کتاب میں محمد بن القاسم کی تصویر اس سے یکسر مختلف نظر آتی ہے جو مذکورہ مضامین میں اس کی بتائی گئی تھی۔

عربوں نے سندھ کو آٹھویں صدی عیسوی (۷۱۲ء) میں فتح کیا تھا۔ اور البلاذری کا زمانہ نویں صدی عیسوی ہے۔ اس طرح وہ ایک قریب العہد مورخ ہے۔ البلاذری نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ایک بات یہ ہے کہ دمشق میں اندرونی سازشوں کی وجہ سے نوجوان محمد بن القاسم کو دمشق واپس بلایا گیا جہاں اس کو قید کر دیا گیا۔ تاہم سندھ میں وہ نہایت نیک نام تھا۔ چنانچہ سندھ کے مقامی باشندوں کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے البلاذری نے لکھا ہے کہ ان کو جب اس کی خبر ملی تو ہندستان کے لوگ روئے اور انھوں نے کیرج کے مقام پر محمد بن القاسم کا بت بنایا (فبکیٰ اھل الھند وصوّروہ بالکیرج، صفحہ ۴۴۶)

محمد بن القاسم کا کردار اگر وہ ہوتا جو ہندو مہاسبھا کے صدر یا آرگنائزر کے مضمون نگار بتا رہے ہیں تو یہ ناممکن تھا کہ اہل سندھ کے درمیان اس کو یہ محبوبیت اور مقبولیت حاصل ہو کہ وہ اس کے سندھ سے جانے کے بعد اس کا ماتم کریں، حتیٰ کہ اس کا بت بنائیں اور اس کے سامنے غیر معمولی عقیدت واحترام کا اظہار کریں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ - ۱۹۷۹) نے ۱۹۵۹ کے آخر میں بعض عرب ممالک کا دورہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ شام (دمشق) میں بھی چند دن ٹھہرے۔ اس سفر کی روداد مولانا موصوف کے رفیق سفر مولانا محمد عاصم صاحب نے مرتب کی ہے جو "سفرنامہ ارض القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"مولانا ان کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت موثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کی جاتی

تو شاید وہ اتنی موثر نہ ہوتی" صفحہ ۳۲

سید ابو الاعلیٰ مودودی کا یہ جواب غیر ذمہ دارانہ حد تک غلط ہے۔ مزید غیر ذمہ داری کی بات مولانا موصوف کے رفیق کا یہ جملہ ہے کہ "یہ جواب نہایت موثر رہا" گویا مسئلہ سنجیدہ حقیقت بیانی کا نہیں بلکہ مجلسی اثر آفرینی کا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ بات۔

جواب کے اس انداز کو میں حد درجہ غیر اسلامی اور غیر اخلاقی سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو بعض مسائل در پیش ہیں۔ مگر وہ کون سا ملک ہے جہاں کسی نہ کسی قسم کے مسائل درپیش نہ ہوں۔ پھر ہندستان ہی کو ان مسائل کے لئے مطعون کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

مارچ ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں ایک عرب ملک میں تھا۔ ایک عرب شیخ نے اپنے مکان پر دعوت کا اہتمام کیا۔ بہت سے لوگ مدعو تھے۔ یہاں میری ملاقات ہندستان کے ایک اسلام پسند رہنما سے ہوئی۔ ایک عرب شیخ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندستان میں تو مسلمانوں کو مسجد کے اندر بھی سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

میں نے آہستہ سے پوچھا: حضرت، آپ کس ہندستان کی بات کر رہے ہیں۔ وہی ہندستان جہاں میں رہتا ہوں یا کوئی اور۔ انھوں نے فوراً صفدر جنگ (دہلی) کی مسجد کا نام لیا۔ میں نے کہا، پھر مطلق انداز میں ممانعتِ سجدہ کی بات کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو کہنا چاہئے کہ ہندستان میں لاکھوں مسجدیں ہیں جن میں مسلمانوں کو نماز کی آزادی ہے۔ البتہ ایک مسجد (صفدر جنگ) میں انھیں یہ آزادی حاصل نہیں جو بہت پہلے سے آثار قدیمہ کے ماتحت ہے۔

دمشق سے جہاز پر ۱۸۰ مسافر سوار ہوئے۔ یہ سب "زیارت" کے لوگ تھے۔ وہ پاکستان سے دمشق اور بغداد برائے زیارت گئے۔ وہاں حضرت زینب، حضرت حسین وغیرہ کے مزارات ہیں۔ اب وہ پاکستان واپس جا رہے تھے۔

میرے پاس کی سیٹ پر ایک صاحب آکر بیٹھ گئے۔ ان کا نام محمد عباس کاظمی تھا۔ وہ لاہور میں کتابوں کی دکان کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں وہ لاہور چلے آئے ان کے بال سفید ہو چکے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے دونوں زمانوں کو دیکھا ہے۔ یہ بتائیے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے والی زندگی میں اور موجودہ پاکستان کی زندگی میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے

دردمندانہ لہجہ میں کہا کہ بس یہ فرق ہے کہ پہلے ملک میں ہندو مسلم جھگڑے ہوا کرتے تھے، اب ہمارے یہاں شیعہ سنی جھگڑے ہوتے ہیں۔

"زیارت" سے لوٹنے والے یہ تمام لوگ شیعہ تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ میں نے محمد عباس کاظمی صاحب سے پوچھا کہ اس سفر میں فی کس کتنا خرچ آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فی کس ۱۹ ہزار روپیہ۔ ۱۸۰ آدمی ہمارے جہاز میں دمشق سے سوار ہوئے۔ مگر اس سے زیادہ تعداد ابھی دمشق اور بغداد میں موجود تھی۔ یہ لوگ جہاز کے اندر بار بار نعرہ لگا رہے تھے ـــــ نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت، نعرۂ حیدری۔ نعرہ دینے والا پہلے دونوں الفاظ نسبتاً دھیرے بولتا تھا۔ مگر جب وہ "نعرۂ حیدری" بولتا تو اس کی آواز غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی۔

جہاز کے اندر پی آئی اے کی فلائٹ میگزین "مسافر" ستمبر ـ اکتوبر ۱۹۸۹ مطالعہ کے لئے موجود تھی۔ اس کے انگریزی حصہ میں پی آئی اے کے بارہ میں ایک مضمون تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ پی آئی اے ۱۹۵۴ میں قائم ہوئی۔ اس دوران اس نے کیا ترقی کی اور آئندہ اس کے کیا منصوبے ہیں، اس ذیل میں یہ فقرہ درج تھا کہ جمہوریت کے احیا کی وجہ سے ملک مسکراہٹوں سے بھرا ہوا ہے اور پی آئی اے بھی ترقیاتی پرواز کے لئے اپنے بازو پھیلا رہی ہے:

Since the revival of democracy, the country is full of smiles, and PIA too is flexing its wings (p. 29).

دوسری طرف جہاز کے اندر اردو اخبارات تھے۔ ان میں اپوزیشن لیڈروں کے بیانات ملک کے بارہ میں اس سے مختلف کہانی سنا رہے تھے ـــــ موجودہ دنیا میں کوئی زندگی کبھی آئیڈیل نہیں ہوتی۔ کوئی شخص زندگی کو مثبت رخ سے دیکھتا ہے تو اس کو زندگی امکانات سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ دوسرا شخص اس کو منفی رخ سے دیکھتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ زندگی مصائب اور مشکلات کے سوا اور کچھ نہیں۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کی صبح کو کراچی پہنچا۔ میں نے دہلی سے یہاں کا ویزا لے لیا تھا۔ چنانچہ کراچی میں ۱۲ گھنٹے قیام رہا۔ کراچی میں میرا قیام "فضل سنز لمٹڈ" کے یہاں تھا۔ وہ لوگ گلشن اقبال میں رہتے ہیں۔ (123-D)

جہاز سے اتر کر ایرپورٹ کی بس پر سوار ہوا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بس میں زیادہ تر مسافر پاکستان (کراچی) کے تھے۔ زیادہ عمر کے ایک بزرگ اندر داخل ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک شخص نے ان کو دیکھ لیا اور اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا کہ آئیے، یہاں بیٹھ جائیے۔ وہ بدستور کھڑے رہے اور کہا: میاں، بیٹھنے کا وقت کہاں، اب تو لیٹنے کا وقت ہے۔

ان کی زبان سے یہ فقرہ سن کر دل تڑپ اٹھا۔ مجھے اپنا معاملہ یاد آگیا۔ میری عمر اب ۶۵ سال ہو چکی ہے۔ بڑھاپا اپنی تمام علامتوں کے ساتھ آنا شروع ہو گیا ہے۔ اب وہ وقت قریب آگیا ہے جب کہ دنیا کی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے مجھے قبر کے تختہ پر لٹا دیا جائے۔

یہ دن ہر شخص کے لئے مقدر ہے۔ ہر شخص کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے کہ اس کی موت آجائے۔ اس کو "اپنی دنیا" سے نکال کر "خدا کی دنیا" میں داخل کر دیا جائے۔ کتنا سنگین لمحہ ہر شخص پر آنے والا ہے۔ مگر ہر شخص کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔

ڈاکٹر خالد انعام اللہ صاحب بھی اسی جہاز سے اترے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اکثر سفر میں رہتے ہیں اور بے شمار کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ ان کے ساتھ ان کے محترم والد ڈاکٹر انعام اللہ خاں (۷۵ سال) کے مکان پر آیا۔ یہاں تقریباً آدھ گھنٹہ قیام رہا۔

ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب موتمر العالم الاسلامی کے سکرٹری جنرل ہیں۔ اس کو مولانا محمد علی وغیرہ نے قائم کیا تھا۔ ۱۹۲۴ میں جب خلافت تحریک سیاسی حیثیت سے ختم ہو گئی تو مولانا محمد علی وغیرہ کے سامنے سوال آیا کہ "اب کیا"۔ حکومتی سطح پر خلافت کا نظام قائم کرنے کے مواقع نہیں تھے، چنانچہ انھوں نے "ادارہ" کی سطح پر اس کام کو جاری رکھنے کے لئے ۱۹۲۶ میں مذکورہ موتمر قائم کی۔ اس کے پہلے صدر مفتی اعظم فلسطین اور نائب صدر علامہ اقبال تھے۔

ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب نے اپنے والد حاجی عبد الکریم خاں غازی پوری (وفات ۱۹۷۴) کے بارہ میں بتایا کہ وہ نہایت نیک نفس آدمی تھے۔ اپنے ملازموں کو جاہل دیکھنا انھیں گوارا نہ تھا۔ چنانچہ وہ خود انھیں پڑھایا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو کھلانے پلانے میں کوتاہی نہ کرو، اور جو کچھ تمہارے گھر میں موجود ہے بس وہی پیش کر دو، کیوں کہ جو تمہارے کھانے کے قابل ہے، وہ تمہارے مہمان کے کھانے کے قابل بھی ہے۔

حافظ عبد الکریم صاحب کا ایک خاص نظریہ تھا جس کو وہ "تطہیر فکر اول" کے لفظوں میں بیان کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عمل ہمیشہ فکر کے تحت ہوتا ہے۔ فکر اگر صحیح نہ ہوگا تو عمل بھی صحیح نہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ یہی جڑ کی بات ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری تمام تحریکیں ناکام ہوگئیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کے رہنماؤں نے تطہیر فکر کا اول کام کئے بغیر عملی اقدام کے ثانوی کام سے اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہا۔ ایسی تحریک کے لئے موجودہ اسباب کی دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں ——— خلافت تحریک کی ناکامی کا سبب بھی یہی ہے۔

"پاکستان ابھی تک پاکستان نہ بن سکا" ایک "اسلام پسند" پاکستانی نے کہا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اس لئے بنا تھا کہ وہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے، مگر ابھی تک پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہ کیا جا سکا۔ اگر آپ پاکستان جائیں یا پاکستان کے اخبارات پڑھیں تو یہ بات آپ کو بے شمار لوگوں کی زبان سے سنائی دے گی۔

وہ کون ہے جس نے نصف صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک پاکستان کو پاکستان بننے نہیں دیا۔ اس کے جواب میں لوگ مختلف طاقتوں یا شخصیتوں کا نام لیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس المیہ کے سب سے بڑے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو پاکستان کے وجود میں آتے ہی "مطالبہ نظام اسلامی" کا جھنڈا لے کر کھڑے ہوگئے۔

۱۹۴۷ میں جو چیز وجود میں آئی وہ صرف ایک جغرافی خطہ تھا۔ اس جغرافی خطہ میں وہ مسلم معاشرہ موجود نہ تھا جو اسلامی نظام کے قیام کا تحمل کر سکے۔ یہاں "اسلام پسند" لوگوں کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ افراد کی ایمانی بیداری اور معاشرہ کی دینی اور اخلاقی اصلاح میں لگ جاتے۔ سیاست کو وہ کچھ عرصہ کے لئے اپنے حال پر چھوڑ دیتے۔ یعنی الکشن میں جو لوگ ووٹوں کی اکثریت حاصل کرتے انھیں موقع دیا جاتا کہ وہ حکومت کریں۔ ایک طرف انفرادی سطح پر اصلاح کا عمل چلتا رہتا اور دوسری طرف الکشن پروسس اپنی فطری رفتار سے جاری رہتا۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو اب تک یقینی طور پر وہ منزل آجاتی جو مطالباتی اسلام کے نتیجہ میں مزید دور ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ وہ بکر

عرب کے کنارہ واقع ہے۔ ۱۸ویں صدی کے آغاز میں کراچی صرف ایک معمولی گاؤں تھا۔ یہاں زیادہ تر مچھیرے رہتے تھے۔ ۱۸۳۹ میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا۔ یہ قبضہ بے حد اہم تھا۔ یہ واقعہ آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ثانی کے زمانہ حکومت (۱۸۵۷ - ۱۸۳۷) میں ہوا۔ اس وقت ہندستان میں بہت سے علما، اور مصلحین موجود تھے۔ مگر مطبوعہ ریکارڈ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان میں سے کوئی شخص "کراچی" کی اہمیت کو جانتا ہو۔ کراچی کی اہمیت کو جاننے کے لئے سمندری شعور درکار تھا، اور اس وقت مسلم زعما، میں سے ہر ایک صرف "سیاسی طاقت" کو جانتا تھا، ان میں سے کسی کو "سمندری طاقت" کی خبر نہ تھی۔ بدقسمتی سے یہی صورت حال ظاہری فرق کے ساتھ آج بھی باقی ہے۔

انگریزوں نے کراچی پر قبضہ کرکے وہاں اپنی فوجیں رکھ دیں۔ ۱۸۴۳ میں انھوں نے کراچی اور ملتان کے درمیان دریائے سندھ کے راستہ سے پہلی اسٹیمر سروس شروع کی۔ اب کراچی بندرگاہ کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا۔ ۱۸۶۴ میں کراچی سے لندن کے لئے براہ راست ٹیلی گراف کا نظام قائم کیا گیا۔ ۱۸۶۹ میں نہر سوئز کھلنے کے بعد کراچی کی اہمیت مزید بڑھی۔ ۱۸۷۳ تک کراچی ایک مکمل بندرگاہ بن چکا تھا۔ ۱۸۷۸ میں یہاں ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ۱۹۱۴ میں کراچی پوری برطانی شہنشاہیت میں گیہوں برآمد کرنے کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ ۱۹۲۴ میں یہاں ایک ہوائی اڈہ بنایا گیا جو اب توسیع کے بعد انٹرنیشنل ایر پورٹ کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۹ تک وہ پاکستان کی پہلی راجدھانی تھا۔

سندھ میں توڑ پھوڑ کی سیاست لامتناہی طور پر جاری ہے۔ اس سیاست کے نتیجہ میں کچھ لیڈروں کو شہرت اور مقبولیت مل رہی ہے۔ مگر خود سندھ اور اس کے عوام تیزی سے بدحالی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ تاجر طبقہ (ملکی اور غیر ملکی دونوں) سندھ میں اپنا کاروبار سمیٹ رہا ہے اور پنجاب کی طرف اپنا رخ کرنے لگا ہے۔ آج ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کے اخبار جنگ میں ایک اڈیٹوریل نوٹ (سندھ سے سرمایہ کاروں کی نقل مکانی) نظر سے گزرا۔ اس کے تحت درج تھا:

" ایک اخباری اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ سندھ میں ڈکیتی اور اغوا کے واقعات میں اضافے

کے بعد وہاں کے بالخصوص کراچی کے سرمایہ کاروں نے پنجاب کی طرف نقل مکانی شروع کردی ہے اور اب سندھ کے بجائے پنجاب میں نئے صنعتی یونٹ لگانے کے لئے قومی بینکوں اور مالیاتی اداروں سے رجوع کرنے کا آغاز کردیا ہے اور پنجاب کے بڑے شہروں کے قرب وجوار میں اپنے عزیز و اقارب کے توسط سے صنعتی یونٹ لگانے اور دیگر کاروبار کرنے کے لئے آراضی کی خرید میں مصروف ہیں۔ سرمائے کی گردش اور سرمایہ کاری صرف پرامن فضا میں ہی ممکن ہوتی ہے اور سرمائے کی منڈی اتنی حساس ہوتی ہے کہ محض ایک افواہ ہی اس کے کونے کونے تک اتھل پتھل مچا کر رکھ دیتی ہے۔ صوبہ سندھ میں ایک عرصے سے اغوا و ڈکیتیوں کے جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ یقیناً سرمایہ کاری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ہیں اور اس بات کا امکان ہے کہ ان سے سرمایہ کاروں میں نقل مکانی کا رجحان پیدا ہوا ہو۔"

ایک پاکستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ خلیج کے ایک ملک میں کچھ دنوں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز وہ وہاں کے پوسٹ آفس میں ایک خط کی رجسٹری کرنے گئے۔ لفافہ پر انھوں نے ہندستانی قاعدہ کے مطابق، بھیجنے والے کا پتہ لفافہ کے نیچے بائیں طرف لکھا تھا۔ جب کہ خلیجی قاعدہ کے مطابق، اس پتہ کو لفافہ کے اوپر بائیں طرف لکھا جانا چاہئے۔

پوسٹ آفس کے عرب کلرک نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ غلط ہے، دوسرے لفافہ پر صحیح پتہ لکھ کر لاؤ۔ آدمی نے کہا کہ میرے پاس دوسرا لفافہ نہیں، اور اس وقت بازار سے بھی دوسرا لفافہ حاصل کرنا مشکل ہے، آپ اسی لفافہ کو قبول کرلیں۔ بات بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ کلرک نے بگڑ کر کہا: اتخالف النظام (کیا تم نظام کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہو) یہ جملہ وہاں کے لحاظ سے ایک قسم کی دھمکی تھی۔ اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ خاموش رہو، ورنہ تم کو پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیجی ممالک میں کتنا سخت گیری کا ماحول ہے۔ خلیجی ممالک میں جو امن ہے، وہ دراصل اسی پابند نظام کا نتیجہ ہے، اور ہندستان میں جو بے امنی ہے، وہ یہاں کے آزاد نظام کا نتیجہ۔ اس دنیا میں اکثر اوقات یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی بیک وقت دونوں چیزوں کو لے سکے۔ ایک کو لینے کے لئے اسے دوسرے کو چھوڑنا

پڑتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان نے تقسیم کو دل سے قبول نہیں کیا، اسی لئے دو نوں ملکوں کے درمیان تعلقات خراب ہیں اور دونوں جگہ ترقی کا عمل رکا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو عین وہی نفسیات ہے جس میں خود پاکستان کے لوگ بہت بڑے پیمانے پر مبتلا ہیں۔ یہاں جب بھی الکشن ہوتا ہے اور کچھ لوگ جیت کر اوپر آتے ہیں تو ہارنے والے لوگ ان کی جیت کو قبول نہیں کرتے۔ وہ فوراً فاتح کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ تخریب کاری کی اس سیاست میں اسلام پسند لوگ بھی پوری طرح شریک ہیں۔ اس کے نتیجہ میں پاکستان کے ماحول میں منفی ذہنیت اور تخریبی مزاج اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ "تم جیتے، میں ہارا" ایک سادہ سا جملہ ہے، مگر پاکستان کے بے ریش اور باریش رہنماؤں میں کوئی بھی شخص اب تک اس جملہ کو کہنے کی جرأت نہ کرسکا۔

کراچی کے ہفت روزہ تکبیر (۳۴ استمبر ۱۹۸۹) میں ایک پورے صفحہ پر نمایاں انداز میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ یہ "ایک خادم ملت" کی طرف سے ہے اور اس کے اوپر قرآن کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ مضمون ایک آیت کے ترجمہ اور اس کے عنوان پر مشتمل ہے جو اس طرح ہے :

ہرگز نہ دبو ایسے شخص سے

ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے۔ طعنے دیتا ہے۔ چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔ بھلائی سے روکتا ہے۔ ظلم و زیادتی میں حد سے گزرنے والا ہے۔ سخت بد اعمال ہے۔ جفا کار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے۔ (القلم ۱۰-۱۶)

ولا تطع کا ترجمہ "ہرگز نہ دبو" اور اس کے اوپر مذکورہ جلی سرخی سے بظاہر یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہ آیت ایسے لوگوں سے لڑائی لڑنے کا حکم دے رہی ہے۔ حالانکہ آیت کا یہ مفہوم نہیں۔ اسی قسم کے ترجموں اور تفسیروں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ مزاج بنادیا ہے کہ ہر جگہ وہ لڑنے بھڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ حکمت اور ہم آہنگی کو انھوں نے بزدلی سمجھ لیا ہے اور نزاع اور تصادم کو جہاد۔

اس آیت میں " اطاعت نہ کرو " کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اثر نہ لو ۔ ان کی باتوں پر دھیان نہ دو ۔ ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنی دعوت کے انداز میں تبدیلی نہ کرو۔ یہاں " اطاعت " کا لفظ اسی مفہوم میں شدت پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے نہ کہ یہ بتلانے کے لئے کہ ان سے " ہرگز نہ دبو " اس عسکری مفہوم کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک مسلم نوجوان جو کالج میں پڑھ رہے ہیں ، ان سے میں نے یہاں کے تعلیمی اداروں کے حالات پوچھے ۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں اسکولوں اور کالجوں میں سیاست بازی اور دہشت گردی اتنی عام ہوگئی ہے کہ وہاں اب پڑھنے کا ماحول باقی نہیں رہا ۔ مزید یہ کہ یہاں مہلک ہتھیار (کلاشنکوف ، پستول) بالکل عام ہیں۔ کسی بھی وقت ایک شخص آکر ایک طالب علم کو گولی کا نشانہ بنا کر بھاگ جائے گا اور اس کا کچھ نہیں ہوگا۔

انھوں نے بتایا کہ اس صورت حال کی بنا پر اب یہ حال ہے کہ جو لڑکے واقعی پڑھنا چاہتے ہیں ، وہ امریکہ چلے جاتے ہیں ۔ اور جب وہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو اس کے بعد وہ وہیں رہ جاتے ہیں ۔ دوبارہ وہ پاکستان واپس نہیں آتے ۔ میں نے کہا کہ یہ تمام نقصانوں میں سب سے بڑا نقصان ہے ۔ جو نوجوان مجبوراً یہاں ٹھہریں وہ اچھی تعلیم حاصل نہ کرسکیں گے اور جن کے پاس وسائل ہوں یا جو زیادہ ہونہار ہوں وہ باہر چلے جائیں گے۔ اکبر الٰہ آبادی نے انگریزوں کے جاری کردہ نظام تعلیم پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا :

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اکبر الٰہ آبادی اور ان کے جیسے دوسرے رہنماؤں کو معلوم نہ تھا کہ اصل مسئلہ قوم کی بے شعوری ہے نہ کہ انگریزوں کا تعلیمی نظام۔ اس بے شعوری کی حالت میں " انگریز " کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ ان کے ملک میں آکر ان کے نوجوانوں کو " قتل " کرے ۔ وقت کا فرعون اپنے ملک میں رہے گا اور ہماری قوم کے نوجوان خود بھاگ بھاگ کر اس کے یہاں پہنچیں گے اور اس کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے تاکہ وہ انھیں قتل کرسکے۔

ایک صاحب جو الرسالہ پڑھتے ہیں ، انھوں نے راقم الحروف کے انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا انداز پرو گورنمنٹ (pro-government) انداز ہے ۔ میں نے

کہا کہ یوں نہ کہئے۔ بلکہ اس طرح کہئے کہ آپ کا انداز پرو ریلیٹی (pro-reality) انداز ہے۔ میرا کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف یہ کرتا ہوں کہ میں حقیقت پسندی کی بات کرتا ہوں۔ مگر لوگوں کے منفی ذہن کی وجہ سے وہ انھیں حکومت پسندی کی بات معلوم ہوتی ہے۔

الرسالہ میں ایک بار ہندستان اور پاکستان کی جنگ کا ذکر تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اس جنگ میں پاکستان کامیاب نہ ہو سکا، اور اس کی وجہ اس کی کمتر تیاری تھی۔ اس کے مقابلہ میں ہندستانی فوج نے زیادہ بہتر منصوبہ بندی کا ثبوت دیا، اس لئے وہ پاکستان کی پیش قدمی کو روک دینے میں کامیاب رہے۔ یہ تذکرہ صرف بطور سبق تھا۔ مگر الرسالہ کے بہت سے پاکستانی خریدار اس پر سخت ناراض ہوئے حتی کہ انھوں نے الرسالہ کو پڑھنا بند کر دیا۔

یہاں اخبار نوائے وقت ۲۵ ستمبر ۱۹۸۹ میں ایک مضمون (اصل حقائق) پڑھنے کو ملا۔ یہ اخبار بیک وقت لاہور، راولپنڈی، ملتان، کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ ایک سابق فوجی افسر ابوذر غفاری نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا ایک حصہ عبرت کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

" پاک فوج کے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل مرزا محمد اسلم بیگ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو جی ایچ کیو آڈیٹوریم میں ملک بھر کے ایڈیٹروں اور سینئر صحافیوں کے سوالوں کے جوابات دئے تھے۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہم نے نہ جیتی نہ ہاری اور یہ کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ ہم ہار گئے تو اس نے ہر فوجی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا کہ وہ ان دونوں جنگوں کا دوبارہ جائزہ لیں۔

جنرل صاحب کا یہ کہنا حقائق کے عین مطابق ہے کہ ۱۹۶۵ کی جنگ ہم نے نہیں جیتی تھی اور نہ ہی ہم اسے ہارے تھے۔ ۱۶ ستمبر تک پاکستان اور بھارت دونوں یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اس جنگ کو نہیں جیت سکتا۔ اسی لئے دونوں کی یہ کوشش تھی کہ کوئی اس جنگ کو بند کروادے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ بچوں کا کھیل نہیں۔ جنگ لڑنے کے لئے امن کے زمانے میں بہت زیادہ تیاری کرنا پڑتی ہے۔ تیزی سے ختم ہوتے ہوئے گولہ بارود کے ذخائر اور فوجی ساز وسامان کی توڑ پھوڑ نے دونوں ممالک کے جرنیلوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بہتر یہی ہوگا کہ جنگ جلد از جلد بند کر دی جائے۔ اسی لئے جب سلامتی کونسل نے جنگ بندی کے لئے کہا تو دونوں ممالک نے اسے تسلیم کر لیا۔

بدقسمتی سے سیاست دانوں کو اپنے عوام کو ساتھ رکھنے کے لئے قدم قدم پر جھوٹ بولنا پڑتا ہے اسی پاکستان کے حکمرانوں نے یہ اعلان کیا کہ انھوں نے بھارت کی کئی گنا افواج کو شکست دے دی ہے اس طرح پاکستان کے عوام نے یہ یقین کر لیا کہ انھوں نے یہ جنگ جیت لی ہے۔ شاعروں ادیبوں اور گانے والوں نے پاک افواج کے بہت گن گائے۔

سیاست دانوں نے نہ صرف عام لوگوں کو گمراہ کیا تھا بلکہ فوج بھی یہ سمجھنے لگی کہ اس نے بھارتی فوج کو شکست دے دی ہے۔ فوجی تقریبات میں گانے والوں کو بلایا گیا جنھوں نے "میرا ماہی چھیل چھبیلا" "کرنیل نی جرنیل نی" جیسے گانے گائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوجی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ یہ صورت حال حساس فوجی افسروں کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس جنگ کے چند ہفتوں بعد جب جنرل موسیٰ خاں سیالکوٹ تشریف لائے اور انھوں نے وہاں دو ڈویژنوں کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے اس جنگ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں نے ان سب کے سامنے جب دوران جنگ ہونے والی چند غلطیوں کا ذکر کیا تو ہر طرف سے شور اٹھا کہ بیٹھ جاؤ۔ میری تنقید تعمیری تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے سوچیں تاکہ ہم اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کر سکیں۔ لیکن میں ابھی اس وقت اتنا باہوش نہیں تھا کہ یہ سمجھتا کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنی غلط بات پر اصرار کرتا رہتا ہے۔"

کراچی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ "یوم شہداء" کا بورڈ نظر آیا۔ آج ۳۰ ستمبر کے اخبارات (مثلاً حریت، ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر اس قسم کی سرخیاں تھیں: آج پورے سندھ میں یوم شہداء حیدر آباد منایا جا رہا ہے۔" اسی کے ساتھ آج ہی کے اخبار (نوائے وقت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر جلی سرخی تھی کہ" اترپردیش اور مقبوضہ کشمیر میں ۴۴ مسلمان شہید کر دئے گئے۔ مسلمان ہندستان میں بھی "شہید" ہو رہے ہیں اور پاکستان میں بھی۔

کراچی کے اخبار حریت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) اور اسی تاریخ کے وفاق اور نوائے وقت میں جو خبریں پڑھیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ " ۳۰ ستمبر کو مہاجر قومی موومنٹ کے زیر اہتمام پورے سندھ میں یوم شہداء حیدر آباد منایا گیا۔ پچھلے سال ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ کو یہ واقعہ ہوا تھا کہ مسلح دہشت گرد (پٹھانوں) نے کلاشنکوف اور دیگر جدید خود کار ہتھیاروں سے اندھا دھند فائرنگ کر کے

حیدر آباد (سندھ) میں دو سو سے زیادہ (مہاجر) شہریوں کو شہید کر دیا تھا۔ ان میں بوڑھے، جوان، عورتیں، بچے سب شامل تھے۔ ان شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مہاجر قومی موومنٹ نے شہیدوں کی پہلی برسی کے موقع پر یوم شہدا، حیدر آباد منانے کا اعلان کیا ہے۔ دیگر کارروائیوں کے علاوہ پورے حیدر آباد میں جگہ جگہ سیاہ بینر آویزاں کئے گئے جن پر ۳۰ ستمبر کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ انوکھی خوش قسمتی ہے کہ وہ اگر غیر مسلموں کی گولی سے مارے جائیں تب بھی وہ شہید ہوتے ہیں، اور اگر وہ آپس میں لڑ کر مریں تب بھی شہید ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی کی یہ قسم اس سے پہلے کسی دور کے مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آئی۔

نوائے وقت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) سے معلوم ہوا کہ پاکستان میں ایک طرف جئے سندھ کے نعرے ہیں، اور دوسری طرف جئے مہاجر کے نعرے۔ صفحہ اول پر مہاجر تحریک کے لیڈر الطاف حسین کی تقریر کی رپورٹ تھی۔ اس کے چند جملے یہ ہیں: ایم کیو ایم کے ارکان قومی اسمبلی نے جس طرح ایوان میں مہاجروں کے حقوق کے لئے آواز بلند کی ہے، اس کی مثال ۴۲ سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا کہ مہاجروں میں جوش و جذبہ برقرار رہا تو مہاجروں کو سمندر میں دھکیلنے کا دعویٰ کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہنا شروع کر دے کہ جو سندھی نہیں ہے، وہ سندھ سے چلا جائے۔ ہم نے سندھی بن کر رہنے کے لئے نہیں، بلکہ پاکستانی بن کر رہنے کے لئے پاکستان بنایا تھا"

الفاظ میں معمولی تبدیلی کر دیجئے تو ہندستان کا مسلمان لیڈر بھی عین یہی تقریر کر رہا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کا مسئلہ "ہندو ظلم" کا مسئلہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ٹھیک یہی واقعہ پاکستان میں کیوں پیش آتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ بے دانشی کا مسئلہ ہے۔ مسلمان، یا صحیح تر لفظوں میں ان کے رہنما، دانش کو کھو بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ہی قسم کے مسائل سے دونوں جگہ دوچار ہیں، ہندستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔

اخبار نوائے وقت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر ایک خبر تھی۔ جماعت اسلامی پاکستان کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد صاحب نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی

مسلمان امت کو ایک سازش کے تحت پچاس قوموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس وقت اولین ضرورت اس امر کی ہے کہ زبان، علاقہ، برادری، فرقوں میں منتشر اس امت کو مجتمع کر کے ایک قوت بنایا جائے"۔ اسی طرح جماعت اسلامی کے دوسرے رہنماؤں، چودھری رحمت الٰہی اور پروفیسر غفور احمد نے پاکستان کے موجودہ حالات کی نہایت تاریک تصویر پیش کی۔

میں نے جماعت اسلامی کے ایک صاحب سے کہا کہ آپ لوگ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو عہد ساز شخصیت کہتے ہیں، پھر جو عہد انھوں نے بنایا ہے، وہ کہاں ہے۔ وہ نہ ہندستان میں نظر آتا اور نہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں۔ نہ کسی دوسرے چھوٹے یا بڑے مقام پر۔ اگر آپ کسی ایسے مقام کا پتہ بتائیں جہاں یہ عہد سازی ہوئی ہے تو میں وہاں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا۔ مگر وہ کسی ایسے مقام کا نام نہ لے سکے۔

قدیم زمانہ کے لوگ اپنے بادشاہوں کی تعریف میں مبالغہ آمیز اشعار کہا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے مفروضہ اکابر کی شان میں اسی قسم کی شاعرانہ لفاظی کر رہے ہیں۔ یہ ذوق سب سے زیادہ ان دو ملکوں میں ہے جس کا نام ہندستان اور پاکستان ہے۔

پاکستانی اخبارات میں ہندستان کے فساد کی خبریں تھیں۔ ان میں اس قسم کی سرخیاں نظر پڑیں —— بھارت میں مسلم کشی، بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام۔ ان سرخیوں کو پڑھ کر ہندستان کے بارہ میں عجیب خوفناک تصور قائم ہوا۔ شبہ ہوا کہ دہلی ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد میں زندہ گھر پہنچوں گا یا میری لاش گھر لے جائی جائے گی۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ مبالغہ اور تعمیم کی بات تھی۔ بدقسمتی سے دونوں ملکوں میں یہی غیر معتدل صورت حال قائم ہے۔ ہندستان کے اخبارات پاکستان کے بارہ میں اسی قسم کی مبالغہ آمیز خبریں شائع کرتے ہیں۔ اور پاکستان کے اخبارات ہندستان کے بارہ میں اسی طرح مبالغہ اور تعمیم کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس ناگوار صورت حال کو ختم کرنے کی صورت صرف ایک ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک ملک یک طرفہ طور پر اسے ختم کر دے۔ اس کے بعد دوسرے ملک میں اپنے آپ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

کراچی سے دہلی کا سفر پی آئی اے کے ذریعہ طے ہوا۔ اور میں ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کی رات کو

وہاں پہنچا۔ میرے ساتھ سفر میں ہمیشہ صرف ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ ہوتا ہے۔ نہ مزید بیگ اور نہ کسٹم کا کوئی سامان۔ اس لئے جہاز سے اترنے کے بعد مجھے ایرپورٹ پر رکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ میں فوراً "گرین چینل" کی طرف سے باہر آجاتا ہوں۔ آج بھی ایسا ہی پیش آیا۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جس کو دنیا میں سامان کم ملا، اس کا حساب آخرت میں بھی کم ہوگا (قلّۃ المال اقلّ للحساب) دل نے کہا کاش دنیا کا یہ واقعہ آخرت میں پیش آنے والے معاملہ کی علامت ہو۔ جس طرح دنیا کے ایرپورٹ نے مجھے آسانی کے ساتھ گزار دیا، اسی طرح آخرت کے "ایرپورٹ" پر بھی مجھ کو آسانی کے ساتھ گزار دیا جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

انسانی جہاز مجھ کو وطن سے اٹھا کر لے گیا اور افریقہ کی زمین پر اتار دیا۔ اور پھر دوبارہ وطن کی طرف واپس لایا۔ موت کا جہاز مجھ کو لے جا کر آخرت کی دنیا میں اتار دے گا جہاں سے واپسی کے لئے کوئی سواری ملنا ممکن نہیں۔ ایک سفر ختم ہوگیا، دوسرا سفر شروع ہونے والا ہے۔ پہلے سفر کی تاریخیں معلوم تھیں، دوسرے سفر کی کوئی تاریخ معلوم نہیں۔ کتنا فرق ہے ایک سفر میں اور دوسرے سفر میں۔ اسی فرق کو جاننے کا نام ایمان ہے اور اسی فرق کو نہ جاننے کا نام کفر۔

سفرنامہ بہت لمبا ہوگیا۔ مگر اس کی آخری سطریں لکھتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ سراسر ناتمام ہے۔ شاید جو بات لکھنے کی تھی، وہی اس میں لکھنے سے رہ گئی۔ کوئی انسان دوسروں کی کہانی کیا لکھے گا، وہ خود اپنی کہانی بھی تحریر نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پڑھنے والے صرف وہ ہیں جو نہ لکھے کو پڑھیں۔ جاننے والے صرف وہ ہیں جو نہ بتائے ہوئے کو جانیں۔ مگر آج کی دنیا میں لکھے ہوئے کو پڑھنے والے بھی موجود نہیں۔ پھر نہ لکھے ہوئے کو پڑھنے والے اس دنیا میں کہاں ملیں گے۔ خدا اس بندے پر رحم فرمائے جو زبان رکھتے ہوئے بے زبان ہے۔ جس کے پاس قلم ہے۔ مگر جب اس نے قلم اٹھایا تو وہ صرف یہ لکھ سکا کہ میں نے لکھنا چاہا تھا، مگر میں لکھنے میں ناکام رہا۔

۱۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۸۹ کو سی بی سی آئی سنٹر (نئی دہلی) میں ایک مذہبی پروگرام تھا۔ انٹر ریلیجس فورم فار کمیونل ہارمونی نے کرسمس کی تقریب سے اس کو منعقد کیا تھا۔ اس موقع پر تمام مذاہب کے اعلیٰ نمائندے شریک ہوئے۔ اسلامی مرکز کو اس موقع پر اسلام کی نمائندگی کی دعوت دی گئی تھی۔ مرکز کی طرف سے ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے اس موقع پر پیپر پیش کیا۔ اس پیپر میں سورہ مریم (آیت ۱۶ تا ۳۶) کا انگریزی ترجمہ درج تھا۔ اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو مختصر طور پر بیان کیا گیا تھا۔

۲۔ یونیسف (UNICEF) کے زیر اہتمام نئی دہلی (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر) میں ۲۷ دسمبر ۱۹۸۹ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع نیشنل ڈولپمنٹ تھا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق وہاں ایک پیپر پیش کیا گیا۔ حاضرین میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔

۳۔ بمبئی کے کچھ لوگوں نے ۱۰۲ لائبریریوں کی طرف سے زر تعاون ادا کر کے ۱۰۲ لائبریریوں کے نام الرسالہ جاری کروایا ہے۔ یہ ایک اچھی مثال ہے۔ اگر اسی طرح دوسرے لوگ تعاون کریں اور الرسالہ ملک کی تمام لائبریریوں میں پہونچنے لگے تو ذہنی تعمیر کا کام بہت وسیع پیمانہ پر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ہونے لگے گا۔

۴۔ الرسالہ مشن کی تقریباً پندرہ سالہ جدوجہد اب اس حد تک موثر ہوئی ہے کہ عام طور پر لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل رہا ہے۔ اس کی مثالیں روزانہ سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً دہلی کے ایک ماہنامہ ذکروفکر (جنوری ۱۹۹۰) نے ہندستان کے فسادات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کو مسلمانوں کی داعیانہ کوتاہی سے جوڑا ہے۔ اس نے لکھا ہے: مسلمانوں کا وجود دعوت سے وابستہ ہے اور دعوت ہی ان کے تحفظ اور بقا کی ضامن ہے۔ پوری امت رسول برحق صلے اللہ علیہ وسلم کی نائب اور قائم مقام ہے۔ کوئی ہرکارہ اپنے فرض منصبی کو ادا نہ کر سکے تو وہ ناکارہ کہا جاتا ہے۔

۵۔ ایک عرب نوجوان محمد طارق الکردی آئرلینڈ (ڈبلن) میں مقیم ہیں۔ وہ الرسالہ مشن

سے متاثر ہیں۔ انھوں نے خط کے ذریعہ مطلع کیا ہے کہ وہ آئرلینڈ کے غیر مسلموں میں تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے انگریزی الرسالہ کے اب تک کے تمام شمارے اور انگریزی میں مرکز کی شائع شدہ تمام کتابیں مانگی ہیں۔ یہ سب چیزیں ان کو بذریعہ ڈاک روانہ کر دی گئی ہیں۔

۶۔ مسٹر ایف۔ ایچ خان انگریزی تعلیم یافتہ ہیں، اس سے پہلے وہ خلیج میں کام کر رہے تھے۔ آجکل وہ پونہ میں مقیم ہیں۔ انھوں نے رضاکارانہ طور پر خود اپنے جذبہ سے "اللہ اکبر" نامی کتاب کا مکمل انگریزی ترجمہ کر کے بھیجا ہے۔ یہ ترجمہ اس وقت نظر ثانی کے مرحلہ میں ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اس کو مکمل صورت میں شائع کیا جائے گا۔ "اللہ اکبر" گویا اسلام کے روحانی پہلو پر ہے۔ اس وقت اس کی انگریزی اشاعت بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ مغربی لوگوں کو مذہب کا روحانی پہلو ہی زیادہ متاثر کرتا ہے۔

۷۔ قاضی عبدالقادر صاحب (کراچی) نے اطلاع دی ہے کہ کراچی سے ایک ماہانہ پرچہ "عرفات" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے صفحات میں اکثر الرسالہ کے مضامین نقل کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس کے صفحات کے کچھ فوٹو کاپی بھیجے ہیں، اس سے اس کی نوعیت کا اندازہ ہوا۔ یہ پرچہ خاص طور پر کراچی کی کمپنی پاک عرب ریفائنری لمیٹڈ کے کارکنوں اور افسروں کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے۔

۸۔ بیسویں صدی (دہلی) اور انشار (کلکتہ) خالص ادبی انداز کے پرچے ہیں۔ تاہم وہ الرسالہ کے تعمیری مضامین اکثر اپنے صفحات میں شائع کرتے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام ان حلقوں میں بھی مسلسل پہونچ رہا ہے۔

۹۔ مولانا محمد عبدالرحیم رشادی (پلاپٹی، ٹامل ناڈو) لکھتے ہیں: ہمارے یہاں ڈنڈیگل میں آر ایس ایس والوں نے ایک مناظرہ کا اعلان کیا تھا۔ موضوع مناظرہ یہ تھا کہ فحش گوئی میں بڑھی ہوئی کتاب کون سی، بائبل یا قرآن۔ اس اعلان پر مسلم نوجوان بہت بھڑک گیے۔ اور ارادہ کر لیا کہ قرآن کے خلاف کوئی گستاخی کی بات ہوئی تو مار پیٹ اور قتل کریں گے۔ وہ حضرات میرے پاس آئے۔ میں ۱۲ سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ چنانچہ میں نے

ایک گھنٹہ تک سنجیدگی اور اعراض اور صبر وغیرہ جو الرسالہ کی دعوت ہے، ان کے سامنے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ اس پر وہ حضرات ٹھنڈے پڑ گیے۔ اور سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ چنانچہ قانونی کارروائی میں اقدام کر کے ان کا مناظرہ کینسل کروا دیے۔ اب وہ حضرات کہہ رہے ہیں کہ "مولانا، اگر آپ اس طرح ہم کو نہ سمجھاتے تو ہم کتنے نقصان میں رہتے اور خواہ مخواہ کے ہنگامے اور خسارے میں مبتلا ہوتے۔ اس سے بچنے کے لیے آپ سبب بنے۔ اسی طرح ہمیں اپنے تمام مسائل کو حل کرنا ہے"۔ دعا ہے کہ پورے عالم میں الرسالہ کی آواز پہونچے اور اس دعوت کی آغوش میں پوری امت پناہ لے۔

۱۰۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں آپ کی تقریباً ساری کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ "اسلام دورِ جدید کا خالق" بھی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ اگر دوسروں نے بھی اسلام کو ہمارے سامنے ایسے ہی پیش کیا ہوتا تو آج مسلمان ہر جگہ فتنہ و فساد میں لگے ہوئے نہ ہوتے۔ آج اسلام کو آپ کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہم وقت پر آپ سے متعارف نہیں ہوتے تو ہماری زندگی آج کے حالات میں نہ جانے کن سنسان راہوں میں ہوتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ بیسویں صدی میں اسلام اچھی طرح سمجھانے کے لیے آپ کو راہ دکھائی (عبدالمجید بھٹ، پوہرو کشمیر)

۱۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میرے پاس الرسالہ برابر آتا ہے اور مطالعہ کے بعد احباب کے درمیان سرکلیٹ کیا جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو ہر ماہ اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ میں آپ کے مضامین کا مداح ہی نہیں عاشق ہوں۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب (فیصل آباد) سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی فکر صحیح ہے۔ اپروچ صحیح ہے۔ کرنے کا کام وہی ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ مولانا کی اور ہم لوگوں کی زبردست خواہش ہے کہ الرسالہ کو پاکستان سے شائع کیا جائے۔ براہِ کرم میرے نام سے ۳۰ پرچوں کی ایجنسی جاری کر دیں (قاضی عبدالقادر، کراچی)

۱۲۔ بھوپال میں ہر سال تبلیغی اجتماع ہوتا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں ۴۲ واں تین روزہ اجتماع ہوا۔ اس میں ہندستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ شرکاء کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ تھی۔ اس موقع پر بھوپال کے ساتھیوں نے اسلامی مرکز کا اسٹال لگایا۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے معلومات کیں اور کتابیں اور رسالے حاصل کیے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک کے لیے

ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۲ مئی ۱۹۹۰

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

بیس سال بعد

"کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا" ــــــــ چھ لفظ کے اس جملہ کو آج ایک شخص چھ سکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنی زبان سے ادا کر سکتا ہے۔ مگر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے کولمبس کو ۲۰ پُرمشقت سال صرف کرنے پڑے۔

کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus) ۱۴۵۱ میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ ۱۵۰۶ میں اسپین میں اس کی وفات ہوئی۔ امریکہ کی دریافت حقیقۃً یورپ کے لیے مشرق کا سمندری راستہ دریافت کرنے کی کوشش کا ایک ضمنی حاصل (by-product) تھی۔ کولمبس نے ۱۴۸۴ میں پرتگال کے شاہ جان دوم (John II) سے درخواست کی کہ وہ اس بحری سفر کے لیے اس کی مدد کرے۔ مگر شاہ پرتگال نے اس کو بے فائدہ سمجھ کر مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد کولمبس نے کیسٹل (Castile) کی ملکہ ازبیلا (Isabella) سے مدد کی درخواست کی یہاں بھی اس کو مثبت جواب نہیں ملا۔ تاہم کولمبس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ آٹھ سال کے بعد ملکہ نے اس کو کشتیاں اور ضروری سامان مہیا کر دیا۔

کولمبس نے تین کشتیوں کے ساتھ اپنا پہلا سفر ۳ اگست ۱۴۹۲ کو شروع کیا۔ تاہم اس سفر میں وہ امریکہ کے ساحل تک پہونچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ہر قسم کی مشکلات اور آزمائشوں کے باوجود کولمبس اپنی کوشش میں لگا رہا۔

آخر کار چوتھے سفر کے بعد ۱۵۰۴ میں وہ "نئی دنیا" کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا (10/691) کولمبس سے پہلے دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کولمبس کی دریافت نے (نئی اور پرانی) دونوں دنیاؤں کو ملا کر ایک کر دیا۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم دریافت تھی۔ مگر یہ دریافت صرف اس وقت ممکن ہو سکی جب کہ کولمبس اور اس کے ساتھی بے حوصلہ ہوئے بغیر ۲۰ سال تک اس جان جوکھم منصوبہ کی تکمیل میں لگے رہے۔

یہی اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں ہر کامیابی "۲۰ سالہ" محنت مانگتی ہے۔ اس کے بغیر یہاں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ایک سنت

تبلیغی جماعت کے افراد جب گشت پر نکلتے ہیں تو ان میں بولنے والا صرف ایک ہوتا ہے جس کو متکلم کہتے ہیں۔ بقیہ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ چپ رہیں اور صرف متکلم کو بولنے کا موقع دیں۔

بقیہ لوگوں کے چپ رہنے کا مطلب سادہ طور پر صرف چپ رہنا نہیں ہے۔ تبلیغ کا نظام انھیں بھی ایک اہم کام بتاتا ہے۔ وہ کام یہ کہ وہ متکلم اور سامع کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے رہیں۔ وہ اللہ سے رجوع ہو کر خاموش زبان میں کہیں کہ اے اللہ، تو متکلم کو توفیق دے کہ وہ صحیح بات اپنی زبان سے نکالے، اور سامع کو توفیق دے کہ وہ صحیح بات کو سن کر اسے قبول کرلے۔

یہ بظاہر معمولی سی بات ہے، مگر وہ بے حد اہم بات ہے۔ یہ ایک سنت کو زندہ کرنے کے ہم معنی ہے جو موجودہ زمانہ میں تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور پلیٹ فارم کی ایجاد نے لوگوں کے اندر یہ ذہن پیدا کر دیا کہ اصل کام لکھنا اور بولنا ہے۔ اب ہر آدمی کچھ نہ کچھ لکھ کر چھاپنے لگا، اور ہر آدمی نے لاؤڈ اسپیکر لگا کر بولنا شروع کر دیا۔ حتی کہ لکھنے اور بولنے کا یہ ذوق اتنا بڑھا کہ اس کے ہنگامہ میں اصل بات ہی گم ہو کر رہ گئی۔ بولنا سب کچھ بن گیا اور نہ بولنا کچھ بھی نہ رہا۔

اسلام نے جو طریقہ بتایا اور صحابہ کرام نے جس پر کامل طور پر عمل کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف بولنا ہی کام نہیں ہے بلکہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ جس آدمی کے لئے بولنے کا موقع نہ ہو اس کے لئے بھی ایک عظیم مشغولیت ہے۔ یہ کہ وہ دوسرے دینی خادموں کے حق میں نیک دعا کرے۔ اور عام انسانوں کے لئے یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صراط مستقیم کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہ سنت اگر مسلمانوں میں پوری طرح زندہ ہو جائے تو بیشتر جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ مزید یہ کہ ملت کے اندر اب جو کام جاری ہے، وہ کام زیادہ موثر اور کارگر بن جائے کیونکہ اس کے بعد انسانی کوشش کے ساتھ خدا کی نصرت بھی اس میں شامل ہو جائے گی۔

اگر آپ بولنا جانتے ہیں تو بولئے۔ لیکن اگر آپ بولنا نہ جانتے ہوں تب بھی آپ کے لئے ایک بہت بڑا کام ہے ــــ آپ بولنے والوں کے حق میں اور سننے والوں کے حق میں دعا کیجئے۔ یہ دوسرا عمل پہلے عمل سے کسی بھی درجہ میں کم نہیں۔

شیر بولے گا

انسان شیر کو مارتا ہے۔ وہ شیر کو کٹہرے میں بند کرتا ہے۔ انسان اپنے اس فعل کو جائز ثابت کرنے کے لیے کہتا ہے کہ شیر ایک وحشی جانور ہے۔ وہ ایک خوں خوار حیوان ہے۔ تاہم یہ یک طرفہ بیان ہے۔ اس معاملہ میں فریق ثانی (شیر) کا بیان اب تک سامنے نہ آسکا۔ کیوں کہ شیر اپنی ساری بہادری اور عظمت کے باوجود بولنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس صورت حال پر افریقہ کے عوام کے درمیان ایک مثل مشہور ہے۔ افریقہ شیروں کا ملک ہے۔ افریقی جنگلوں میں سب سے زیادہ شیر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ شیر سے متعلق مثلیں بھی ان کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک مثل یہ ہے کہ جب تک شیر نہ بولیں، اس وقت تک تاریخ صرف وہی رہے گی جو شکاری انسان بتائیں :

Until lions can speak, the only history will be that of the hunters.

یہی صورت حال وسیع تر معنوں میں خود انسان کے بارہ میں بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں، مختلف اسباب سے، اصل حقیقت شیر کی مانند بے زبان ہے۔ تمام اہم ترین سچائیاں چھپی ہوئی پڑی ہیں۔ اخبارات میں جھوٹے بیانات چھپ رہے ہیں۔ کتابوں اور مضامین میں ہر آدمی اپنی مرضی کی بات لکھ کر شائع کر رہا ہے۔ جلسوں اور کانفرنسوں کا حال یہ ہے کہ جس کے پاس الفاظ کا ڈھیر ہو، وہ اسٹیج کا ہیرو بن جاتا ہے۔ ان لفظی ہنگاموں کے درمیان اصل حقیقت چھپی ہوئی پڑی ہے۔ وہ اپنا بیان جاری نہیں کرتی۔

تاہم یہ صورت حال صرف اس وقت تک کے لیے ہے "جب تک حقیقت نہ بولے"۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب "حقیقت کا شیر" چنگھاڑ اٹھے گا۔ وہ بول کر لوگوں کو بتائے گا کہ اصل واقعہ کیا تھا اور لوگوں نے اس کو کس طرح پیش کیا۔ انسان اندر سے کیا تھا اور باہر سے وہ اپنے آپ کو کس شکل میں ظاہر کرتا رہا۔ لوگوں کی سرگرمیوں کا اصل مقصد کیا تھا اور دنیا کے اسٹیج پر وہ اپنے آپ کو کس روپ میں ظاہر کرتے رہے۔ موجودہ صورت حال وقتی صورت حال ہے، وہ ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ ضرور ہے کہ فریب کاری کا پردہ پھٹے اور اصل واقعہ اپنی حقیقی صورت میں لوگوں کے سامنے آجائے۔

الرسالہ مئی ۱۹۹۰

تعمیری لاوا

زمین کے اوپر جس طرح ندیاں بہتی ہیں، اسی طرح زمین کے اندر لاوا (Lava) بہتا ہے۔ لاوا پگھلی ہوئی چٹانیں ہیں۔ ان کا درجہ حرارت ایک ہزار ڈگری یا اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لاوا اپنی نالیوں (Lava tubes) کے راستہ سے بہتا ہوا کبھی کبھی زمین کے اوپر آجاتا ہے۔ اس وقت ہم کہتے ہیں کہ فلاں مقام پر جوالامکھی پھٹ پڑا۔

انسانی آبادیوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ مثلاً ۹۰-۱۹۸۹ میں کشمیر میں گولی اور بم کا ایک طوفان جاری ہوگیا۔ یہ بھی ایک انسانی لاوا تھا۔ کشمیر کے لوگ ۱۹۴۷ کے بعد سے احساس محرومی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں ان کے اندر شکایتوں کا لاوا پک رہا تھا جو آخر کار پھٹ پڑا۔

یہ تخریبی لاوا کی مثال تھی۔ اسی طرح ایک اور لاوا ہے جس کو "تعمیری لاوا" کہہ سکتے ہیں۔ پہلا لاوا تخریب کی نفسیات سے ابھرتا ہے اور دوسرا لاوا تعمیر کی نفسیات سے۔

ایک قوم کے اندر تعمیر ذہن کی تحریک چلائی جائے۔ اس کے اندر ایمان کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ اس کے افراد میں اخلاق و کردار پیدا کیا جائے۔ اس کو ایک ایسی قوم بنایا جائے جس کے افراد باشعور افراد ہوں۔ یہ کام اگرچہ بظاہر ایک خاموش اور دیر طلب کام ہے، مگر وہ لاوا بننے کے عمل سے کم نہیں۔ جب وہ اپنی آخری حد پر پہونچتا ہے تو وہ تعمیری لاوا بن کر پھوٹ پڑتا ہے۔ وہ پورے ماحول میں نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

تخریبی لاوا اور تعمیری لاوا دونوں کے نمونے دنیا میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ تخریبی لاوا کی ایک مثال بم ہے اور تعمیری لاوا کی ایک مثال درخت۔

بم پھٹتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف تکلیف دہ شور بکھیرتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا میں ہر چیز کو برباد کر دیتا ہے۔ بم کا پھٹنا تخریبی لاوا کا پھٹنا ہے۔ جتنا بڑا بم اتنی ہی زیادہ بربادی اور تخریب کاری۔

اس کے بعد درخت کی مثال دیکھئے۔ درخت کا لاوا اس کے بیج کے اندر ہوتا ہے۔ درخت کا ایک بیج جب زمین میں ڈالا جاتا ہے تو وہ بھی پھٹتا ہے۔ مگر بیج کے پھٹنے سے کوئی شور برپا

نہیں ہوتا۔ بیج کا پھٹنا مکمل طور پر ایک خاموش انفجار ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ بیج جب پھٹتا ہے تو وہ اپنے اندر سے بربادی نہیں نکالتا بلکہ آبادی نکالتا ہے۔ بیج کا پھٹنا ایک سرسبز و شاداب درخت کا ظہور میں آنا ہے جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جس کے نیچے لوگوں کو سایہ ملے۔ جس سے پھول کی خوشبو اور پھل کی خوراک حاصل ہو۔

عام انسانی تحریکیں تخریبی انفجار کے ہم معنی ہیں۔ یہ تحریکیں جب پھٹتی ہیں تو لوگوں کو گولی اور بم کا شور سننا پڑتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ تباہی اور بربادی کے واقعات لے آتی ہیں۔ پوری انسانی آبادی ان کے نتائج کو دیکھ کر چیخ اٹھتی ہے۔

مگر ایک سچی اسلامی تحریک کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ سچی اسلامی تحریک درخت کے بیج کی مانند ہے۔ اس کا انفجار خاموش انفجار ہوتا ہے۔ سچی اسلامی تحریک سے جو افراد تیار ہوتے ہیں، ان میں کا ہر شخص خدا کا شاداب درخت ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسانی گروہ کا پھٹنا خدا کی زمین میں ایک لہلہاتا ہوا باغ وجود میں لانا ہے۔

ایسے لوگ انسانوں کے لیے سراپا رحمت بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ سہتے ہیں تاکہ دوسروں کو نہ سہنا پڑے۔ وہ جاگتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ سوئیں۔ وہ اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ پائیں۔ وہ جھک جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو کھڑا ہونے کا موقع ملے۔ وہ کم پر راضی ہو جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو زیادہ ملے۔ وہ موت کو قبول کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو زندگی حاصل ہو۔ وہ اپنے سینہ کو غم کا قبرستان بناتے ہیں تاکہ دوسروں کے گھروں میں خوشیوں کی بہار آسکے۔

تاریخ میں تخریبی لاوا پھٹنے کی بے شمار مثالیں ہیں، ماضی میں بھی اور حال میں بھی۔ مگر تعمیری لاوا پھٹنے کی کامل مثال معلوم تاریخ میں صرف ایک ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی مثال ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں صحابہ کرام کا اٹھنا اسی قسم کے ایک تعمیری لاوے کا پھٹنا تھا جس کو قرآن میں خیر امت کا اخراج (آل عمران ۱۱۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانوں کے درمیان جب تخریبی لاوا پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تخریب بکھیرتا ہے۔ مگر تعمیری لاوا جب پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تعمیر کا چمن اگا دیتا ہے۔ صحابہ کرام کی صورت میں تعمیر کا جو لاوا پھٹا اس نے ساری دنیا کو اسی قسم کے تعمیری نتائج سے بھر دیا۔

واحد حل

دہلی کے روزنامہ قومی آواز (۲ جنوری ۱۹۹۰) میں ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے "مسلم بارات میں چاقو چل گیا"۔ اخبار کی رپورٹ کے مطابق خبر حسب ذیل ہے:

"۳۱ دسمبر ۱۹۸۹ کی شام کو جامع مسجد کے علاقہ میں ایک شادی کی تقریب کے دوران پرانی دشمنی کی وجہ سے چاقو چل گیے۔ گلی شاہ تارا کے ناصر، محمد اقبال اور ان کے ایک ساتھی نے مبینہ طور پر محمد اسلم اور محمد میاں کو چاقو مار کر زخمی کر دیا۔ دونوں زخمی جے پرکاش اسپتال میں داخل ہیں، جب کہ تینوں ملزم فرار ہو گیے۔ بتایا جاتا ہے کہ ذاکر حسین کالج کے زمانہ طالب علمی میں اسلم نے کبھی ناصر کی پٹائی کر دی تھی۔ تب سے دونوں میں رنجش چلی آرہی تھی۔ آج بارات میں ان دونوں کے دوست عادل نے ان کو اپنی شادی پر مدعو کیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ تقریب کے دوران دونوں میں کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ اس کے نتیجہ میں ناصر اور اقبال غصہ ہو گیے اور اسلم اور محمد میاں کو چاقو مار کر بھاگ گیے۔ جامع مسجد کی پولیس نے اقدام قتل کا کیس درج کر لیا ہے، تاہم ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی گرفتاری نہیں ہو سکی ہے"

دو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی سے اس ہندو مسلم واقعہ کو سمجھا جا سکتا ہے جو زیادہ بڑے پیمانہ پر ملک میں جاری ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندوؤں کو یہ شکایت ہوئی کہ مسلمانوں نے ان کی "بھارت ماتا" کے دو ٹکڑے کروا دیے۔ مزید یہ کہ لیڈروں کی حماقت کے نتیجہ میں اس موقع پر دونوں فرقوں میں زبردست مارکاٹ ہوئی۔ ماضی کی یہ تلخ یاد ہندو کے ذہن میں باقی ہے۔ عام حالات میں وہ زندگی کے مسائل کے نیچے دبی رہتی ہے۔ مگر جب کبھی ہندو اور مسلمان کے درمیان کسی بات پر تکرار ہو جاتی ہے تو ماضی کی تمام یادیں از سرِ نو جاگ اٹھتی ہیں۔ اب ہندو اپنے انتقامی جذبات کو لے کر مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑتا ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے عقلمندی یہ ہے کہ وہ "تکرار" کے مواقع کو نہ آنے دیں۔ وہ اعراض کی پالیسی پر عمل کر کے سوئے ہوئے جذبات کو سویا رہنے دیں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا دوسرا کوئی حل نہیں۔

دکان داری

دکاندار وہ ہے جو دکاندار بننے کے ساتھ گاہک بھی بن جائے۔ جو صرف بیچنے والا نہ ہو، بلکہ اسی کے ساتھ وہ خریدنے والا بھی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بھی جانے اور اسی کے ساتھ اپنی دکان پر آنے والے متوقع خریدار کو بھی۔

دکاندار اور گاہک دونوں بالکل الگ الگ نوعیت کے انسان ہیں۔ دکاندار کا ذہن پیسہ کے رخ پر چلتا ہے، اور گاہک کا ذہن سامان کے رخ پر۔ دکاندار کی نظر گاہک کی جیب پر ہوتی ہے، اور گاہک کی نظر دکان دار کے سامان پر۔ مگر جو دکاندار صرف اتنا ہی جانتا ہو کہ اس کو گاہک کی جیب سے پیسہ نکالنا ہے، وہ کبھی بڑا دکان دار نہیں بن سکتا۔

کامیاب دکاندار وہ ہے جو گاہک کو ایک کتاب کی طرح پڑھے۔ جو گاہک کی ضرورت کو اپنی ضرورت بنائے۔ جو گاہک کے دل کی دھڑکن کو اپنے سینہ میں محسوس کرنے لگے۔ جو یہ جانے کہ گاہک اس سے کیا چاہتا ہے۔ جو یہ جانے کہ گاہک خود اپنی چاہت کے اعتبار سے کس چیز سے مطمئن ہوگا۔

ایک دکاندار وہ ہے جو سڑک پر دکان کھول کر بیٹھ جائے۔ کوئی گاہک آئے تو نرخ نامہ دیکھ کر اس کو دام بتا دے۔ گاہک اگر سامان طلب کرے تو سامان دیدے، اور اگر وہ سامان دیکھ کر رکھ دے تو دکاندار دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ یا اطمینان کے ساتھ اخبار پڑھنے لگے۔

دوسرا دکاندار وہ ہے جس کا جسم دکان میں ہو مگر اس کا دماغ سڑکوں اور بازاروں میں گھوم رہا ہو۔ ذہنی اعتبار سے وہ گاہک کے درمیان چلنے پھرنے لگے۔ گاہک کے بتانے سے پہلے وہ گاہک کی ضرورت اور اس کی طلب کو جانتا ہو۔ وہ گاہک کو یک طرفہ طور پر خوش کرنے کی کوشش کرے، خواہ گاہک نے اپنی کسی بات سے اس کو ناراض کر دیا ہو۔ وہ آخری حد تک گاہک کا ہمدرد بن جائے، خواہ گاہک اس کے یہاں پہلی بار آیا ہو، اور یہ بھی اندیشہ ہو کہ وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔

الرسالہ مئی ۱۹۹۰

یہ انسان

پھول کی ایک پنکھڑی یا چڑیا کا ایک چھوٹا پر کتنی حسین چیزیں ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بے حد نازک ہیں۔ ان کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش بھی ان کی حسین ترکیب کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا خالق بے حد لطیف ذوق والی ہستی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آدمی اس کے تخلیقی حسن کو دیکھے مگر وہ اس کو ہاتھ نہ لگائے۔ وہ اس سے اپنی روح کی غذا لے مگر اپنے جسم کی کثافت سے اس کو آلودہ نہ کرے۔

خدا کی دنیا میں ایک چیز ایسی ہے جو چڑیا کے پر اور پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک ہے۔ یہ انسان کا دل ہے۔ ہماری معلوم دنیا میں انسان کے دل سے زیادہ نرم و نازک کوئی چیز نہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص کسی انسان کے دل کو دکھاتا ہے وہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم کرتا ہے۔ کسی آرٹسٹ کے نازک ترین آرٹ کو جو شخص اپنے پیروں سے مسل دے وہ اس آرٹسٹ کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ وہ شخص اللہ کی نظر میں مجرم ہے جو ایک نازک دل کو مسلتا ہے۔ جو ایک انسان کے سکون پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ جو ایک انسان کے آشیانہ کو اجاڑنے کے منصوبے بناتا ہے۔

اس معاملہ میں وہ لوگ اس سے کم مجرم نہیں ہیں جو یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر وہ "گونگے شیطان" بنے رہتے ہیں۔ وہ ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے نہیں اٹھتے۔ وہ اپنی ممکن کوشش اس کو دفع کرنے میں نہیں لگاتے۔ پھر اس سے بھی زیادہ بڑے مجرم وہ لوگ ہیں جو ملت کو مظلومی سے نکالنے کے نام پر قیادت کرتے ہیں مگر جب ملت کا ایک مظلوم فرد ان کے سامنے آتا ہے تو اس کو مظلومی سے نکالنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ وہ تقریر میں کہتے ہیں کہ ملت کا یہ حال ہونا چاہیے کہ جب ایک ستم زدہ شخص وامعتصماہ پکارے تو ملت اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے اور اس وقت تک کسی کو چین نہ آئے جب تک اس شخص کو ظلم سے نجات حاصل نہ ہو جائے۔ مگر جب ایک ستم زدہ انسان وامعتصماہ کی آواز بلند کرتا ہے تو اس کی آواز پر دوڑنے کا کوئی جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

امتحان کا پرچہ

آج کل یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص پیسہ کما کر اپنے لیے ایک شاندار مکان بنائے گا، اور اس کے بعد اس کے اوپر لکھ دے گا: ھذا من فضل ربی (یہ میرے رب کا فضل ہے) بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ میرے خدا کا انعام ہے۔ خدا نے مکان کی صورت میں مجھے اپنی نعمت عطا فرمائی ہے۔ مگر موجودہ شکل میں اس کا یہ مطلب درست نہیں۔

قرآن کی یہ آیت سورہ النمل میں آئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جب ملکہ سبا حاضر ہوئی تو آپ نے اپنے مسخر جناتوں کے ذریعہ اس کا تخت یمن (مارب) سے فلسطین (یروشلم) منگایا۔ قرآن کے بیان کے مطابق، یہ واقعہ پلک جھپکنے کے درمیان ہوا۔ ڈیڑھ ہزار میل دور رکھا ہوا تخت ایک سکنڈ میں حضرت سلیمان ؑ کے پاس پہونچ گیا۔

حضرت سلیمان ؑ نے جب یہ غیر معمولی واقعہ دیکھا تو ان کی زبان سے نکلا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری (ھذا من فضل ربی، لیبلونی ءاشکر ام اکفر)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے پورے قول کو سامنے رکھئے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس "فضل" کو انھوں نے اصلاً آزمائش کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ ان کے نزدیک خدا کا یہ خصوصی معاملہ اس لیے کیا گیا کہ اس کے ذریعہ ان کو آزمائش میں ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ وہ اس پر شکر کے جذبہ سے جھک جاتے ہیں، یا فخر کے جذبہ کے تحت اس کے برعکس رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا انعام، اپنے حقیقی معنوں میں، اہل ایمان کو آخرت میں ملنے والا ہے۔ دنیا میں کسی انسان کو جو کچھ دیا جاتا ہے، وہ دراصل امتحان کا پرچہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد جانچنا ہوتا ہے نہ کہ نوازش کرنا —— اس اعتبار سے اس دنیا کے آرام کی حقیقت بھی وہی ہے جو اس دنیا کی تکلیف کی حقیقت ہے۔ دونوں ہی آدمی کے لیے آزمائش کے پرچے ہیں۔ آرام میں شکر مطلوب ہے اور تکلیف میں صبر۔ دنیا میں خدا کا اصلی انعام یہ ہے کہ وہ آدمی کو یہ توفیق دے کہ وہ آرام میں شکر کا ثبوت دے سکے اور تکلیف میں صبر کا ثبوت۔

آسان حل

الطاف حسین حالی پانی پتی (۱۹۱۴ - ۱۸۳۷) ایک انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔ انھوں نے اردو ادب میں اصلاح کی تحریک چلائی۔ انھوں نے قدیم اردو شاعری پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری مبالغہ اور عشق و عاشق اور فرضی خیال آرائی کا مجموعہ ہے۔ اس کے بجائے اس کو بامقصد شاعری ہونا چاہیے۔ اس کا ایک نمونہ انھوں نے خود "مسدس" کی صورت میں پیش کیا۔

حالی کی یہ تنقید ان لوگوں کو بہت بری لگی جو اردو شاعری پر ناز کرتے تھے اور اس کو اپنے لیے فخر بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ حالی کے خلاف نہایت نازیبا قسم کے مضامین شائع ہونا شروع ہوئے۔ لکھنؤ کا اخبار "اودھ پنچ" اکثر نہایت برے انداز میں ان کے خلاف لکھتا اور اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کرتا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے　　میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی نے ان بے ہودہ مخالفتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ آخرکار چند سال کے بعد وہ لوگ تھک کر چپ ہو گیے۔ کسی نے حالی سے سوال کیا کہ آپ کے مخالفین کیسے خاموش ہو گیے۔ اس کے جواب میں حالی نے کسی کا نام لیے بغیر یہ شعر کہا:

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ　　سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

جھوٹی مخالفتوں کا سب سے زیادہ آسان اور کارگر جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ جھوٹی مخالفت ہمیشہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ اس کے لیے مقدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ ڈھ پڑے۔ ایسی مخالفت کا جواب دینا گویا اس کی مدتِ عمر میں اضافہ کرنا ہے۔ اگر آدمی صبر کرلے تو بے جڑ درخت کی طرح ایک روز وہ اپنے آپ گر پڑے گی۔ وہ کبھی دیر تک خدا کی زمین پر قائم نہیں رہ سکتی۔

جھوٹ کا سب سے بڑا قاتل وقت ہے۔ آپ آنے والے وقت کا انتظار کیجیے۔ اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وقت نے اس فتنہ کو زیادہ کامل طور پر ہلاک کر دیا ہے جس کو آپ صرف ناقص طور پر ہلاک کرنے کی تدبیر کر رہے تھے۔

درجات کی بلندی

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ قیامت آنے سے پہلے یہ آزادی ختم ہونے والی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا میں جس طرح حق اور انصاف کے نمونے ہیں، اسی طرح یہاں ظلم اور زیادتی کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔

یہ ایک ابدی مسئلہ ہے۔ یہ انسانِ اول (آدم) کے زمانہ میں ہابیل اور قابیل کی نزاع کی صورت میں شروع ہوا اور قیامت کے ظہور تک جاری رہے گا۔ ایسی حالت میں ظلم و زیادتی کے مسائل کا حل کیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات میں رہنمائی دی ہے، اسی طرح آپ نے زندگی کے اس نازک معاملہ میں بھی رہنمائی دی ہے۔ وہ رہنمائی یہ ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، الا اخبرکم بعمل یرفع اللہ بہ الدرجات۔ قالوا بلی یارسول اللہ۔ قال: تحلم علی من یجھل علیک، وتعفو عمن ظلمک وتعطی من حرمک وتصل من قطعک۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تم کو ایسا عمل نہ بتاؤں جس کے ذریعہ اللہ درجات کو بلند کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا۔ جو شخص تم سے جہالت کرے تم اس سے درگزر کرو۔ جو شخص تمہارے ساتھ ظلم کرے تم اس کو معاف کردو۔ جو شخص تم کو نہ دے تم اسے دو۔ جو شخص تم سے کٹے تم اس سے جڑو۔

اس حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے۔ اس کے مطابق، درجات کی بلندی کا راز یہ ہے کہ آدمی جوابی اخلاق سے مکمل پرہیز کرے۔ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود درگزر کا طریقہ اختیار کرے۔ لوگ ظلم کریں تب بھی وہ انھیں معاف کردے۔ لوگ محروم کرنے کی سازشیں کریں پھر بھی وہ ان کو دینے کا سلسلہ بند نہ کرے۔ لوگ دوری اختیار کریں تب بھی وہ ان سے قریب ہونے کی کوشش جاری رکھے۔

یہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ جو لوگ اس طریقہ پر چلیں وہ آپ کے مومن ہیں۔ جو لوگ اس طریقہ کو چھوڑ دیں، حتی کہ اپنے زبان و قلم سے اس کی تردید کریں، وہ بلاشبہ آپ کے منکر ہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو مومن کامل سمجھتے ہوں۔

تاریخ کا فیصلہ

اسپین میں مسلمانوں کی حکومت سات سو سال (۱۴۹۲-۷۵۶ء) تک جاری رہی۔ یہ حکومت طارق بن زیاد نے عیسائی حکمراں کو شکست دے کر قائم کی تھی۔ آخری مرحلہ میں یہ حکومت سمٹ کر صرف غرناطہ میں باقی رہ گئی تھی۔ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سات سو سالہ مدت میں عیسائیوں نے مسلم سلطنت پر کوئی باقاعدہ حملہ کیا ہو۔ پھر یہ طاقت ور سلطنت کیسے ختم ہوگئی۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔

سب سے پہلے بغداد کے عباسی خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے ۱۴۶ھ میں عباسی فوج نے سمندر پار کرکے مسلم اسپین پر حملہ کیا۔ وقتی طور پر سلطنت کا ایک حصہ اس وقت کے اسپینی حکمراں عبدالرحمن اول کے قبضہ سے نکل گیا۔ عبدالرحمن اول نے چند ماہ بعد ہی اپنی سلطنت کو دوبارہ لڑکر عباسیوں سے واپس لے لیا۔ مگر باہمی لڑائیوں کا یہ سلسلہ پھر کبھی بند نہ ہو سکا۔ صوبائی حاکموں کی طرف سے بغاوت اور باہم ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس دوران بعض عیسائی حکمرانوں نے بھی مسلم حکومتوں کی سرحدوں پر حملے کیے، مگر وہ خود مسلمانوں کے تعاون اور ان کی شہ پر ہوتے تھے۔ آخر کار اسپین کی مسلم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ ہر سردار جو کسی شہر یا صوبہ کا حاکم ہوتا وہ بغاوت کرکے اپنی الگ سلطنت قائم کر لیتا۔ پھر یہ خود مختار ریاستیں چوں کہ اپنی سرحدوں کو مزید بڑھانے کی فکر میں رہتی تھیں۔ اس لیے ان کے درمیان مستقل طور پر باہمی نزاع اور جنگ جاری رہتی تھی۔

ان باہمی لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کی مسلم سلطنت گھٹتے گھٹتے اسپین کے صرف ایک چھوٹے حصہ میں باقی رہ گئی جس کو تاریخ میں سلطنت غرناطہ کہا جاتا ہے۔ اس سلطنت کا حکمراں ابوعبداللہ آخری مرحلہ میں اتنا کمزور ہوگیا کہ مجبور ہوکر اس نے اپنے قلعہ کی کنجیاں ۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو شاہ کسلی فرڈیننڈ (Ferdinand II) کے حوالہ کر دیں، اور بقیہ ایام مراکش میں گزار کر وہیں مرگیا۔

یہی بعد کے زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی کہانی ہے۔ ہر جگہ مسلمان صرف اپنے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں برباد ہوتے ہیں، اگرچہ وہ بطور خود دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔

تباہی کی طرف

اینڈری سخاروف (Andrie Sakharov) روس کے ایک ممتاز سائنس داں تھے۔ وہ ۲۱ مئی ۱۹۲۱ کو پیدا ہوئے اور ۱۵ دسمبر ۱۹۸۹ کو انتقال کر گیے۔ انھوں نے مسلسل محنت کے ذریعہ روس کا پہلا ہائیڈروجن بم تیار کیا جس کا اکتوبر ۱۹۵۳ میں کامیاب تجربہ کیا گیا۔ ۱۹۷۵ میں ان کو نوبیل انعام دیا گیا۔ انھوں نے ہائیڈروجن بم بنا کر امریکہ کے مقابلہ میں روس کو ہتھیار میں برابری عطا کی۔ چنانچہ وہ روس کے نیشنل ہیرو بن گیے۔ مگر اس کے بعد انسانی بنیاد پر وہ بم سازی کے خلاف ہو گیے۔ اس کے نتیجہ میں تمام اعزازات سے محروم کر کے انھیں گرفتار کر لیا گیا اور ان کو ماسکو سے ۴۰۰ کیلومیٹر دور گورکی میں نظر بند کر دیا گیا:

He secured the Soviets strategic parity with the Americans by developing the hydrogen bomb but suffered internal exile for championing human rights.

موجودہ روسی وزیر اعظم میکائیل گورباچوف نے دسمبر ۱۹۸۶ میں اینڈری سخاروف کو آزاد کر دیا تھا۔ تاہم وہ روس میں مکمل شہری آزادی لانے کے نام پر مسٹر گورباچوف کے بھی مخالف بنے رہے۔ وہ اپنے آپ کو فری تھنکر کہتے تھے۔ ان کی موت اچانک حرکت قلب بند ہونے سے واقع ہوئی۔ موت سے صرف چند گھنٹے پہلے انھوں نے ماسکو میں اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ مسٹر گورباچوف کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے:

Only hours before his death, he told fellow opposition members of the Congress that the Communist party leadership, headed by Mr Gorbachov, was leading the country to catastrophe.

اینڈری سخاروف کی مثال تمام انسانوں کی مثال ہے۔ انسان خود موت کی عظیم تر تباہی کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ مگر وہ دوسروں کو ان کی تباہی کی خبر دے رہا ہے۔ وہ محاسبۂ خداوندی کی میزان میں تولا جانے والا ہے۔ مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے کے عنوان پر تقریریں کر رہا ہے۔

کیسا عجیب ہے یہ انسان جس کو صرف دوسروں کی خبر ہے، خود اپنی ذات کی اس کو خبر نہیں۔

قابل غور

اسلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ ہولناک واقعہ وہ ہے جس کو "تاتاری حملہ" کہا جاتا ہے۔ منگولی قبائل تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم دنیا پر ٹوٹ پڑے اور سمرقند سے لے کر عراق تک ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ ۱۲۵۸ء میں وہ ہلاکو کی سرداری میں بغداد میں داخل ہوئے۔ انھوں نے شہر کو ڈھا دیا اور تقریباً ۸ لاکھ آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ آخری عباسی خلیفہ المعتصم کو ذلت کے ساتھ قتل کر دیا۔ اس وقت ایک مسلمان عالم الحافظ ابن سید الناس زندہ تھے۔ کچھ لوگ ان کے پاس گئے اور کہا کہ مسلمانوں کی بربادی اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔ اس کے باوجود اللہ کی رحمت و نصرت نازل نہیں ہو رہی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ بزرگ نے جواب دیا:

أنتم تستبطئون الرحم وإني أستبطئ الرجم۔ — تم سمجھتے ہو کہ رحمت اترنے میں دیر ہو رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آسمان سے پتھر برسنے میں دیر ہو رہی ہے۔

صحیح بخاری میں زبیر بن عدی سے روایت آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت انس بن مالک کے پاس گئے اور حجاج کے ظلم کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا کہ صبر کرو۔ کیوں کہ اب تمہارے اوپر جو بھی زمانہ آئے گا وہ پہلے سے زیادہ برا ہوگا۔ یہاں تک کہ تم اپنے رب سے مل جاؤ۔ ایسا ہی میں نے تمہارے نبی سے سنا ہے (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۸۳)

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھئے تو آج کا زمانہ مسلمانوں کے زوال کے اعتبار سے پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ برا ہے۔ آج مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کا داخلی بگاڑ ہے نہ کہ دوسری قوموں کا ظلم۔ یہ حقیقت آج ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ آپ جس مسلمان سے بات کیجئے، وہ مسلمانوں کی برائی کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ وہ کہے گا کہ مسلمان اپنے دینی اور اخلاقی زوال کی انتہا پر ہیں۔ مگر جب ہندو اور مسلمان کی بات ہو تو وہی مسلمان فوراً ایک طرفہ طور پر ہندو کی برائی کرنے لگے گا۔ اب اچانک مسلمان "خیر امت" بن جائیں گے اور ہندو "کفار لا اعتبار" کا درجہ اختیار کر لیں گے۔

یہ عصبیت جاہلیہ ہے۔ اس کا نام قوم پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

سماجی برائی

سگرٹ کو موجودہ زمانہ میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ مگر سائنسی تحقیقات بتاتی ہیں کہ سگرٹ پینا زبردست نقصان کا باعث ہے۔ مغربی ماہرین نے تجربات کے بعد بتایا ہے کہ سگرٹ پینے سے ایک آدمی کی زندگی کے ۲۲۵۰ دن کم ہوجاتے ہیں۔ سگرٹ نہ پینے والوں کے مقابلہ میں سگرٹ پینے والے دس گنا زیادہ دل کے مریض ہوتے ہیں۔ سگرٹ پینے والے کثرت سے اچانک موت کا شکار ہوتے ہوئے پائے گیے ہیں، وغیرہ۔

سگرٹ پینے کے نقصانات اب ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکے ہیں۔ پچھلے پچاس سال سے مختلف صورتوں میں یہ الفاظ لوگوں کے دماغ میں ڈالے جاتے رہے ہیں کہ تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے۔ مگر تازہ تحقیقات نے اس معاملہ میں انقلابی تبدیلی کی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ صرف تمباکو پینا خطرناک نہیں ہے، بلکہ تمباکو پینے والے سماج میں رہنا بھی خطرناک ہے۔ چنانچہ اب ایک نئی اصطلاح وضع ہوئی ہے جس کو منفعل تمباکو نوشی (passive smoking) کہا جاتا ہے۔ تمباکو پینے والا جو دھواں نکالتا ہے۔ وہ اس کے منہ سے نکل کر ہوا میں شامل ہوجاتا ہے۔ اس آلودہ ہوا میں لوگ سانس لیتے ہیں۔ اس طرح ہر آدمی تک اس کا ایک حصہ پہونچتا رہتا ہے۔

تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ فعال تمباکو نوشی (active smoking) کے جو نقصانات ہیں، وہی تمام نقصانات منفعل تمباکو نوشی کے بھی ہیں۔ مثلاً دہلی میں رہنے والا ہر آدمی خواہ وہ براہ راست سگرٹ نہ پیتا ہو، مگر بالواسطہ انداز میں وہ روزانہ ۱۰ سے ۲۰ سگرٹ تک پی رہا ہے۔ اس طرح اس کی صحت کے لیے بھی انھیں خطرات کا اندیشہ ہے جو باضابطہ سگرٹ پینے والے کے لیے ہے۔ سگرٹ کے خلاف مہم چلانے والوں کا نعرہ پہلے یہ تھا کہ "تمہاری تمباکو نوشی تمہاری صحت کے لیے مضر ہے۔" مگر اب انھوں نے نیا نعرہ وضع کیا ہے ——— تمہاری تمباکو نوشی میری صحت کے لیے مضر ہے:

Your smoking is injurious to my health.

اگر آپ برائی سے پاک رہنا چاہتے ہیں تو پورے سماج کو برائی سے پاک کرنے کی کوشش کیجیے۔ سماج اگر برائی میں مبتلا ہو تو فرد بھی اپنے آپ کو اس برائی کے اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

قیادت کا مسئلہ

وائیلٹ گراف (Violette Graff) ایک فرانسیسی خاتون ہیں جو ہندستان کی مذہبی اقلیتوں کی ماہر (specialist) سمجھی جاتی ہیں۔ مسٹر وجے نراونی (Naravne) نے پیرس میں ان کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا ۲۴ نومبر ۱۹۸۹ میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے :

Religious pluralism is India's wealth

گفتگو کے دوران ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم اقلیت کے مسائل کا ذکر آیا۔ انٹرویو نے پوچھا کہ کیا آپ اس سے اتفاق کریں گی کہ ہندستان کی مسلم اقلیت اس لیے نقصان اٹھا رہی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک جاندار قیادت (viable leadership) پیدا نہ کر سکی۔

خاتون نے جواب دیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے درمیان ایک جاندار اور فعال قیادت کا ابھرنا موجودہ حالات میں سخت مشکل ہے۔ کیوں کہ ایک اعتبار سے وہ خطرناک ہے، اور دوسرے اعتبار سے ناقابل عمل۔ جناح کے انداز کا کوئی واحد لیڈر اگر مسلمانوں میں ابھرے تو حکومت فوراً اس کو علٰحدگی پسند (separatist) قرار دیدے گی۔ اس کو "نیا جناح" کہا جانے لگے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ حکومت سے قریب ہو اور مفاہمتی انداز کی بات کرے تو وہ مسلمانوں کی نظر میں شومین (showman) قرار پائے گا۔ وہ اس کو حکومت (یا ہندو) کا ایجنٹ کہہ کر رد کر دیں گے۔

یہ ایک نہایت پیچیدہ صورت حال ہے جس سے ہندستان کے موجودہ مسلمان دوچار ہیں۔ اور بلاشبہ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ابھی تک مسلمانوں کے درمیان کوئی طاقت ور قیادت پیدا نہ ہو سکی۔ کیوں کہ "جناح" کے انداز کی قیادت حکومت کی نظر میں غیر معتبر بن جاتی ہے اور "سرسید" کے انداز کی قیادت مسلمانوں کی نگاہ میں غیر معتبر قرار پاتی ہے۔ جو چیز ممکن ہے وہ مفید نہیں، جو چیز مفید ہے وہ ممکن نہیں۔

مسلمان حکومت کی (یا اکثریتی طبقہ کی) سوچ کو بدل نہیں سکتے۔ انھیں چاہیے کہ وہ خود اپنی سوچ کو بدل لیں تاکہ ان کے اندر طاقت ور قیادت ابھرے اور تعمیر ملت کا وہ کام انجام پا سکے جو نصف صدی سے رکا ہوا پڑا ہے۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

امت کا بگاڑ

حضرت علیؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت مختلف الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں جب امت مسلمہ کے اندر بگاڑ آئے گا تو اس کے افراد میں دس قسم کی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کی بات مانے گا اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا۔ وہ اپنے دوست سے قریب ہوگا اور باپ سے دور ہو جائے گا (اطاع الرجل امرأته وعق امه وادنی صدیقه واقصیٰ اباه، الترمذی)

بیوی کسی آدمی کے لیے دل چسپیوں کا مرکز ہوتی ہے جب کہ ماں کا وجود ذمہ داریوں کی علامت ہے۔ اسی طرح باپ کے ساتھ فرماں برداری کا تصور وابستہ ہوتا ہے اور دوست کے ساتھ تفریح کا۔ آدمی کا ماں باپ کو چھوڑ دینا اور اپنی بیوی اور اپنے دوستوں سے قریب ہونا دراصل بڑھی ہوئی دنیا پرستی کا نتیجہ ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے دل چسپی یا اپنے دوستوں سے رغبت بجائے خود فطری چیزیں ہیں۔ مگر جب آدمی کا مزاج آخرت پسندانہ ہو تو ان چیزوں کو وہ ضرورت کے دائرہ میں محدود رکھتا ہے، وہ اپنے جی کے میلان پر پابندی قائم رکھتے ہوئے والدین کے بارہ میں اپنی شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرتا رہتا ہے۔ مگر جب آخرت کے عقیدہ پر دنیا پرستی کا رجحان غالب آجاتا ہے تو صورت حال بدل جاتی ہے۔ اب آدمی ہمہ تن اپنے دوستوں اور اپنے بیوی بچوں کی طرف جھک جاتا ہے اور ماں باپ سے عملاً بے تعلق ہو جاتا ہے، اور اگر تعلق رکھتا بھی ہے تو محض زبان اور الفاظ کا۔ اس کا بہترین مشغلہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے درمیان خوش وقتی کے لمحات گزارے۔ اس کے لطف ولذت کے اوقات وہ ہوتے ہیں جب کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے درمیان ہو اور ان سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر رہا ہو۔ اس کا وقت، اس کا پیسہ، اس کے جذبات۔ اس کا پورا وجود اپنے بیوی بچوں کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کے لیے اس کے پاس رسمی باتوں کے سوا کچھ اور نہیں رہتا۔

قوم پر ایسا وقت آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افراد پابندی کے بجائے بے فکری کو پسند کرنے لگے ہیں۔ ان کو ذمہ دارانہ زندگی کے مقابلہ میں بے قید زندگی زیادہ محبوب ہو گئی ہے افراد کا یہی مزاج قوم کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اسلوب دعوت کا مسئلہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے تقریباً تیرہ سال مکہ میں گزارے ۔ یہ آپ کی زندگی کا خالص دعوتی مرحلہ تھا ۔ اس ابتدائی مرحلہ کی تفصیل بتاتے ہوئے ابن اسحاق کہتے ہیں :

فلما بادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ بالاسلام وصدع بہ کما امرہ اللہ لم یبعد منہ قومہ ولم یردوا علیہ ، حتی ذکر آلھتھم وعابھا۔ فلما فعل ذلك أعظموہ وناکروہ و اجمعوا خلافہ وعداوتہ

(سیرۃ ابن ہشام ، الجزء الاول ، صفحہ ۲۷۵ - ۲۷۶)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کھلم کھلا اس کا اعلان فرمایا جیسا کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا تھا ، تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ آپ کا رد کیا ۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگایا ۔ تو جب آپ نے ایسا کیا تو انھوں نے آپ کو اہمیت دی اور اس کا انکار کیا اور آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گیے ۔

اس بیان میں " عیب " سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل تنقید کہا جاتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی (تین سال) تک سادہ اور غیر تنقیدی انداز میں قریش کے سامنے اپنی بات رکھی ۔ اس کے بعد آپ نے تنقیدی انداز اختیار فرمایا ۔ ابتدائی مرحلہ میں آپ کے مخاطبین نے کوئی برہمی ظاہر نہیں کی ۔ مگر جب آپ نے ان کے معبودوں (بالفاظ دیگر اکابر قوم) پر تنقید کی تو وہ سخت برہم اور مشتعل ہو گیے ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر مستقل طور پر غیر تنقیدی انداز میں کلام کرتے رہتے اور قرآن میں بھی تنقیدی آیتیں نہ اترتیں تو عرب کے لوگ وہ مخالفت اور دشمنی اختیار نہ کرتے جو انھوں نے بعد کو اختیار کی ۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس قسم کی تمام مصلحتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے تنقیدی اسلوب پر قائم رہے ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر تنقیدی نوعیت کا روحانی اور اخلاقی انداز ذاتی مقبولیت یا عوامی بھیڑ جمع کرنے کے لیے تو بہت کار آمد ہے، مگر وہ اصل مقصد کے لیے کار آمد نہیں۔ غیر تنقیدی انداز لوگوں کو سننے میں بہت اچھا لگتا ہے، مگر وہ ذہنوں میں ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ اس سے وہ فکری انقلاب نہیں آتا، جب کہ آدمی کی سوچنے کی صلاحیت جاگتی ہے۔ اس پر ایک چیز کا غلط ہونا منکشف ہوتا ہے اور دوسری چیز کے صحیح ہونے کو وہ شعوری طور پر دریافت کرتا ہے۔ اسلام کو وہ افراد مطلوب ہیں جو انقلابی (کرائسکاری) ذہن رکھتے ہوں، اور تنقیدی انداز دعوت کے بغیر ایسے افراد کا بننا ہرگز ممکن نہیں۔

غیر تنقیدی اسلوب غیر فطری اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بھی صحیح ہے اور غلط بھی صحیح۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک غیر تنقیدی انداز میں چلائی جائے، اس سے مصنوعی شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ کبھی مطلوب اسلامی شخصیت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

رات کے وقت تالاب میں شبنم گرتی ہے۔ مگر اس سے تالاب کے پانی میں کوئی تموج پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اسی تالاب میں ایک بڑا پتھر پھینک دیجیے تو اس سے ٹھہرے ہوئے پانی میں زبردست تموج پیدا ہو جائے گا۔ اس مثال سے تنقیدی اور غیر تنقیدی اسلوب کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غیر تنقیدی اسلوب شبنم کی مانند ہے۔ اس سے آدمی کو ایک روحانی سکون تو ملتا ہے مگر اس سے اس کے سینہ میں اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔

مگر یہ مطلوب اسلامی شخصیت نہیں۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے (الایمان بین الرجاء والخوف) مومن کو ایک طرف امید ہوتی ہے کہ خدا رحیم وکریم ہے، وہ اس کو بخش دے گا۔ دوسری طرف اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ خدا عادل ہے، وہ اس سے حساب لے گا، اور جس کا حساب لیا گیا وہ ہلاک ہوا (من نوقش فقد هلك) اس بنا پر مومن ہمیشہ "کفنی کفنی" کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو ایک پر اضطراب شخصیت بنا دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام اصحاب رسول ہمیشہ اضطراب کی نفسیات میں رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی پرسکون شخصیت کا حامل نہ تھا۔

ایمان موجودہ دنیا میں درد ہے اور آخرت میں راحت۔

پیغمبر کا فیصلہ

بخاری اور مسلم نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے خطبہ دیا اور ہر وہ بات بیان کی جو آپ کے زمانہ سے لے کر قیامت تک ہونے والی تھی (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۸۰)

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں مستقبل کی باتیں نقل کی گئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک بات وہ ہے جو ابو داؤد نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

عَن ثوبانَ قال قال رَسُولُ اللهِ صَلى الله عليه وسلم يُوشِكُ الأُمَمُ ان تَداعىَ عليكم كما تَداعىَ الأَكَلَةُ الىٰ قَصْعَتِها۔ فقال قائلٌ: ومن قلةٍ نحن يومئذٍ۔ قال بل انتم يومئذٍ كثير۔ ولكنكم غثاءٌ كغثاءِ السَيل ولينزعنّ اللهُ من صدور عدوكم المهابةَ منكم وليقذفنّ في قلوبكم الوهن۔ قيل وما الوهنُ يا رَسولَ الله۔ قال حبُّ الدنيا وكراهيةُ الموت۔

(جامع الاصول، ۱۰ / ۲۸)

حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ قومیں تمہارے اوپر ٹوٹ پڑیں جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر ٹوٹتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا، کیا اس لیے کہ اس وقت ہم لوگ کم تعداد میں ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اس وقت تم لوگ بہت زیادہ ہوگے۔ مگر تم لوگ سیلاب کے جھاگ کی مانند ہوگے، اللہ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت نکال دے گا۔ اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا کر دے گا۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، کمزوری کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کی محبت، اور موت کو ناپسند کرنا۔

اس حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے اور امت مسلمہ کے موجودہ حالات کو دیکھئے۔ معلوم ہوگا کہ آج امت پر عین وہی زمانہ آگیا ہے جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ۱۴ سو سال پہلے

بشین گوئی فرمائی تھی۔ موجودہ مسلمان، خواہ وہ اقلیتی ملک میں ہوں یا اکثریتی ملک میں، ہر جگہ
ا دوسری قوموں کے استحصال اور زیادتی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ساری دنیا میں ایک ارب کی
ر معمولی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ حقیر اور مظلوم بنے ہوئے ہیں۔

اب دیکھئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آنے والے دور کے بارہ میں جو ارشاد
زمایا ہے وہ کیا ہے۔ اس حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کی قومیں
سلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گی اور ان کو اپنے ظلم اور استحصال کا نشانہ بنائیں گی۔ مگر اس خارجی
مسئلہ کا سبب تمام تر داخلی مسئلہ بتایا گیا ہے۔ اس میں کھلے لفظوں میں یہ نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ
ناموافق صورت حال اس لیے پیش آئے گی کہ مسلمان دنیا کی طلب میں پھنس جائیں گے
اور اپنے ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ دینی مقصد کے لیے قربانی کرنے کا جذبہ ان کے اندر باقی
نہیں رہے گا۔ گویا مسئلہ باہر سے پیدا ہوگا مگر اس کا سبب خود مسلمانوں کے اپنے اندر ہوگا۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ان الفاظ کو دیکھئے جو ان کے تمام
اصاغر و اکابر لکھنے اور بولنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی بولی بول
رہے ہیں۔ اور وہ ہے —— اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے کر ان کے
خلاف لامتناہی چیخ پکار جاری رکھنا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں اس معاملہ میں جو کچھ
کر رہے ہیں وہ سب کا سب الفاظ کے فرق کے ساتھ ایک ہی ہے، اور وہ دوسری قوموں
کی مذمت ہے۔ ان میں سے کوئی مؤامرہ کا لفظ بولتا ہے اور کوئی سازش کا اور کوئی (conspiracy) کا۔
مگر سب کے کلام کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دوسری قومیں ہمارے خلاف
سازشیں کر رہی ہیں۔ دوسری قومیں ہمارے اوپر ظلم کر رہی ہیں۔ دوسروں نے ہمیں تباہی
اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔

مسلمان اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحت پر دھیان دیتے تو وہ اپنی ساری
کوشش اپنی اندرونی کمیوں کو دور کرنے پر لگا دیتے۔ مگر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحت
کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا اور بڑا، اور ان کا ہر لکھنے اور بولنے والا

غیر قوموں کی سازشوں کا انکشاف کرنے میں مشغول ہے۔ وہ دوسروں کے ظلم پر احتجاج کرنے میں اپنے تمام الفاظ خرچ کر دینا چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے یہی روگردانی موجودہ مسلمانوں کی تمام بربادیوں کا اصل سبب ہے۔ مسئلہ کے اصل سبب کو دور کرنے کے لیے وہ کوئی محنت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ایک فرضی چیز کو سبب قرار دے کر اس کے اوپر اپنی ساری توانائیاں خرچ کر رہے ہیں۔ ایسی ہر کوشش لغویت کی حد تک بے معنی ہے۔ اس کا ہرگز کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ خواہ مسلمان پچاس ہزار سال تک اس کی چٹان پر اپنا سر پٹکتے رہیں۔

علم طب اگر کسی بیماری کے بارہ میں یہ بتائے کہ اس کا سبب انسان کے جسم کے اندر ہے تو کوئی آدمی یہ نادانی نہیں کرے گا کہ وہ اس قسم کے مرض کے علاج کے لیے بیرونی مرہم تلاش کرنے لگے۔ کوئی مشین کام نہ کر رہی ہو، اور انجینیر اس کو دیکھ کر کہے کہ اس کا سبب اس کے اندرونی پرزہ کی خرابی ہے، تو کوئی آدمی مشین کے باہر پالش کر کے اس کو چلانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مگر مسلمانوں کے مسئلہ کے بارہ میں ان کے پیغمبر کا کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ ان کے مسئلہ کا سبب ان کا داخلی نقص ہے نہ کہ بیرونی سازش۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے تمام رہنما بیرونی سازشوں کا انکشاف کر رہے ہیں اور ان کے خلاف چیخ پکار کرنے میں مشغول ہیں۔ شاید موجودہ مسلمانوں کو پیغمبر کی رہنمائی پر اتنا یقین بھی نہیں ہے جتنا ایک مریض کو اپنے ڈاکٹر پر اور ایک مشین والے کو اپنے انجینیر پر ہوتا ہے۔

مارکسزم کا خاتمہ

مارکسی اشتراکیت کے بارہ میں راقم الحروف نے ۱۹۵۸ میں ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا: مارکسزم، تاریخ جس کو رد کرچکی ہے۔

یہ ٹائٹل اس وقت بڑا عجیب تھا۔ چنانچہ نہ صرف اشتراکی حضرات نے بلکہ اسلام پسند حضرات میں بھی بہت سے لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ ان کا خیال تھا کہ مارکسزم تو ایک زندہ حقیقت ہے ایسی حالت میں اس کے رد ہونے کا کیا سوال۔ مگر آج کتاب کا یہ نام ایک ایسا واقعہ بن چکا ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ خود سوویت روس کے لوگوں کو بھی نہیں۔ مارکسزم آج نظری اور عملی دونوں اعتبار سے ایک ختم شدہ نظام بن چکا ہے۔

ٹائم امریکہ کا مشہور ہفت روزہ میگزین ہے۔ وہ ہر سال کسی ممتاز آدمی کو سال کی شخصیت (Man of the year) قرار دیتا ہے اور اس کے بارہ میں خصوصی مضامین شائع کرتا ہے۔ پہلی بار ۱۹۲۷ میں اس نے چارلس لنڈبرگ (Charles Lindberg) کو اس مقصد کے لئے چنا تھا۔ ۱۹۳۰ میں اس نے مہاتما گاندھی کو سال کی شخصیت قرار دیا۔ ٹائم کا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۰ اس سلسلہ میں ایک غیر معمولی شمارہ ہے۔ اس میں روس کے صدر مسٹر میخائیل گورباچیف کو دہے کی شخصیت (Man of the decade) قرار دیا گیا ہے۔

The Hindustan Times, January 1, 1990



اشتراکی روس کے حکمراں کو یہ غیر معمولی اعزاز دینے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اشتراکیت کے قلعہ میں کوئی اضافہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اشتراکیت کا قلعہ توڑ دیا۔ آج ساری دنیا کے اخبارات میں ایسے مضامین چھپ رہے ہیں جن کی سرخی اس قسم کی ہوتی ہے :

Marxism is over.
Fragmented empire of the U.S.S.R.

ہندستان ٹائمس (یکم جنوری ۱۹۹۰) نے کمیونسٹ دنیا میں تبدیلی اور مارکسی فکر کے انہدام پر ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک بامعنی کارٹون شامل کیا ہے۔ اس کارٹون میں اشتراکیت کے بانی کارل مارکس کی قبر دکھائی گئی ہے۔ قبر کے پتھر پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

Marx — Finally Buried 1989

قرآن میں ہے کہ اللہ اپنے امر پر غالب آکر رہتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے (یوسف ۲۱) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکی دنیا میں جو انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ اللہ کے اسی قانون کے نتیجہ میں ہوئی ہیں۔

مارکسی اشتراکیت خدا اور مذہب کی نفی تھی۔ اس نے مذہب کو بے حقیقت بتا کر اس کو مکمل طور پر رد کر دیا۔ کارل مارکس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے :

Criticism of the Hegelian Philosophy of Right

اس کتاب کے ابتدائی مضمون (انٹروڈکشن) میں مارکس نے لکھا ہے کہ مذہب عوام کی افیون ہے :

Religion is the opium of the people.

مارکس کا نظریہ مختلف ملکوں میں پھیلا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۷ میں اس کی بنیاد پر روس میں ایک طاقت ور حکومت قائم ہوگئی۔ پہلی عالمی جنگ میں اشتراکی روس کو مزید موقع ملا اور اس کی سلطنت کا رقبہ بہت زیادہ وسیع ہوگیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اتنی زبردست فوجی طاقت حاصل کرلی کہ وہ دو سپر پاور میں سے ایک شمار کیا جانے لگا۔

اشتراکی لیڈروں نے ریاستی طاقت کی مدد سے "دوسری دنیا" میں مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ مذہب کے تمام نشانات کو مٹا دیا۔ اسٹالن کے زمانہ میں ایک کروڑ سے زیادہ آدمی قتل کر دئے گئے۔

پورے سوویت یونین میں مکمل طور پر جبر کی حکومت قائم کر دی گئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ مذہبی کام کے مواقع اب صرف پہلی دنیا اور تیسری دنیا میں ہیں۔ دوسری دنیا میں مذہب کو اب کوئی موقع ملنے والا نہیں۔

مگر مذکورہ آیت کے مطابق، اللہ کی طاقت نے کام کیا۔ خود سوویت یونین کے اندر ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ روس کا اشتراکی قلعہ متزلزل ہو گیا۔ حتی کہ اس کی اینٹیں نکل نکل کر بکھرنے لگیں۔ روسی کیمپ میں ہونے والا یہی واقعہ ہے جس کی سرخی امریکی میگزین نیوز ویک (۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹) نے ان لفظوں میں قائم کی ہے کہ اشتراکی دنیا میں کایا پلٹ (A world transformed)

ٹائم میگزین (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) نے اس سلسلہ میں روس کے نظام میں تبدیلی پر تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تقریباً ۵۵ ملین سوویت مسلمان مذہبی رواداری (religious tolerance) کے بارہ میں نئی روسی پالیسی کا فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ اس رپورٹ کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے —— کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے: Karl Marx makes room for Muhammad

روسی علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۲۰ فی صد ہے۔ سابق روسی حکمراں جوزف اسٹالن نے ۱۹۳۲ میں روس سے مذہب کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۱۷ سے پہلے روس میں ۲۶ ہزار مسجدیں تھیں۔ چند کو چھوڑ کر سب کی سب مسجدیں بند کر دی گئیں یا توڑ کر ختم کر دی گئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں مذہبی مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ چار سال پہلے خود گورباچیف نے اسلام کو ترقی کا دشمن (enemy of progress) بتایا تھا۔ مگر آج حالات بالکل مختلف ہیں۔

کچھ سال پہلے تک روس میں قرآن کی حیثیت ایک ممنوعہ کتاب کی تھی۔ آج یہ حال ہے کہ سعودی عرب نے قرآن کے ایک ملین نسخے روس بھیجنے کا اعلان کیا تو روس کی ہوائی کمپنی ایروفلاٹ (Aeroflot) اس پر راضی ہو گئی کہ وہ قرآن کے ان نسخوں کو سعودی عرب سے روس لے جانے کی خدمت انجام دے گی۔

خدا چاہتا ہے کہ اس دنیا میں مکمل مذہبی آزادی موجود ہو۔ سوویت روس کے اشتراکی حکمرانوں نے اس آزادی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ آخر کار خدا کی طاقت ظاہر ہوئی۔ اس نے اشتراکی قلعہ کو اس طرح توڑ دیا جیسے کہ وہ قلعہ نہ تھا، بلکہ بچوں کا ایک گھروندا تھا جو ہوا کے ایک جھونکے سے بکھر کر رہ گیا۔

حکیمانہ تدبیر

دنیا مقابلہ کا میدان ہے۔ یہ مقابلہ اول دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گا۔ مقابلہ کا یہ نظام خود خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اس لئے کوئی شخص یا قوم اس کو بدلنے پر قادر نہیں، خواہ وہ اس کے خلاف کتنا ہی زیادہ فریاد اور احتجاج کرے۔

مقابلہ کی اس دنیا میں کوئی شخص صرف حکیمانہ تدبیر سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ حکیمانہ تدبیر سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے کے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھے اور ایسے حالات پیدا کرے جس میں فیصلہ کا سرا اس کے اپنے ہاتھ میں آجائے۔ اس بات کو ایک لطیفہ سے بخوبی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک سارس اور ایک لومڑی میں دوستی تھی۔ ایک بار لومڑی نے سارس سے کہا کہ آؤ ہم دونوں مل کر کھیر پکائیں۔ کچھ سامان تم لاؤ اور کچھ سامان میں لاؤں۔ اس طرح کھیر تیار کی جائے اور پھر دونوں مل کر اسے کھائیں۔ چنانچہ دونوں سامان لے آئے اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔

جب کھیر کو نکال کر برتن میں رکھنے کا وقت آیا تو لومڑی فوراً ایک تھال لے آئی۔ اس نے کہا کہ کھیر اس میں رکھی جائے گی۔ کھیر کو تھال میں رکھ کر لومڑی نے کھانا شروع کر دیا اور سارس سے کہا کہ آؤ تم بھی کھاؤ۔ تھال جیسے برتن میں کھانا لومڑی کے لئے آسان تھا۔ چنانچہ لومڑی ساری کھیر کھا گئی۔ سارس اپنی لمبی چونچ پھیلے ہوئے تھال میں ادھر ادھر مارتا رہا مگر وہ کھیر کی بہت کم مقدار حاصل کر سکا۔

سارس نے اپنے دل میں کہا کہ لومڑی نے تو اس طرح مجھے بیوقوف بنا دیا۔ آخر کار اس نے سوچ کر ایک تدبیر نکالی۔ اس نے لومڑی سے کہا کہ آؤ ایک بار اور ہم دونوں مل کر کھیر پکائیں۔ دوبارہ دونوں سامان لے آئے۔ اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔ اب سارس نے پیشگی منصوبہ کے مطابق فوراً ایک صراحی لاکر رکھ دی۔ اور کہا کہ کھیر اس میں رکھی جائے گی۔ چنانچہ کھیر نکال کر صراحی میں رکھ دی گئی۔ سارس نے فوراً صراحی کے منہ میں اپنی لمبی چونچ ڈال کر کھیر کو کھانا شروع کر دیا اور لومڑی سے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ مگر اب صورت حال سارس کے حق میں تھی۔ سارس نے خوب سیر ہو کر کھیر کھائی اور لومڑی بھوکی رہ گئی۔

انسانیت کی پوری تاریخ میں سارس اور لومڑی کی یہی کہانی دہرائی جارہی ہے۔ جو لوگ کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں وہ اس میں سے حصہ پاتے ہیں، اور جو لوگ کھیر کو اپنے موافق برتن میں نہیں رکھ پاتے وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔

اس تدبیر کی ایک شاندار مثال صلح حدیبیہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد آپ کے مخالفین (قریش) یہ چاہتے تھے کہ وہ آپ کے اور آپ کے معاملہ کو جنگ کے میدان میں طے کریں۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جنگ کے میدان میں وہ زیادہ موافق پوزیشن میں ہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ معاملہ کو امن کے ماحول میں لے آئیں۔ کیوں کہ امن کے ماحول میں نظریہ فیصلہ کن بنتا، اور نظریہ کے اعتبار سے شرک کے مقابلہ میں توحید کو واضح طور پر زیادہ برتر پوزیشن حاصل تھی۔ صلح حدیبیہ نے اسلام کو یہی موافق میدان فراہم کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد دو سال سے بھی کم عرصہ میں مکہ فتح ہوگیا۔

اب ہندستان کے مخصوص حالات کے اعتبار سے اس معاملہ پر غور کیجئے۔ ہندستان میں مسلمانوں کا مقابلہ ہندو فرقہ سے ہے۔ مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ہندو ان کے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اور فرقہ وارانہ جھگڑوں میں انھیں سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نقصان کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ مگر یہ نقصان خود مسلمانوں کے سطحی قائدین کی نادانی کی بنا پر پیش آرہا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی کم فہمی کی بنا پر مذکورہ تدبیر کو مسلمانوں کے حق میں استعمال نہ کرسکے۔

ہندو قوم اس وقت تین بڑے طبقوں پر مشتمل ہے۔ ایک تعلیم یافتہ طبقہ جو ملک کے اکثر انتظامی اور سماجی عہدوں پر قابض ہے۔ دوسرا تاجر طبقہ جو ملک کی بیشتر اقتصادیات پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ تیسرا گروہ ہندو عوام اور پس ماندہ طبقات کا ہے۔ جو تعداد کے اعتبار سے ہندو قوم کا زیادہ بڑا حصہ ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ اپنے تعلیمی مزاج کی بنا پر سیکولر یا سائنٹفک ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ وہ معاملات پر فرقہ وارانہ انداز کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں رائے قائم کرتا ہے۔ تاجر طبقہ کے سامنے اصلاً اس کا تجارتی مفاد ہے۔ چوں کہ تجارت کی مشین کو جاری رکھنے کے لئے امن ضروری ہے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ملک میں امن کا ماحول قائم رہے۔ تاکہ اس کے تجارتی عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

تیسرا طبقہ زیادہ تر غریب اور بے روزگار یا کم آمدنی والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہی طبقہ اصلاً تمام فساد میں ملوث ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ دنگے اور فساد میں ہے۔ کیوں کہ فساد میں اس کو لوٹنے کا موقع ملتا ہے۔ پرامن حالات میں لوٹنے والا فوراً فوجداری قانون کی زد میں آجاتا ہے۔ مگر فساد کے موقع پر جو لوگ لوٹ مار کرتے ہیں ان کو یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ ملک کے موجودہ نظام میں ان کی کوئی قانونی پکڑ ہونے والی نہیں۔

ہندو قوم کے ان تین طبقات کو آسانی کی خاطر دو گروہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ پہلے اور دوسرے طبقہ کا۔ یہ پہلا گروہ اپنے مزاج یا اپنے مفاد کے تحت فساد اور بدنظمی کو نہیں چاہتا۔ البتہ ان کے علاوہ ہندوؤں کا جو عوامی گروہ ہے اس کی ایک تعداد فساد میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اسی گروہ کے افراد فرقہ پرست تنظیموں میں شامل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ جلوس نکالتے ہیں اور مسلم مخالف نعرے بلند کرتے ہیں۔ یہی لوگ مختلف طریقوں سے ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جن سے مسلمان مشتعل ہو کر تشدد کریں۔ تاکہ انھیں مسلم بستیوں میں لوٹ مار کا موقع مل سکے۔

اب مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ ملک میں جب بھی فرقہ وارانہ مسئلہ یا کشیدگی کی صورت پیدا ہو تو وہ "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کی کوشش کریں۔ یعنی وہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اس کی کوشش کریں کہ مسئلہ کو طے کرنے کے لئے اس کو پہلے گروہ (ہندو خواص) کی سطح پر لایا جائے۔ وہ دوسرے گروہ (ہندو عوام) کی سطح پر نہ جانے پائے۔ پہلے گروہ کی سطح پر معاملہ کا فیصلہ کیا جائے تو یہ فیصلہ ہمیشہ مسلمانوں کے موافق ہوگا۔ اور اگر وہ دوسرے گروہ کی سطح پر چلا گیا تو شدید اندیشہ ہے کہ فیصلہ ان کے خلاف ہو جائے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک واقعاتی مثال لیجئے۔ یہ مثال موافق برتن اور مخالف برتن کے نظریہ کو بہت اچھی طرح واضح کر رہی ہے۔

ایک واقعہ

مدراس میں ۲۰ ویلج روڈ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے۔ یہ مسجد مسلم ویلفیر اسوسی ایشن کے زیر انتظام ہے۔ اس مسجد پر اذان کے لیے لاؤڈ اسپیکر لگایا گیا تو علاقہ کے کچھ ہندوؤں کو اس پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے پولیس سے شکایت کی کہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان سے ہمارے گھروں اور ہمارے مندروں کے سکون میں [illegible]

میں خلل واقع ہوتا ہے ، اس لیے مسلمانوں کو لاوڈ اسپیکر پر اذان دینے سے روکا جائے ۔ مگر مدراس پولیس نے اس شکایت پر کوئی کارروائی نہیں کی ۔

اس کے بعد ایک مقامی ہندو نے مدراس ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن داخل کیا ۔ اور عدالت سے درخواست کی کہ لاوڈ اسپیکر کی اذان مقامی ہندوؤں کے لیے تکلیف (Nuisance) کا باعث ہے ، اس لیے اس کو بند کرنے کا حکم جاری کیا جائے ۔

جسٹس بکھتاوت سولم نے دونوں فریقوں کے بیانات سننے کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ کو اپنا فیصلہ سنایا ۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں عدالت کو مداخلت کرنی چاہیے ۔ مدعی کے دلائل میری نظر میں تشفی بخش نہیں ہیں ۔ ایک جمہوری ملک میں ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرے ۔ اس طرح کے معاملات میں ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل اور رواداری (Tolerance) ہو ، خاص طور پر ہندستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب پر عمل کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں ۔ اس بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ مدعی کی درخواست قابل لحاظ ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ مسجد میں لاوڈ اسپیکر کا استعمال عین قانون کے مطابق ہے ۔ اس اظہار خیال کے ساتھ مدعی کی درخواست خارج کی جاتی ہے :

With these observations, the writ petition will stand dismissed.

مدراس ہائی کورٹ کا فیصلہ مکمل اور اصلی صورت میں الرسالہ انگریزی (دسمبر ۱۹۸۹) میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ یہ فیصلہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں اگر کچھ لوگ متعصب اور فرقہ پرست ہیں تو یہاں ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو بے تعصب اور انصاف پسند ہیں ۔ مزید یہ کہ یہ دوسرے لوگ اس حد تک طاقت ور ہیں کہ وہ پہلے گروہ کے ارادے کو عمل میں آنے سے روک دیں ۔

اب اس واقعہ پر ایک اور انداز سے غور کیجئے ۔ فرض کیجئے کہ مدراس کی مذکورہ مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر جب ہندوؤں نے اعتراض کیا تو وہاں کے مسلمان بگڑ جاتے ۔ وہ اس کے مقابلہ میں جلسہ اور ایجی ٹیشن کی سیاست چلاتے ۔ وہ ہندوؤں سے ٹکراؤ کرتے ، تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ۔ ہندوؤں کی ضد بڑھتی ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ لڑائی چھڑ جاتی ۔ اب وہی واقعات پیش آتے جو شمالی ہند میں اسی قسم کے مسائل پر پیش آتے رہتے ہیں ۔ یعنی دونوں

گروہوں کے درمیان فساد ، اور پھر مسلمانوں کا یک طرفہ طور پر مارا جانا۔ اور ان سب کے باوجود اصل مسئلہ کا اپنی جگہ بدستور باقی رہنا۔

ہائی کورٹ کے جج امکانی طور پر منتظر تھے کہ مسلمان ان کی عدالت میں اپنے مقدمہ کی پیروی کریں اور وہ عین مسلمانوں کے حق میں قانونی فیصلہ دے دیں۔ مگر مسلمانوں کی غیر حکیمانہ روش کے نتیجہ میں یہ ہوتا کہ تمام جج گویا انتظار میں پڑے رہتے اور مسلمان غیر ضروری طور پر مارے جاتے۔ ان کی جائدادیں جلائی جاتیں۔ لاؤڈ اسپیکر کو بچانے کے نام پر پوری مسجد ویران کر دی جاتی۔ یہ امکان اپنی پوری موجودگی کے باوجود ، مسلمانوں کے حق میں واقعہ نہ بن سکتا۔ اس دنیا میں کوئی امکان اپنے آپ کسی کے حصہ میں نہیں آتا۔ یہاں ہر امکان کو استعمال کرنا پڑتا ہے ، اس کے بعد ہی وہ کسی کے لئے واقعہ بنتا ہے۔

مدراس کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کامیابی کا عظیم امکان موجود ہے ، مگر مسلمان اب تک اس امکان کو استعمال نہ کرسکے ، اس لئے ان کے مسائل بھی اب تک حل نہیں ہوئے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے موجودہ رہنماؤں نے مجرمانہ حد تک غفلت کا ثبوت دیا ہے۔

مسجد کے معاملہ کو عدالت کے ذریعہ طے کرنا گویا کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنا تھا۔ اس کے برعکس مسجد کا مسئلہ اگر عوامی مظاہرہ کا موضوع بنایا جاتا تو یہ کھیر کو ایسے برتن میں رکھنا ہوتا جو مسلمانوں کے لئے غیر موافق تھا۔ پہلی صورت میں کھیر پوری طرح مسلمانوں کے حصہ میں آئی۔ جب کہ دوسری صورت میں کھیر تمام تر دوسرے کے حصہ میں چلی جاتی۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ یہ مثال وہ ہے جس کو مسلمانوں کے موجودہ مسائل میں نمبر ایک درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد (اجودھیا) کا مسئلہ اگرچہ ملک کے بٹوارہ کے پہلے سے موجود ہے۔ تاہم اپنی موجودہ صورت میں اس کا آغاز فروری ۱۹۸۶ میں ہوتا ہے جب کہ فیض آباد ڈسٹرکٹ جج کے حکم سے اس کا تالا کھول دیا گیا اور ہندوؤں کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ مسجد کے اندر اپنی مورتیاں رکھ دیں۔

اس کے بعد مسلمانوں (صحیح تر لفظ میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈروں) نے کیا کیا۔ ان کے لئے عین وہی

امکان موجود تھا جس کی ایک مثال مدراس ہائی کورٹ کے فیصلہ کی صورت میں اوپر بتائی گئی ہے۔ مگر مسلم لیڈروں نے اس امکان کو استعمال نہ کرتے ہوئے عین اس کے برعکس عمل کیا۔ مارچ ۱۹۸۶ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی گئی۔ اس نے فوراً ہی ایجی ٹیشن کے انداز میں اپنی سرگرمیاں شروع کردیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں جلسے کرکے جوشیلی تقریریں کی گئیں اور جلوس کے مظاہرے سڑکوں پر کئے جانے لگے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ مارچ ۱۹۸۷ میں تین لاکھ مسلمانوں کی ریلی دہلی میں نکالی گئی جس میں نعروں اور تقریروں کا ہنگامہ گرم کیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ اگست اور اکتوبر ۱۹۸۸ء میں لاکھوں مسلمان مارچ کرتے ہوئے اجودھیا میں داخل ہوں گے اور بابری مسجد میں گھس کر جمعہ کی نماز پڑھیں گے۔ شور وغل کی اس سیاست سے بابری مسجد تو مسلمانوں کو نہیں ملی۔ البتہ فرقہ پرست ہندو جاگ اٹھے۔ یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، گجرات وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں مسلمان ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔ اربوں روپئے کی جائدادیں برباد کردی گئیں۔

جس وقت یہ سب کچھ ہو رہا تھا، عین اسی وقت اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک انتہائی شاندار امکان مسلمانوں کے لئے اس ملک میں موجود تھا۔ مگر مسلم لیڈر اپنی ناقابل فہم بے خبری کی بنا پر نہ اس سے آگاہ ہوئے اور نہ اس امکان کو استعمال کرنے کی کوئی سنجیدہ تدبیر کر سکے۔

یہاں میں ایک خصوصی میٹنگ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا تفصیلی تذکرہ الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں چھپ چکا ہے۔ یہ میٹنگ نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو ہوئی۔ اس کا مقصد بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار حضرات شریک ہوئے۔ مسلمانوں کی طرف سے جن لوگوں نے میٹنگ میں شرکت کی، ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ ہندو سائڈ میں مہنت اویدناتھ (صدر رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی)، آچاریہ منی سوشیل کمار، سنجے ڈالمیا اور دوسرے بہت سے ذمہ دار حضرات شریک تھے۔

جب تمام لوگ بول چکے تو میں نے ایک مختصر تقریر کی۔ ضروری پہلوؤں پر اظہار خیال کے بعد میں نے کہا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے سب سے زیادہ بہتر طریقہ ثالثی کا اصول ہے۔ اگر دونوں فریق ثالثی کے اصول کو مان لیں تو میری تجویز ہے کہ مسلّمہ تاریخ دانوں (تاریخ کے پروفیسروں) کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ دونوں طرف کے ذمہ دار لوگ اس بات کا پیشگی عہد کریں کہ تاریخ دانوں کا بورڈ جو فیصلہ

کرے گا، اس کو وہ بلا بحث مان لیں گے اور فوراً اس کی تعمیل کریں گے۔

ہندو سائڈ کے تمام لوگ، بشمول مہنت اویدناتھ (موجودہ ایم پی) نے اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا۔ ہر ایک نے کہا کہ ہم اس تجویز کو مانتے ہیں۔ اس کو باقاعدہ صورت دی جائے اور اس کے مطابق بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی قضیہ کا فیصلہ کیا جائے۔ مگر مسلم سائڈ نے اس تجویز کو منظور نہیں ہونے دیا۔ سید شہاب الدین صاحب تقریباً چیخنے کے انداز میں بولنے لگے کہ ہم کو یہ تجویز منظور نہیں۔ مسلم سائڈ کے دوسرے تمام افراد نے خاموش رہ کر سید شہاب الدین کی بالواسطہ تائید کی۔ ان خاموش رہنے والوں میں جماعت اسلامی کے نمائندہ جناب افضل حسین صاحب (وفات یکم جنوری ۱۹۹۰) بھی شامل تھے۔ اس طرح ہندو سائڈ کی متفقہ تائید کے باوجود یہ میٹنگ شور وغل پر ختم ہو گئی۔

اب غور کیجئے کہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی اس تجویز کو اگر مسلم رہنماؤں نے مان لیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس کا اندازہ نہایت آسانی سے ان خطوط اور مضامین اور بیانات کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جو اس موضوع پر ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے برابر شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ ۸۹ - ۱۹۸۷ کے درمیان اس قسم کی تحریریں کثرت سے شائع ہوئی ہیں جن کو عام مسلمان بھی قومی آواز، تعمیر حیات نقیب، دعوت، نئی دنیا، اخبار نو وغیرہ کی فائلوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہاں میں صرف دو حوالوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ دو حوالے بطور حصر نہیں ہیں بلکہ صرف بطور مثال ہیں۔ انھیں پر دوسروں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ایک بڑا تاریخی ادارہ ہے جس کو سنٹر فار ہسٹاریکل اسٹڈیز کہا جاتا ہے۔ اس ادارہ کے ۲۴ پروفیسروں نے بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی مسئلہ کا مطالعہ خالص تاریخی انداز میں کیا اور اس پر ایک مفصل دستاویز تیار کی۔ یہ دستاویز ان کی طرف سے مشترکہ طور پر شائع کی گئی۔ اس دستاویز کا خلاصہ ٹائمس آف انڈیا (۶ نومبر ۱۹۸۹) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دستاویز کا اردو ترجمہ قومی آواز (۲ جنوری ۱۹۹۰) میں شائع ہوا ہے۔

اس تاریخی دستاویز پر جن لوگوں کے دستخط ہیں ان میں پروفیسر ایس گوپال، پروفیسر رومیلا تھاپر، پروفیسر بپن چندر جیسے ممتاز مورخین کے نام بھی شامل ہیں۔ اس مشترکہ تاریخی دستاویز میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بابری مسجد تو ایک تاریخی واقعہ ہے، مگر رام جنم بھومی کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔ یہ ایک

فرضی کہانی ہے جو زیادہ تر والمیکی کی افسانوی نظم (رامائن) پر مبنی ہے۔ اس کا معلوم تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔

ان تاریخی پروفیسروں کے پیش کئے ہوئے حقائق اتنے قطعی تھے کہ خود ہندوؤں میں بھی کوئی اس کو علمی طور پر رد نہ کرسکا۔ مثلاً مسٹر کے آر ملکانی (ٹائمس آف انڈیا ۵ جنوری ۱۹۹۰) نے بالواسطہ طور پر اقرار کرلیا کہ رام جنم بھومی کا قصہ ابتدائی دور کا افسانہ (primitive myth) کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم یہ مذہبی معاملہ ہے، اس لئے اس کو پیشہ ور تاریخ دانوں کے ذریعہ طے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے جواب میں ایک نہایت ممتاز دانشور ملک راج آنند (بمبئی) نے نہایت سخت تردیدی خط لکھا جو ٹائمس آف انڈیا (۵ فروری ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔

دوسرا حوالہ جو میں اس سلسلہ میں دینا چاہتا ہوں، وہ ایک واقعہ ہے جو مختلف اخباروں، مثلاً اسٹیٹسمین (۶ جنوری ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ بعض اردو اخباروں میں بھی اس کی روداد آئی ہے، مثلاً نئی دنیا (۷-۲ جنوری ۱۹۹۰) اسٹیٹسمین کی رپورٹ کی نقل الگ صفحہ پر شائع کی جارہی ہے۔

ہندستانی مورخوں کی ایک قدیم اور نہایت اہم تنظیم ہے جس کا نام انڈین ہسٹری کانگرس ہے۔ اس کے اجلاس ہر سال ملک کے مختلف حصوں میں ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۹ اس تاریخی انجمن کی گولڈن جوبلی کا سال تھا۔ اس کے تحت ۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ - یکم جنوری ۱۹۹۰ کو اس کا اجلاس گورکھپور میں ہوا۔ میزبانی کے فرائض گورکھپور یونیورسٹی نے انجام دئے۔ اس کانگرس میں ملک کے مختلف حصوں سے ۳۰۰۰ سے زیادہ ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ یہ لوگ ملک بھر کی سو سے زیادہ یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۸۶ میں جب بابری مسجد - رام جنم (اجودھیا) کے مسئلہ نے شدت اختیار کی تو اس وقت انڈین ہسٹری کانگرس نے اپنے اجلاس (۱۹۸۶) میں متفقہ طور پر ایک رزولیوشن منظور کیا تھا۔ یہ رزولیوشن انڈین ہسٹری کانگرس کی رپورٹ ۱۹۸۶ (صفحہ ۱۸۷) میں چھپا ہوا موجود ہے۔ اس رزولیوشن میں اجلاس میں شریک ہونے والے تمام تاریخ دانوں نے متفقہ طور پر کہا تھا کہ:

"انڈین ہسٹری کانگرس ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور انتشار پسندی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ اس رجحان کی ایک تشویشناک مثال کسی فرقہ کی صدیوں پرانی عبادت گاہوں کو اس

Indian History Congress

Walk-out over Ayodhya issue

The communal politics of Ramjanambhoomi-Babri Masjid controversy intruded rudely into the annual Indian History Congress being held at Gorakhpur University, earlier this week, leading to a walk-out by over 300 delegates, including the president of the Congress and leading historians.

On December 30, 1989 the Indian History Congress unanimously adopted a resolution reiterating its stand taken since 1986 that "monuments of ancient and medieval times should be rigorously brought under the protection of Ancient Monuments Act, and no structural change should be allowed, and that wherever religious worship had ceased, it should not be allowed to be re-started, whatever be the religious denomination involved."

Following this the Vice-Chancellor of Gorakhpur University, Professor Ms Pratima Asthana, who was also the local secretary of the Congress received a request from a member of Parliament from Gorakhpur, Mahant Avaidyanath of the Vishwa Hindu Parishad, that he would like the opportunity of addressing the Congress. When this request was put before the delegates, it was resisted and rejected as this was not on the agenda and the Indian History Congress was not the place for a political statement on a contentious issue.

However, Professor Asthana walked into the Congress followed by the Mahant and the majority of delegates including the president of the Congress walked out. Mahant Avaidyanath then addressed a few delegates, some employees of Gorakhpur University and some RSS workers, while the majority of the delegates held a meeting outside. Apparently slogans and counter slogans were raised and after Mahant Avaidyanath left the Congress continued its sessions.

Among those who walked out were Professor Irfan Habib of Aligarh Muslim University, Professor Barun De of the Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta. Professor Durga Prasad Bhattacharya of the Indian Statistical Institute, Calcutta, Proffessor A.Q. Rafeeq of Kashmir, Professor R. Champakalakshmi from Jawaharlal Nehru University and Professor Athar Ali, the President of the Congress.

Delegates expressed the view that even if all the Members of Parliament had done what Mahant Avaidyanath had done, the Congress would have reiterated its position. No request had been received from anyone to address the Congress while the agenda was being prepared for the annual Congress was a purely academic conference.

Historians resent the fact that an attempt was made by the Vishwa Hindu Parishad to use its forum for presenting a communal point of view and to create a disturbance at the Congress.

The Congress has nominated Professor H.L. Gupta, retired professor from Sagar University, as President of its next annual session.

The Statesman, New Delhi, January 6, 1990

بنیاد پر دوسرے فرقوں کی عبادت گاہوں میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے کہ ان کو ان مقامات پر تعمیر کیا گیا تھا جہاں پہلے آخر الذکر فرقہ کی عبادت گاہیں تھیں۔ انڈین ہسٹری کانگرس کا خیال ہے کہ ماضی کی تخریبی کارروائیوں کی داستانوں کو دہرانا تاریخ کے نام کو ناپاک مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ اس تحریک کے رہنما جو شہادتیں پیش کرتے ہیں وہ اکثر مشکوک ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک آزاد ہندستان کی سیکولر اقدار کے منافی ہے۔ ہسٹری کانگرس تمام لوگوں سے، بالخصوص مورخوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سائنس اور سیکولرزم پر اس حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں" (خلاصہ)

گورکھپور کے اجلاس میں ۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ کو اس سابقہ رزولیوشن کی نقلیں تمام شرکا ء کے درمیان تقسیم کی گئیں تاکہ موجودہ اجلاس میں دوبارہ اس کی توثیق کرائی جائے۔ اس کی خبر مہنت اویدناتھ کو ہوئی۔ وہ رام جنم بھومی تحریک کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے گورکھپور سے وشو ہندو پرشد کے ٹکٹ پر لوک سبھا کے چناؤ (۲۲ نومبر ۱۹۸۹) میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔

مہنت اویدناتھ (ایم پی) کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی کی خاتون وائس چانسلر پرتیما استھانا کے پاس درخواست بھیجی کہ ان کو ہسٹری کانگرس کے اجلاس میں تقریر کرنے کی اجازت دی جائے۔ ہسٹری کانگریس کے مندوبین اس کے حق میں نہیں تھے۔ تاہم وائس چانسلر نے انھیں اجازت دے دی۔ مہنت اویدناتھ آر ایس ایس کے کچھ نوجوانوں کے ساتھ اجلاس میں آگئے۔ کانگرس کے مندوبین کو اس پر سخت اعتراض ہوا۔ یہاں تک کہ انھوں نے واک آؤٹ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین سو مندوبین میں سے صرف آٹھ آدمی اجلاس میں باقی رہے۔ مہنت اویدناتھ نے ایک ایسے ہال میں تقریر کی جہاں زیادہ تر خالی کرسیاں ان کو سننے کے لئے موجود تھیں۔

واک آؤٹ کرنے کے بعد مندوبین نے ہال کے باہر لان پر اپنی میٹنگ کی۔ اس میں مختلف یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسروں نے تقریریں کیں۔ انھوں نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ ایک ایم پی تو درکنار، پارلیمنٹ کے تمام ممبران بھی ہم کو اس راہ سے نہیں ہٹا سکتے جس کو ہم تاریخی طور پر درست سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مہنت جی کا نام ایجنڈے میں شامل نہیں اس لئے انھیں ہسٹری کانگرس سے خطاب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انھوں نے اس بات پر سخت غصہ کا اظہار کیا کہ فرقہ پرست

لوگ اپنے پروپیگنڈے کے لئے ہسٹری کانگرس کا پلیٹ فارم استعمال کر رہے ہیں۔ گورکھپور یونیورسٹی کے طالب علموں کی بڑی تعداد نے بھی کھل کر اس کی حمایت کی۔

اس معاملہ نے اتنی شدت اختیار کی کہ بعد کو خود وائس چانسلر پرتیبا استھانا نے کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اور اگلے اجلاس میں مندوبین سے معافی مانگی۔

مہنت اوید ناتھ جب خالی کرسیوں کو خطاب کر کے واپس چلے گئے تو مندوبین دوبارہ اسمبلی ہال میں واپس آئے اور ایک بار پھر انھوں نے اتفاق رائے سے وہ رزولیوشن منظور کیا جو دسمبر ۱۹۸۶ میں متفقہ طور پر منظور کیا جا چکا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کانگرس کے آٹھ مندوبین جو واک آؤٹ میں شریک نہیں ہوئے تھے، وہ بھی اس رزولیوشن کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکے۔ جب رزولیوشن پر رائے شماری کی گئی تو اجلاس کے ایک شخص نے بھی اس کی مخالفت میں اپنا ووٹ نہیں دیا۔

اوپر کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا دانشور اور مورخ طبقہ عام طور پر غیر فرقہ وارانہ انداز میں سوچتا ہے۔ وہ معاملات پر سائنٹفک انداز سے رائے قائم کرتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھئے تو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی تجویز کو مسلم لیڈر نے منظور کر کے اس پر عملدرآمد کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ کس صورت میں نکلتا۔ یہ یقینی طور پر "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کے ہم معنی ہوتا۔ کیوں کہ تاریخ دانوں کا بورڈ اپنے علمی ذہن کی بنا پر تاریخی حقائق کی بنیاد پر فیصلہ کرتا۔ اور جب تاریخی حقائق کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا تو وہ عین مسلمانوں کی موافقت میں ہوتا۔

یہاں مسلمانوں کے نادان لیڈروں نے ناقابل معافی ملّی جرم کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ موقع تھا کہ اجودھیا مسئلہ کی "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھوائیں۔ مگر انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت اس کو اپنے غیر موافق برتن میں رکھ دیا۔ مورخین سے فیصلہ لینے کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ مسئلہ کو عوامی مظاہروں کا عنوان بنا دیا۔ وہ سڑکوں پر اس کا فیصلہ کرنے کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ کھیر کو اس برتن میں رکھنے کے ہم معنی تھا جو فریق ثانی کے لئے زیادہ موافق ہو۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ عین وہی تھا جو قانون قسمت کے تحت پیشگی طور پر اس کے لئے مقدر تھا۔ ایک فریق ساری کھیر کھا گیا، اور دوسرا فریق بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا، اور کچھ نہ کر سکا۔

نماز

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اور کفر کے درمیان ترک صلاۃ ہے۔ (بین الرجل والکفر ترك الصلاة) حضرت عمر نے فرمایا کہ نماز دین کا کھمبا ہے۔ (الصلاة عماد الدین) نماز "اللہ اکبر" کے قول سے شروع ہوتی ہے اور "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے قول پر ختم ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: تحریمها التکبیر وتحلیلها التسلیم۔

نماز کی ابتدائی تیاری وضو سے شروع ہوتی ہے۔ وضو کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں جس کا وضو نہ ہو اور اس کا وضو نہیں جس نے اس پر اللہ کے نام کو یاد نہ کیا (لا صلاۃ لمن لا وضوء له ولا وضوء لمن لم یذکر اسم اللّٰه علیه) وضو حقیقۃً ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ آدمی اپنے جسم کے کچھ نمائندہ حصوں کو دھوکر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ اسی طرح تو اپنی رحمت کے پانی سے میرے پورے وجود کو پاک کردے، تو میرا تزکیہ کرکے مجھے جنت میں داخل کردے۔

مؤذن جب اذان کے کلمات کہتا ہے تو اس کے بارہ میں حکم ہے کہ تمام نمازی اس کو سن کر اسی طرح اپنی زبان سے دہرائیں۔ یہ دہرانا درحقیقت مؤذن کی پکار پر لبیک کہنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس دینی عمل کے لیے پوری طرح تیار ہے جس کی طرف اس کو بلایا گیا ہے۔

اس کے بعد آدمی اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کہہ کر نماز میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے کہ اس دنیا میں بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ پھر آدمی ادب سے کھڑا ہوتا ہے، وہ جھکتا ہے اور زمین پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔ یہ اس بات کا عملی اقرار ہے کہ خدا بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں۔ میں آخری حد تک اس کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

آخر میں نمازی اپنے دائیں اور بائیں چہرہ پھیر کر کہتا ہے کہ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰه اس طرح گویا وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کے لیے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔ خدا کو گواہ بنا کر وہ عہد کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، ہر ایک کی جان اور مال اور آبرو، ہر چیز اس سے محفوظ اور مامون رہے۔

تخلیقی منصوبہ

انسان کے بارے میں خدا کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے۔ اس سوال کا صحیح جواب متعین کرنا انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ اسی سے دو اہم ترین سوال کا جواب متعین ہوتا ہے ——— انسان کی نجات کا دارومدار کس چیز پر ہے، اور یہ کہ دعوت اسلامی کا رخ کیا ہونا چاہیے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک اس معاملہ کو جاننے کے لیے قرآن میں کلیدی لفظ خلافت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا میں انسان خدا کا خلیفہ (نائب خدا) ہے۔ یہاں اس کو جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا قانون جو ساری دنیا میں تکوینی طور پر قائم ہے، اس کو وہ خدا کے نائب کی حیثیت سے تشریعی طور پر انسانی زندگی میں جاری کر دے۔

یہ نظریہ قرآن کی آیت إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً سے نکالا گیا ہے۔ مگر یہ سراسر جسارت ہے۔ کیوں کہ قرآن کی اس آیت میں یا کسی اور آیت یا حدیث میں مذکورہ نظریہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ آیت میں "ایک خلیفہ" کا لفظ ہے نہ کہ "خدا کا خلیفہ" کا لفظ۔ خلیفہ کے معنی عربی زبان میں جانشین کے ہیں نہ کہ نائب کے۔ پھر "قانون شرعی کی تنفیذ" کا مذکورہ نظریہ بھی یکسر طبع زاد ہے۔ کیوں کہ آیت یا اس کے سیاق وسباق میں اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے، یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کا معاملہ ہے، اور قرآن کی بنیادی تعلیم کو لازمی طور پر "عبارة النص" سے نکلنا چاہیے، اتنی اہم بات کے لیے تعبیری استدلال ہرگز درست نہیں۔ اس اعتبار سے جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو وہ انتہائی صراحت کے ساتھ وہاں لکھا ہوا ہمیں مل جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کی یہ آیت کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔

اس آیت کے مطابق، انسان کے بارہ میں خدا کے تخلیقی منصوبہ کو سمجھنے کے لیے کلیدی لفظ ابتلاء (آزمائش) ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو آزمائش کے لیے بسایا گیا ہے۔ ہر فرد کو مخصوص حالات کے اندر پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر فرد کو انھیں حالات کے اندر حسن عمل کا ثبوت دینا ہے۔ جو شخص حسنِ عمل کے امتحان میں پورا اترے گا، اس کے لیے ابدی جنت ہے۔ اور جو شخص حسن عمل کے امتحان میں پورا نہ اترے اس کے لیے ابدی جہنم۔

شما حذر بکنید

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۹) میں قصۃ تحمل عبرۃ کے زیر عنوان ایک واقعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بہت بڑی نصیحت ہے۔ اس کے لکھنے والے طائف کے ایک عرب استاذ ابراہیم ع ن ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مجھ کو مطالعہ کا بہت زیادہ شوق تھا۔ ہر روز میں پانچ گھنٹے سے زیادہ مطالعہ کرتا تھا۔ کوئی جریدہ یا مجلّہ یا نئی کتاب میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں ان کو حرف بہ حرف پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ مطالعہ میری روزانہ زندگی کا ایک لازمی جزء بن گیا۔ مگر آج میں بالکل اندھا ہوں۔ اب میں کوئی بھی چیز اپنی آنکھ سے نہیں پڑھ سکتا۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کی وجہ ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ وہ بعض امور میں مفرط (حد سے تجاوز کرنے والے) بن گیے۔ چنانچہ وہ گاڑی بہت تیز دوڑاتے تھے۔ اور اسی کے نتیجہ میں یہ حادثہ پیش آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی گاڑی بہت زیادہ تیز دوڑا رہا تھا۔ انتہائی تیزی کی بنا پر میری گاڑی راستہ سے ہٹ گئی۔ وہ گیند کی طرح لڑھک گئی اور سڑک کے کنارے ایک بجلی کھمبے سے جا کر ٹکرا گئی۔

میرے سر میں سخت چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد لمبے عرصہ تک میں اسپتال میں زیر علاج رہا۔ ڈاکٹروں کی زبردست کوشش اور جدید ترین طبی ذرائع کے استعمال کے باوجود میں دوبارہ اچھا نہ ہو سکا۔ اس کے نتیجہ میں میں نے اپنی آنکھ کھو دی۔ میں نے اپنی آنکھ کے علاج کے لیے ساری ممکن کوشش کر ڈالی۔ مگر میری بینائی واپس نہ آسکی۔ اب یہ حال ہے کہ میں بالکل اندھا ہو چکا ہوں۔ اب میں اپنے شوق مطالعہ کو پورا کرنے پر قادر نہیں جو چھوٹی عمر سے میری زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ اور آخر تک میری روزانہ زندگی کا جزء بنا رہا۔

یہ مضمون اس جملہ سے شروع ہوتا ہے کہ کوئی شخص نعمت کی قدر اس وقت تک نہیں پہچانتا جب تک وہ اسے کھو نہ دے (لا احد یدرک قیمۃ النعمۃ حتی یفتقدھا)

اور اس فقرہ پر ختم ہوتا ہے کہ میں یہاں اپنا قصہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ شاید وہ دوسروں کے لیے نصیحت ہو (واصوق حکایتی ھذا لعل فیھا العبرۃ للآخرین)

اس واقعہ میں جو سب سے بڑا سبق ہے، وہ یہ ہے کہ ـــــ اس دنیا میں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ پورب کی طرف سفر کرنے کے لیے پچھم کی طرف سفر کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھنا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں جو شخص "چھوڑنے" کے لیے تیار نہ ہو وہ "پانے" کے بارہ میں اپنے حوصلوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

اگر آپ مطالعۂ کتاب کا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنی گاڑی کو ہلکی رفتار سے چلائیے تاکہ وہ حادثہ کی شکار نہ ہو۔ اگر آپ تعلیم و تجارت کے میدان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو جھگڑے کی باتوں سے اپنے آپ کو دور رکھیے، ورنہ آپ کا تمام منصوبہ دوسروں سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں چور چور ہو جائے گا۔ اگر آپ صالح نظریات کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو حکمرانوں سے سیاسی نزاع نہ کیجیے، ورنہ اصل تعمیری کام تو نہ ہوگا۔ البتہ حکمرانوں کے خلاف جھوٹی لڑائی میں آپ کا سارا وقت اور آپ کا سارا اثاثہ برباد ہو جائے گا۔

اگر کوئی نادان آدمی خواہ مخواہ لڑ مرنے ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے تو ایسے آدمی کو اس حکمت کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جس آدمی کا مقصد یہ ہو کہ وہ دنیا کے مواقع کو استعمال کرکے ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کرے گا، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کی اس حکمت کو آخری حد تک پکڑے اور کسی بھی حال میں اسے نہ چھوڑے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو آخر میں اس کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ آئے گا کہ وہ دوسروں کو اپنی بربادی کا قصور وار ٹھہرا کر ان کے خلاف احتجاج کرتا رہے، جب کہ وہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اس کا احتجاج سننے کے لیے بھی موجود نہ ہو۔

زیر طبع کتابیں

تجدید دین	صفحات	۸۸
راہ عمل		۱۵۲
عقلیات اسلام		۱۴۰

ذہنی سفر

سید شفیع الدین صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ وہ الرسالہ اردو، انگریزی دونوں کے مستقل قاری ہیں۔ وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حلقہ کے لوگوں نے جب الرسالہ کو پڑھنا شروع کیا تو یہ مطالعہ ان کے لیے ایک قسم کا ذہنی سفر بن گیا۔ اس سفر میں طرح طرح کے مراحل آئے۔ وہ مختلف نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے آخرکار مکمل اتفاق تک پہونچ گیے۔ سید شفیع الدین صاحب انگریزی کے شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے اور دوسرے لوگوں کے مذکورہ ذہنی سفر کو ایک نظم میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سفر کی یہ روداد صرف ایک خاص حلقہ کی نہیں بلکہ بہت سے قارئین الرسالہ کی روداد بھی ہے۔ ان کی یہ نظم نیچے نقل کی جاتی ہے اور مقابل کے صفحہ پر اس کا اردو ترجمہ درج ہے۔

Stages: Impact of 'Al-Risala'

I am furious and agitated
Restlessly coiling, I hiss and flash ...
You have struck hard
At my raised hood of false pride!
I am confused and disillusioned
At my own battered and vulnerable position ...
You have blown away
The smoky citadel and bastion of my misconceptions!
I am lost in an endless labyrinth —
Unlit and eerie,
Desperately searching the way out ...
You have unmasked the fangs of my guide!
Gradually ... very gradually
Almost unnoticed, unknowingly
step by step
Stage by stage
The down of TRUTH unveils itself.
My anger recedes,
My mind begins to clear
And I tread in the direction —
A ray of hope is filtering
Through rumbling dark clouds ...

Syed Shafiuddin, M.A. (Eng), M. Ed.
New Delhi, January 4, 1989

مراحل : الرسالہ کی تاثیر

میں غضب ناک ہوں اور مشتعل ہو رہا ہوں
بے چینی کے ساتھ بل کھاتا ہوں، میں پھنکارتا ہوں اور بھڑک اٹھتا ہوں
تم نے بڑی سخت ضرب لگائی ہے
میری جھوٹے فخر کی ابھری ہوئی کلاہ پر
میرا ذہن منتشر ہے، میں فریب سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہوں
اپنی مسمار شدہ اور کمزور حالت سے
تم نے اڑا دیا ہے
میرے دھواں آلود قلعہ اور میرے غلط تصورات کے برج کو
میں اپنی لامتناہی بھول بھلیاں میں کھو گیا ہوں
تاریک اور بھیانک
مایوسانہ طور پر باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں
تم نے میرے رہنما کی کمیں بے نقاب کر دی ہے
آہستہ آہستہ، بہت آہستہ آہستہ
تقریباً بے خبری میں، نہ جانتے ہوئے
رفتہ رفتہ
مرحلہ بہ مرحلہ
سچائی کی صبح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے
میرا غصہ جانے لگتا ہے
میرا ذہن صاف ہونا شروع ہوتا ہے
اور میں صحیح رخ پر چل پڑتا ہوں
امید کی ایک کرن پھوٹتی ہے
گرجتے ہوئے تاریک بادلوں سے

حقوق نہیں ذمہ داری

ایک مسلم لیڈر نے مسلمانان ہند کے مسئلہ کے بارہ میں اپنے طویل مضمون میں ایک بار لکھا تھا :

" گاندھی جی کے گجرات کے شہر ہمت نگر کے مسلمانوں کے ایک وفد کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ گزشتہ سال وہاں پہلی بار فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ ۲۵ دکانیں جلادی گئیں۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے وفد کے لیڈر نے اپنا بیان اس طرح شروع کیا : ہمارا سیاست سے کبھی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہم نے کسی کا کچھ نقصان نہیں کیا ہے۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی بیداری اور عملی سیاست میں شامل ہوئے بغیر کوئی اقلیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی اس کو اس کا حق مل سکتا ہے۔ ہر چیز سیاست پر منحصر ہے۔ اگر آپ سیاست سے الگ رہیں گے تو کوئی آپ پر توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا۔ اگر آپ اپنی سیاست کسی ایک کے ساتھ وابستہ کردیں گے جب بھی آپ کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ سیاست امید و بیم کا ایک کھیل ہے۔ کسی پارٹی کو آپ کی حمایت سے محروم ہونے کا خطرہ اور کسی پارٹی کو آپ کی حمایت حاصل کرنے کی امید ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کو یہ جمہوری حق حاصل ہے۔ مسلمانوں کا کل اثاثہ یہی ہے۔ اور ان کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے اس جمہوری حق کو کب اور کس طرح استعمال کرتے ہیں "

السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا ۹ - ۱۵ جنوری ۱۹۸۳

ہندستان کے مسلمان پچھلے سو سال سے سیاست ہی کے طریقہ پر چل کر اپنا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ الکشن میں، اپنے خیال کے مطابق، وہ کبھی کسی کو جتاتے ہیں اور کسی کو ہراتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے تمام قومی مسائل غیر حل شدہ پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں جو لیڈر مذکورہ قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو اتنے بڑے نادان ہیں کہ انھیں حقائق کی کچھ خبر نہیں۔ یا اتنے بڑے شاطر ہیں کہ بس ایک سستا نعرہ لگا کر وہ اپنی قیادت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کا مسئلہ جمہوری حق کو استعمال کرنے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کرکے موجودہ صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں، اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرکے ہی وہ دوبارہ اپنے لیے عزت کا مقام پا سکتے ہیں۔

۱- محمد طارق الکردی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب ہیں۔ وہ آئرلینڈ میں وہاں کے شہر ڈبلن (Dublin) میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہاں کی ایک یونیورسٹی میں اسلامی نمائش ہو رہی ہے۔ اس موقع پر وہ لوگ اسلامی مرکز کی تمام انگریزی کتابیں اور الرسالہ انگریزی بھی برائے نمائش اور فروخت رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بڑی تعداد میں مرکز کی انگریزی مطبوعات طلب کی ہیں جو ان کو بھیج دی گئی ہیں۔

۲- انٹرنیشنل صوفی سنٹر (نئی دہلی) کے تحت ۳-۴ فروری ۱۹۹۰ کو ایک انٹرنیشنل سیمنار ہوا۔ اس میں مختلف ملکوں اور مختلف مذہبوں کے ممتاز اسکالر شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر اسلام کے روحانی پہلو کے بارہ میں ایک مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ بعض اسباب سے وہ خود اس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ اس موقع کے لیے ایک مقالہ تیار کر لیا گیا تھا جو سیمنار کے ذمہ داروں کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس مقالہ کا عنوان تھا:

The Man Al-Islam Builds

۳- پیلی مزرعہ (ضلع انبالہ) میں مدرسہ بیت العلوم ۱۳۴۴ھ سے قائم ہے۔ اس کے ذمہ داروں کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے پیلی مزرعہ اور دوسرے قریبی مقامات کا سفر کیا۔ یہاں اجتماع اور ملاقاتوں میں دینی اور تعمیری موضوع پر خطابات ہوئے۔ یہ سفر ۳۰-۳۱ جنوری ۱۹۹۰ کو کیا گیا۔ ایک تقریر کا عنوان "اسلام میں علم کی اہمیت" تھا۔ دوسری تقریر کا عنوان "نماز کی اہمیت"۔

۴- بلجیم کے ایک نومسلم (Mady Van der Velden) نے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں منگائی ہیں۔ انھوں نے اپنے خط ۱۸ جنوری ۱۹۹۰ میں اطلاع دی ہے کہ ان کتابوں کو خود پڑھنے کے علاوہ وہ انٹورپ (Antwerp) میں اپنے دوستوں کو پڑھا رہے ہیں۔

۵- مختلف ملکوں کے جرائد میں الرسالہ کے مضامین نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام وسیع تر دائرہ میں پھیل رہا ہے۔ انھیں میں سے ایک جنیوا کا انگریزی مجلہ (The Firmest Bond) ہے۔ وہ اکثر الرسالہ کی چیزیں نقل کرتا ہے۔ اس نے اپنے شمارہ نمبر ۴۵ (۱۹۸۹) میں ایک

انگریزی مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے :

The Message of the Hudaybiah Peace

۶۔ کمانڈر یوسف خاں صاحب اعلیٰ ٹریننگ کے پروگرام کے تحت امریکہ گیے۔ وہاں وہ چھ مہینہ (۱۹۸۹ کا نصف آخر) مقیم رہے۔ وہ اپنے ساتھ الرسالہ کے شمارے اور انگریزی کتابیں بھی لے گیے تھے۔ انھوں نے تقریباً ۲۵ مسلموں اور غیر مسلموں کو رسالے اور کتابیں دیں۔ اور لوگوں سے کہا کہ خود پڑھنے کے بعد وہ دوسروں کو پڑھنے کے لیے دیتے رہیں۔ پڑھنے والوں نے عام طور پر اس کو پسند کیا اور مزید مطالعہ کی خواہش ظاہر کی

۷۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : میں پانچ سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ "صحیح معنوں میں اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچانا اس جریدہ کا مقصد ہے۔ اسی میں دورجدید کے مسلمانوں کی اصلاح اور تعمیر مضمر ہے۔ میں نے الرسالہ کی دس کاپیوں کی ایجنسی لی ہے۔ اس کے علاوہ ہر ماہ تقریباً پچاس آدمیوں کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ بڑی حد تک کامیابی ملی ہے۔ اس ملک میں شیلا پوجن کو لے کر کچھ جگہوں پر فساد ہوئے۔ لیکن جس قدر بڑے پیمانہ پر فسادات کا اندازہ تھا اس سے بہت کم فسادات ہوئے۔ اس کی خاص وجہ اعراض اور صبر کا عمل ہے جو مسلمانوں نے قائم کیا۔ یہ صرف الرسالہ کی دین تھی۔ میں نے آپ کی تقریباً تمام کتابیں منگوائی ہیں اور کالجوں میں سپلائی کی ہے۔ انشاء اللہ مزید کالجوں میں سپلائی کروں گا۔

(محمد اشفاق صدری، بستی پور)

۸۔ ایک صاحب نے بتایا کہ انھیں کچھ چھپے ہوئے ہینڈبل ملے جن میں الرسالہ مشن پر سب وشتم کیا گیا تھا۔ ان میں عبدالبصیر (مٹیا محل، دہلی) اور اظہار اسحق خاں (چتلی قبر، دہلی) کے نام درج تھے۔ انھوں نے دہلی کے دونوں مقامات پر تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ وہاں اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں جس نے اس قسم کا مضمون تحریر کیا ہو۔ اس مخالفانہ ہینڈبل اور مضمون کو کچھ رسالے اور اخبارات مزید نقل کر رہے ہیں اور ان کو بنیاد بنا کر مقالے شائع کر رہے ہیں۔ جو لوگ اس طرح فرضی ناموں سے مضمون لکھیں وہ بلاشبہ بزدل ہیں اور جو لوگ ان کو بلا تحقیق چھاپ کر پھیلائیں وہ بلاشبہ شر پسند ہیں۔ بزدلی اور شر پسندی کے تحت جو مہم چلائی جائے اس کے انجام

کے بارہ میں رائے قائم کرنا کچھ مشکل نہیں۔

۱۔ ایک صاحب ہالینڈ سے لکھتے ہیں: آپ کے الرسالہ کی ایک کاپی ۱۹۸۴ کسی سے ہم کو پڑھنے کے لیے ملی۔ ماشاء اللہ بہت ہی اچھا رسالہ ہے اور کافی علم کی باتیں معلوم ہوئیں۔ مولانا صاحب، یہاں یورپ میں اسلامی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ آپ ہر ماہ میرے نام الرسالہ بھیجیں اور جو کتابیں آپ کی ہیں وہ بھی سب بھیجیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ایک بار ہالینڈ ضرور ضرور آئیے (محمد سلطان خاں، ڈین ہاگ، ہالینڈ)

۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں قریب دو سال سے آپ کا الرسالہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ بیان سے باہر ہے کہ آپ کس قدر اس سوئی ہوئی قوم کو اپنے حقیقت پسند مضامین کے ذریعہ جگانا چاہتے ہیں۔ کاش یہ قوم پڑھ کر سمجھے۔ (شمشاد علی خاں ایڈوکیٹ، سہارن پور)

۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: ہر دلعزیز الرسالہ اس وقت پورے ہندستان میں ایک انقلاب پیدا کیے ہوئے ہے۔ ایک زمانہ میں جس طرح الہلال نے لوگوں کو جھنجوڑا تھا اسی طرح اس زمانہ میں الرسالہ وہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ منفی پہلو سے تھا اور یہ مثبت پہلو کو لیے ہوئے ہے۔ (مبین اسحٰق قاسمی، خطیب مسجد ایف سیکٹر، بمبئی)

۱۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: کئی ماہ سے الرسالہ کا مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ الرسالہ کے ذریعہ اس بگڑی ہوئی قوم کی ذہنی تعمیر کا بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے میں بہت سے اخبارات اور میگزین کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ مگر دوسرے اخبارات و رسائل نے غیر مسلموں کے خلاف زہر افشانی کر کے ذہن کو بالکل بگاڑ دیا تھا۔ میرے اندر ہمیشہ غیر مسلموں کے خلاف ایک قسم کا ٹنشن رہتا تھا۔ مگر جب سے میں نے الرسالہ کا مطالعہ شروع کیا اللہ کے فضل سے نفرت شفقت میں تبدیل ہو گئی ہے (اعجاز احمد وسیم، سیوان)

۱۲۔ اقوالِ حکمت نام کی کتاب چھپ چکی ہے۔ اس میں زندگی کی تعمیر سے متعلق اقوال درج کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کا نام انوارِ حکمت ہوگا۔ اس دوسری کتاب میں دینی اور روحانی قسم کے اقوال درج ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۳ جون ۱۹۹۰

فہرست

[illegible] 611128 697333

ایک واقعہ

۶ ستمبر ۱۹۸۹ کو میں انبیٹھ (سہارن پور) میں تھا۔ وہاں ایک واقعہ معلوم ہوا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صابری (پیدائش ۱۹۵۱) نے بستی کے باہر ۱۹۸۵ میں ایک زمین خریدی۔ اس کا رقبہ تقریباً پانچ ایکڑ ہے۔ انھوں نے زمین حاصل کرنے کے بعد اس کے چاروں طرف مینڈ بنائی۔ اس زمین سے متصل یہاں کا مرگھٹ ہے۔ مینڈ بنانے کے بعد کچھ ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ آپ نے مینڈ غلط بنائی۔ اس میں مرگھٹ کی زمین کا ایک حصہ شامل ہوگیا ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے وہ افراد تھے جو مقامی طور پر متعصب اور فرقہ پرست کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صابری نے کہا کہ آپ لوگ پیمائش کرالیں اور جتنی زمین پیمائش میں نکلے۔ اس کا دگنا لے کر مرگھٹ میں شامل کر لیجئے۔ یہ کام آپ مجھ سے پوچھے بغیر خود سے کرلیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اگست ۱۹۸۷ کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر شاہد صابری راستہ سے گزر رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ بہت سے ہندو آگے کی طرف جارہے ہیں۔ ملاقات کے بعد انھوں نے بتایا کہ آج ہم آپ کی زمین کو ناپنے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نے کہا کہ آپ لوگ ضرور جائیں اور ناپنے کے بعد مرگھٹ کی جو زمین ہماری طرف نکلے اس کو بلا بحث اس میں شامل کرلیں۔ ان لوگوں نے کہا کہ آپ بھی چلیے تاکہ آپ کے سامنے پیمائش کی جاسکے۔

ڈاکٹر شاہد صابری بھی کچھ دیر بعد اپنی زمین پر پہونچ گیے۔ انھوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ بلکہ ہندو صاحبان کو آزادانہ طور پر ناپنے کا موقع دیا۔ انھوں نے بار بار ناپا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ ان کا شبہ غلط تھا۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نے مینڈ بالکل صحیح بنائی ہے۔ بلکہ ایک طرف خود اپنی کچھ زمین مرگھٹ کی طرف چھوڑ دی ہے۔

اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد مقامی ہندوؤں نے ڈاکٹر شاہد صابری سے کہا کہ آپ انبیٹھ کی چیرمینی کے لیے کھڑے ہوجائیں۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ بلامقابلہ کامیاب ہوجائیں گے۔ مگر ڈاکٹر صابری نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

ایک اور امکان

آج کے جاپان کے بارہ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام ہے " جاپان جو یہ کہہ سکتا ہے کہ نہیں"۔ اس کتاب کے لکھنے والے دو ممتاز جاپانی ہیں۔ ایک سنتاروا شی ہارا جو دو بار جاپان میں وزیر رہ چکے ہیں۔ دوسرے اکیو مورتیا جو عالمی شہرت یافتہ سونی کارپوریشن کے چیرمین ہیں :

The Japan That Can Say No,
by Shintaro Ishihara, and Akio Morita

اس کتاب میں بہت سی نہایت سبق آموز باتیں ہیں۔ ایک موقع پر مصنفین لکھتے ہیں کہ امریکی خواہ اپنی فوجی طاقت کتنا ہی زیادہ بڑھائیں ، وہ اب ایک ایسی حد پر پہونچ چکے ہیں کہ وہ ہمارے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اب وہ خود ہمارے ضرورت مند ہیں۔ جاپان اگر امریکہ سے یہ کہہ دے کہ ہم تمہارے ہاتھ اپنے چپس (chips) نہیں بیچیں گے تو امریکہ کی کمپیوٹر انڈسٹری متاثر ہو جائے گی۔ حتی کہ امریکہ اپنا جدید بمبار (stealth bomber) بھی جاپانی ٹکنولوجی کے بغیر نہیں بنا سکتا۔ اس قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص جاپان کے سیمی کنڈکٹر کو استعمال نہ کرے تو اس کے لیے درست کارکردگی کی کوئی ضمانت نہیں :

If one doesn't use Japanese semi-conductors,
one cannot guarantee precision.

یہی اس دنیا میں زندگی کا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں زندگی کا مقام اس کو ملتا ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے لیے ناگزیر بنا دے۔ جو اپنے نفع بخش ہونے کو اس طرح ثابت کر دے کہ دوسرے لوگ اس کو اپنی ضرورت سمجھنے لگیں۔ کوئی شخص خود اپنا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو شخص یا گروہ اپنے آپ کو دوسروں کی ضرورت بنا دے ، اس کو نظر انداز کرنا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔

جاپان نے اپنی اہمیت مادی اور اقتصادی اعتبار سے ثابت کی ہے۔ یہی اہمیت زیادہ بڑے پیمانہ پر اسلام کے حق میں موجود ہے۔ جس طرح جاپان کی نفع بخشی کی بنا پر امریکہ (یا دوسرے ممالک) اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اسلام میں دینی اور انسانی اعتبار سے جو غیر معمولی نفع بخشی موجود ہے ، اگر دنیا کے لوگ

اسس کو جان لیں تو ان کے لیے اسلام کو نظر انداز کرنا ممکن نہ رہے۔

یہ دوسری صورت اسلام کے حق میں اجارہ داری کی حد تک موجود ہے۔ انسان کا مطلوب دین اور انسانیت کی حقیقی فلاح اسلام کے سوا کسی اور مذہبی یا غیر مذہبی نظام میں موجود نہیں۔

اسلام آج اپنی خاموش زبان میں دنیا والوں سے کہہ رہا ہے کہ ـــــ اگر تم اللہ کی یاد کو اپنے سینہ میں جگہ نہ دو تو تم کو قلب و دماغ کا سکون نہیں مل سکتا۔ اگر تم توحید کے عقیدہ کو نہ مانو تو تم کائنات کی کوئی قابل فہم توجیہہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم اسلام کو اختیار نہ کرو تو تم کہیں اور وہ مذہب نہیں پا سکتے جو مسلّمہ تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

اسلام پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم اسلام کے تصورِ انسان پر ایمان نہ لاؤ تو تم کبھی سماج کے اندر برابری کا نظام قائم نہیں کر سکتے۔ اگر تم یوم الحساب کے عقیدہ کا اقرار نہ کرو تو انسانی اصلاح کے لیے تم کوئی دوسری فکری بنیاد وضع نہیں کر سکتے۔ اگر تم اسلامی تاریخ کو تسلیم نہ کرو تو اعلیٰ اخلاقی معیار کے لیے تم حقیقی انسانی نمونے کہیں اور نہیں پا سکتے۔

جاپان کے امکانات کو ایک جاندار قوم نے واقعہ بنایا۔ ایک ایسی قوم جو تمام ناخوش گواریوں پر صبر کرتے ہوئے چالیس سال جدوجہد کر سکتی تھی۔ اسی طرح اسلام کے عظیم تر امکانات کو واقعہ بنانے کے لیے بھی ایک زندہ قوم درکار ہے۔ مگر یہ زندہ قوم آج کہیں موجود نہیں۔ اس لیے اسلام کا امکان بھی جدید دنیا میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔

چالیس سال بعد

نکولا چاؤسسکو (Nicolae Ceausescu) رومانیہ کا کمیونسٹ لیڈر تھا۔ ۱۹۴۸ میں وہ رومانیہ کا وزیر زراعت بنا۔ اس کے بعد وہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۷ میں وہ رومانیہ کا صدر بن گیا۔ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اس نے ہر ممکن کارروائی کی۔ اسی میں یہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی ایلینا (Elena) کو نائب صدر بنایا اور بیشتر کلیدی عہدوں پر اپنے رشتہ داروں کو بٹھا دیا۔

چاؤسسکو نے طاقت کے ذریعہ اپنے تمام مخالفین کو کچل دیا۔ رومانیہ کے مشہور شاعر ایڈرین پاؤنیسکو کے ذریعہ اس نے ایک نظم تیار کرائی جو "نغمہ رومانیہ" کہی جاتی تھی۔ اس میں چاؤسسکو کو "رومانوی قوم کا سب سے زیادہ محبوب فرزند" قرار دیا گیا تھا۔ یہ نظم روزانہ مختلف مواقع پر سارے رومانیہ میں پڑھی جاتی تھی۔ رومانیہ کے لوگوں کو یہ بات ناپسند تھی کہ ملک کے تمام وسائل صرف ایک شخص کے اوپر وقف کر دیے جائیں۔ آخرکار دسمبر ۱۹۸۹ میں یہ لاوا پھٹ پڑا۔ عوام اور فوج دونوں نے چاؤسسکو کے خلاف بغاوت کر دی۔ چاؤسسکو نے اپنی حفاظت کے لیے اتنی بڑی پولیس بنا رکھی تھی جو فوج سے بھی زیادہ طاقت ور تھی۔ چنانچہ سخت تصادم ہوا۔ ستر ہزار آدمی مر گئے۔ اور تین سو ہزار آدمی زخمی ہوئے۔

چاؤسسکو اپنے وسیع محل میں ہر وقت ایک ہیلی کاپٹر تیار رکھتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب وہ اپنے اقتدار کو بچا نہیں سکتا تو وہ ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ اس کا ہیلی کاپٹر مار کر گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر اتر کر زیر زمین پناہ گاہ (bunker) میں داخل ہو کر چھپ گیا۔ تاہم وہ یہاں بھی پکڑ لیا گیا اور عین کرسمس کے دن ۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ کو چاؤسسکو اور اس کی بیوی ایلینا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ——— آسمان نے بھی اس کو جگہ دینے سے انکار کر دیا اور زمین نے بھی۔

چاؤسسکو اسٹالنسٹ اشتراکی تھا۔ وہ مذہب کا انتہائی سخت دشمن تھا۔ بخارسٹ کا ریڈیو اناؤنسر اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے چلا اٹھا، اس نے کہا کہ اف، کیسی حیرت ناک خبر ہے۔ مسیح دشمن عین کرسمس کے دن مر گیا:

Oh, what wonderful news. The anti-Christ died on Christmas Day.

اس طرح کے واقعات ۱۹۸۹ میں کثرت سے پیش آئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظالم انسانوں نے مذہب کے خلاف جو قلعے بنائے تھے، وہ خدا کی طرف سے مسلسل ڈھائے جا رہے ہیں۔

روس میں سرکاری طور پر مذہب کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مگر حالات کا دباؤ اتنا بڑھا کہ روس کی اشتراکی حکومت کو اپنے یہاں مذہبی آزادی کا اعلان کرنا پڑا۔ سوویت روس کے وزیراعظم میخائیل گورباچوف نے خود ویٹیکن پہونچ کر پوپ سے ملاقات کی۔ مشرقی جرمنی میں مذہب کو بظاہر مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا۔ مگر وہ بالآخر سیلاب بن گیا اور برلن دیوار (Berlin wall) توڑ کر باہر آگیا۔ چاؤسسکو اپنے سارے اقتدار اور اہتمام کے باوجود بری طرح ہلاک کر دیا گیا۔ وغیرہ

اس طرح براہ راست خدا کی طرف سے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے مواقع کھولے جا رہے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر زبان میں قرآن اور حدیث اور سیرت پر سادہ اور سائنٹفک انداز کی کتابیں تیار کرکے تمام قوموں میں پھیلا دیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اسلام کے نام پر کافی سرگرمی دکھائی ہے۔ مگر یہ سرگرمیاں زیادہ تر سیاست رخی رہی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ تمام سرگرمیوں کو دعوت و تبلیغ کے رخ پر چلایا جائے۔ آج کے انسان کو "سیاسی مذہب" سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ "روحانی مذہب" کا متلاشی ہے۔ وہ اپنی فطرت میں اٹھنے والی طلبِ خداوندی کا جواب چاہتا ہے۔ اگر اس وقت جدید انسان کے سامنے اسلام کو اس کی سادہ اور فطری صورت میں پیش کر دیا جائے تو انسان محسوس کرے گا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو وہ اپنے اندرونی تقاضے کے تحت تلاش کر رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری اسباب مہیا کر دیے ہیں۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اٹھیں اور اسلام کو ہر خیمہ اور ہر گھر میں پہونچا دیں۔

ناکامیوں کے بعد

ظہیر الدین محمد بابر (۱۵۳۰ - ۱۴۸۳) فرغانہ میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اِس وقت سوویت روس (ازبیک) میں شامل ہے۔ باپ کے واسطہ سے اس کا سلسلہ نسب تیمور سے ملتا ہے اور ماں کے واسطہ سے چنگیز خاں سے۔ بابر کا باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ کا حاکم تھا۔ اُس وقت یہ مقام کوہ ہندوکش کے شمال میں ایک چھوٹے پرگنہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

فرغانہ کے پڑوس میں سمرقند تھا جو تیمور کی قدیم راجدھانی تھا۔ یہاں محمد شیبانی خاں کی حکومت تھی جو چنگیز خاں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ بابر کا باپ مستقل اس کوشش میں رہا کہ وہ سمرقند کو فتح کرکے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ باپ کی وفات پر ۱۴۹۴ میں بابر فرغانہ کا حاکم بنا جب کہ اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ باپ کی پیروی میں اس نے سمرقند پر قبضہ کرنے کے لیے اس پر کئی حملے کیے۔ مگر ۱۵۰۱ میں اس کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ اس نے خود اپنی موروثی سلطنت فرغانہ کو بھی کھو دیا۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ ایک کم سن بادشاہ کی حیثیت سے بابر نے فرغانہ کو کھو دیا۔ وہ مصیبتوں کے ایک دور میں داخل ہو گیا۔ اس کو خود اپنے پدری اور مادری چچاؤں سے لڑائی لڑنی پڑی۔ مگر ۲۰ سالہ مصیبت اور جنگ کے دوران اس نے اپنے حریفوں (ترک، مغل، ایرانی اور افغانی) سے کامیاب جنگی تدبیریں اور حربی طریقے سیکھ لیے۔ اس نے ان طریقوں میں سائنٹفک امتزاج پیدا کیا۔ سالہا سال کی شکستوں اور وطن سے محرومی اور طرح طرح کی مشکلات کے نتیجہ میں وہ ایک اچھا فوجی جنرل بن گیا۔ اپنے باپ دادا کے علاقہ کو حاصل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی ناکامی کے بعد بابر نے اپنی توجہ ہندستان کی طرف موڑ دی:

As a boy king he lost Farghana and passed through a period of adversity, having to fight his own paternal and maternal uncles. During 20 years of adversity and warfare Babur trained himself by appropriating military tactics and modes of warfare of his adversaries – Turks, Mongols, Persians, and Afghans, and he made a scientific synthesis of these systems. He became a good general through a career of many defeats and through years of homeless wanderings, privations and hardships... Foiled in his design of recovering his ancestral domain in Central Asia, Babur turned his attention to India. (9/378).

بابر نے پہلی بار ۱۵۱۹ میں ہندستان پر حملہ کیا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرکے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنے وطن فرغانہ کو اس نے ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے چھوڑا تھا، مگر ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ کو آگرہ میں جب اس کا انتقال ہوا تو تاریخ اس کو اپنے صفحات میں ایک فاتح بادشاہ کی حیثیت سے درج کر چکی تھی۔

بابر کو کامیابی اس حوصلہ مندانہ عمل کی بنا پر ہوئی کہ اس نے اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کیا۔ اس نے خود ناکامی کے اندر وہ پہلو تلاش کرلیے جو اس کو عظیم تر کامیابی کی طرف لے جانے والے ہوں۔

بابر کو جب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو اس نے شکایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ان کی سازشوں اور ان کے تخریبی منصوبوں کی فہرست مرتب کرنے لگے۔ وہ اپنے حریفوں کے خلاف لفظی گولہ باری میں مشغول ہو جائے۔

اس کے بجائے بابر نے اپنا ذہن اس سوچ میں لگایا کہ میرے حریفوں کو میرے مقابلہ میں کامیابی کیونکر حاصل ہوئی۔ میری ہار اور ان کی جیت کا سبب کیا تھا۔ بابر کی اس سوچ نے اس کو بتایا کہ اس کے حریف زیادہ کارگر تدبیروں کو جانتے تھے۔ انھوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کرکے اس کو ناکام بنا دیا۔

اب بابر نے اپنے حریف کے حربوں اور ان کی تدبیروں کو اپنانا شروع کیا۔ اس نے مزید غور و تجربہ کے ذریعہ ان کو مزید ترقی یافتہ بنایا۔ اس طرح زیادہ بہتر طور پر مسلح ہو کر اس نے ایک نئے وسیع تر میدان (برصغیر ہند) کی طرف رخ کیا۔ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ اپنے وطن میں اس نے جتنا کھویا تھا، اس سے بہت زیادہ اس نے وطن کے باہر حاصل کرلیا۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامیوں کا پیش آنا لازمی ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اپنی ناکامی کو اپنے لیے غذا بنا سکے۔ وہ کھونے میں پانے کا راز دریافت کرلے۔

بے ترتیب نماز

ایک شخص اگر ایسا کرے کہ وہ نماز پہلے پڑھ لے اور وضو اس کے بعد کرے تو ایسے آدمی کو نماز پڑھنے والا نہیں کہا جائے گا ۔ شریعت کی نظر میں وہ ایک سرکش آدمی ہے نہ کہ نمازی آدمی ۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی بے ترتیب نما پڑھے تو اگرچہ وہ بظاہر نماز کے تمام اجزا کو دہرا رہا ہوگا مگر اس کی بے ترتیبی اس کی نماز کو باطل کر دے گی ۔ کوئی بھی عالم یا فقیہ اس کو نمازی تسلیم نہیں کرے گا ۔

دنیا میں آپ کو ایسا کوئی مسلمان نہیں ملے گا جو اس قسم کی بے ترتیب نماز پڑھے ۔ کیوں کہ وہ نماز کے معاملہ میں اس مسئلہ کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ اس کو یقین ہے کہ ایسی بے ترتیب نماز خدا کے یہاں قبول ہونے والی نہیں ۔ مگر ایک اور معاملہ میں ہر جگہ کے مسلمان اسی قسم کی " نماز " پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے " نماز " پڑھ لیں ، اور اس کے بعد " وضو " کریں ۔ اس تبدیلی (یا تحریف) کے باوجود ان کو مجاہد اسلام کا خطاب مل رہا ہے ۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعلان کے مطابق ، اسلامی حکومت یا اسلامی نظام قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے آپ نے لمبی مدت تک رات دن محنت کرکے لوگوں کا ذہن بنایا ۔ اس کے بعد اسلامی قانون کا نفاذ کیا ۔ مگر موجودہ زمانہ کے مجاہدین اسلام اس کے برعکس یہ چاہتے ہیں کہ پہلے حکومت پر قبضہ کریں ، اس کے بعد افراد کا ذہن بنائیں ۔

ان کا کہنا ہے کہ پہلے ملک حاصل کرو ، اس کے بعد اسلامی زندگی کی تعمیر کرو ۔ پہلے فاسد حکمرا کو ہلاک کرو ، اس کے بعد صالح قیادت پیدا کرو ۔ پہلے سینما ہاؤس کی عمارت کو توڑو ، اس کے بعد سینما بینی کا خاتمہ کرو ۔ پہلے سیاسی تبدیلی لے آؤ ، اس کے بعد افراد کا ذہن بدلو ۔ پہلے وزارت اعلام پر قبضہ کرو ، اس کے بعد وسائل اعلام کو اسلام کے لیے استعمال کرو ۔

اس قسم کی تمام کارروائیاں " پہلے نماز اور اس کے بعد وضو " کی مصداق ہیں ۔ معروف نماز کی ترتیب چونکہ تسلسل کے ساتھ زمانۂ نبوت سے چلی آرہی ہے ، اس لیے تسلسل اور تواتر نے اس کی ہیئت کو لوگوں کی نظر میں اٹل بنا دیا ہے ۔ وہ اس کے خلاف سوچنے کی جرأت نہیں کرتے ۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت کے قیام کے بارے میں اس قسم کا عملی تواتر یا مسلسل مشاہدہ موجود نہیں ۔ اس لیے اس کی ترتیب کا معاملہ لوگوں کو ا

طرح اہل نظر نہیں آتا جیسا کہ نماز کا نظر آتا ہے۔ حالاں کہ شرعی حکم یا سنتِ رسول ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

" پہلے اقتدار اور اس کے بعد ذہن سازی" کا نظریہ اگر صحیح ہوتا تو خدا کے تمام پیغمبر سب سے پہلے اس نظریہ پر عمل کرتے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ مواقع ملنے کے باوجود انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے لوگوں کی طرف سے یہ پیش کش کی گئی کہ اگر آپ اپنی اس دعوت کے ذریعہ حکومت کے طالب ہیں تو ہم آپ کو اپنے اوپر حاکم بنا لیتے ہیں (وان کنت تريد به ملكا ملكناك علينا، سيرة ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۵) مگر آپ نے حکومت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ اقتدار سے الگ رہ کر توحید اور آخرت کے عقیدہ کو لوگوں کے دلوں میں داخل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصر میں مبعوث کیا۔ وہاں آپ نے فرعون کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ لمبے عرصہ تک آپ جدوجہد کرتے رہے۔ مگر فرعون نے آپ کی دعوت قبول نہ کی۔ یہاں تک کہ اللہ کی نظر میں وہ قابل سزا ٹھہرا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کا پورا لشکر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ فرعون کی فوجی طاقت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔

اب حضرت موسیٰ کے لیے موقع تھا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ لوٹ آئیں اور مصر کے خالی تخت پر بیٹھ جائیں۔ وہ مصر کے شاہی محل اور اس کے ایوانِ حکومت پر قبضہ کر لیں۔ اس طرح اقتدار حاصل کر لینے کے بعد وہ مصر کے لوگوں کا یا بنی اسرائیل کا ذہن بدلنے کا کام کریں۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا۔ مصر میں سیاسی قبضہ کے مواقع ہونے کے باوجود وہ مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا میں چلے گیے۔ اور وہاں دعوتی انداز میں بنی اسرائیل کی اصلاح و تربیت کا کام کرتے رہے۔ تربیت کا یہ کام جب ۴۰ سال میں مکمل ہو گیا، اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں سیاسی اور فوجی اقدام کیا، اور عمالقہ کو مغلوب کر کے شام و فلسطین پر اپنی حکومت قائم کی۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ریڈیو اور ٹیلی وژن جیسی چیزوں کی ایجاد نے ہمارے لیے نئے مواقع پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ ذہن سازی کے نہایت وسیع اور کارگر ذرائع ہیں۔ مگر ان کو استعمال کرنے کے لیے اقتدار کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے آج کی ضرورت یہ ہے کہ پہلے اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے، اس کے بعد نیوز میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کو استعمال کر کے عوام کی دینی تربیت کی جائے۔ اس طرح خود ذہن سازی

کے کام کا تقاضا ہے کہ پہلے اقتدار پر قبضہ حاصل کیا جائے تاکہ تربیت عوام کے اس موثر ذریعہ کو اسلام کے حق میں استعمال کیا جا سکے۔

مگر یہ محض خوبصورت الفاظ ہیں۔ اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح وضو اور نماز کی ترتیب ابدی ہے اسی طرح ذہنی انقلاب اور حکومتی انقلاب کی ترتیب بھی ابدی ہے۔ دورِ اوّل میں جس طرح انقلاب لایا گیا، بعد کے دور میں بھی اگر انقلاب لایا جا سکتا ہے تو اسی طرح لایا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا دوسرا ہر طریقہ وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تجربات اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مثال کے طور پر جنرل محمد ضیاء الحق نے ۱۹۷۷ میں پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور ساڑھے گیارہ سال کی طویل مدت تک پاکستان کے مطلق حکمراں بنے رہے۔ پاکستان کے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد، دوسری بہت سی کارروائیوں کے علاوہ انھوں نے یہ کیا کہ ایک اسلام پسند لیڈر (محمود اعظم فاروقی) کو اطلاعات ونشریات کے محکمہ کا وزیر بنا دیا۔

اس کے بعد وہ مہم پوری طرح جاری کر دی گئی جس کو میڈیا کے ذریعہ عوام کی ذہنی تربیت کہا جاتا ہے۔ مگر طویل کوشش کے باوجود اس کا ایک فی صد فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ پاکستان کا معاشرہ مزید بگڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ضیاء الحق صاحب کی موت کے بعد پاکستان کا جو پہلا الکشن (نومبر ۱۹۸۸) ہوا، اس میں پاکستان کے عوام نے اسلامی نظام کے حامیوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو مرکزی اقتدار پر بٹھا دیا جو بالاعلان طور پر سیکولر نظام کے حامی تھے۔

صحابی کا طریقہ

مکی دور کے آخری زمانہ میں مخالفین کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اجازت دیدی کہ ان میں سے جو لوگ چاہیں وہ سمندر پار ملک حبش چلے جائیں۔ چنانچہ ایک سو سے زیادہ آدمی مکہ چھوڑ کر حبش چلے گیے۔

یہ اسلامی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے اور بہت سے واقعات اس سے وابستہ ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان حبش میں پُر امن طور پر رہ رہے تھے۔ ان کی پاکیزہ سیرت کے نتیجہ میں وہاں کا بادشاہ نجاشی بھی ان کی نہایت عزت کرتا تھا۔ اس درمیان میں ایک حادثہ پیش آیا۔

امام احمد نے امّ سلمہ سے روایت کیا ہے کہ ہم لوگ حبش میں بہتر ملک اور بہتر پڑوسیوں کے درمیان تھے کہ نجاشی کے ایک حریف بادشاہ نے اس کے اوپر چڑھائی کر دی۔ ہم لوگوں کو اس کا بہت زیادہ دکھ ہوا۔ نجاشی اپنی فوج کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلا۔ یہاں تک کہ وہ دریائے نیل کے اس پار چلا گیا۔

چند دن کے بعد اصحابِ رسولؐ نے آپس میں کہا کہ ہم میں سے کسی شخص کو مقام جنگ پر جانا چاہیے اور وہاں سے خبر لانا چاہیے۔ زبیر بن عوام نے کہا کہ میں جاؤں گا۔ وہ اس وقت نوجوان تھے:

قالت فنفخوا له قِربة فجعلها في صدره فَسَبَحَ عليها حتى خرج الى ناحية النيل التي بها ملتقى القوم ثم انطلق حتى حضرهم

امّ سلمہ کہتی ہیں کہ لوگوں نے ان کے لیے ایک مشک میں پھونک مار کر ہوا بھری۔ پھر انھوں نے اس کو اپنے سینہ پر باندھا۔ اس کے بعد وہ نیل میں داخل ہوئے اور اس کے سہارے سے تیر کر دریا کے دوسری جانب پہونچے جہاں میدانِ مقابلہ قائم تھا۔ پھر وہ مزید چلے یہاں تک کہ وہ ان لوگوں تک پہونچ گیے۔

حضرت امّ سلمہؓ مزید بتاتی ہیں کہ ہم لوگ نجاشی کے لیے دعا کرتے رہے کہ اس کو فتح ہو اور

اس کو اپنے ملک میں استحکام حاصل ہو۔ خدا کی قسم، ہم اسی حال میں تھے کہ زبیر بن عوام واپس آئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم لوگوں کو بشارت ہو، اللہ نے نجاشی کو فتح دی اور اس کے دشمن کو ہلاک کر دیا۔ اس خبر کو سن کر ہم لوگ اتنا خوش ہوئے جتنا کبھی خوش نہیں ہوئے تھے (الجزء ا صفحہ ۵۳-۳۵۲)

مشک میں ہوا بھر کر اس کو تیرنے کے لیے بطور معاون استعمال کرنا عین وہی چیز ہے جو موجودہ زمانہ میں لائف بوائے (lifebuoy) کہا جاتا ہے۔ جدید لائف بوائے کی بہت سی قسم ہیں۔ قدیم مشک گویا اسی تکنیک کی سادہ اور ابتدائی صورت تھی۔

مکہ میں دریا نہ تھا، اس لیے مکہ میں اس تدبیر کا رواج نہیں ہو سکتا۔ گمان غالب یہ ہے ان مسلمانوں نے حبش میں اس تدبیر کو معلوم کر کے اس کو استعمال کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ نئی چیزوں کی تلاش کا کتنا زبردست جذبہ ان مسلمانوں کے اندر ابھر آیا تھا۔

حضرت زبیر ابن عوام ایک صحابی رسول تھے۔ ان کے اندر بلاشبہ کامل اور معیاری ا پایا جاتا تھا۔ مگر اپنے سینہ میں اعلیٰ ترین اور طاقت ور ترین ایمان کا سرمایہ رکھنے کے باوجود ا نے ایسا نہیں کیا کہ بس جوش کے تحت دریا میں کود پڑیں۔ وہ کہیں کہ ہمارے پاس ایمان کی دو موجود ہے، اس لیے اب ہم کو مزید کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔

انھوں نے اس قسم کے جوشِ ایمان کا مظاہرہ کرنے کے بجائے یہ کیا کہ زمانہ کے مطا تیراکی کی تدبیر دریافت کی اور اس کو عین اس طرح استعمال کیا جس طرح دوسرے غیر مسلم لو اس کو استعمال کر رہے تھے۔ وہ دریا میں کودے، مگر تدبیری اہتمام کے ساتھ۔ وہ اپنے ا جذبہ کے تحت متحرک ہوئے، مگر اسباب کی ضروری شرطوں کو پورا کر لینے کے بعد۔

یہ صحابہ کا اسلام تھا۔ اور اسلام بلاشبہ وہی ہے جو صحابہ نے اختیار کیا۔

مقام کیسے ملا

حمزہ بن عبد المطلب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ ان کے متعلق اسلامی تاریخ میں آگیا کہ حمزہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے ذریعہ اللہ نے دین کو طاقت دی (کان حمزۃ ممن اعز اللہ بہ الدین)، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، المجلد الاول، صفحہ ۴۴۶) حضرت حمزہ کو یہ مقام بلا سبب ں مل گیا۔ بلکہ وہ ان کے حقیقی عمل کے نتیجہ میں انھیں حاصل ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حکم ہوا کہ اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کو آگاہ کرو (الشعراء ۲۱۴) آپ نے خصوصی طور پر حمزہ کے سامنے دین توحید کو پیش کیا۔ مگر ان کے ذہن پر باپ دادا کے دین کا اتنا ہ تھا کہ ابتداء میں کئی سال تک اسلام کی صداقت ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ آخر کار نبوت کے چھٹے ال انھوں نے اسلام قبول کیا۔

ایک روز وہ شکار کھیل کر واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ عین اس وقت ایک ورت نے آکر ان سے کہا کہ ابھی میں نے صفا پہاڑی کے پاس محمد کو دیکھا ہے۔ وہاں عمرو بن ہشام ابوجہل) بھی تھا اور وہ تمہارے بھتیجے کو گالی دے رہا تھا اور بہت زیادہ برا کہہ رہا تھا۔ حمزہ خاندانی یرت کے تحت گھر سے نکلے۔ کعبہ میں انھوں نے ابوجہل کو پالیا۔ وہ ابھی تک غصہ میں تھے۔ انھوں نے ہے کی کمان ابوجہل کے سر پر اتنے زور سے ماری کہ خون نکل آیا۔ انھوں نے ابوجہل سے کہا کہ تم میرے تیجے کے دشمن بنے ہوئے ہو۔ تو سن لو کہ میرا دین بھی وہی ہے جو محمد کا دین ہے (دینی دین محمد) بوجہل کا تعلق قبیلہ بنو مخزوم سے تھا اور حمزہ کا تعلق قبیلہ بنو ہاشم سے۔

گھر واپس آئے تو قوم کے کچھ لوگ ان سے ملے۔ انھوں نے حمزہ کو شرم دلائی کہ تم صابی (بددین) ہو گئے۔ تم نے اپنے باپ دادا کے طریقہ کو چھوڑ دیا۔ ایک بھتیجے کی خاطر تم قوم کے تمام اکابر سے کٹ گئے وغیرہ۔ اس طرح کی باتوں سے حمزہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں شبہ ہونے لگا کہ شاید میں نے خاندانی حمایت کے جوش میں آکر غلطی کر دی ہے۔ وہ رات بھر بے چین رہے۔ انھیں ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح ہوئی تو اسی بے چینی کے عالم میں خانہ کعبہ میں گئے۔ وہاں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے پورے تضرع اور انابت کے ساتھ دعا کی:

ماصنعتُ اللّٰھمّ إن کانَ رُشداً فاجعلْ تصدیقہ فی قلبی وَ اِلّا فاجعل لِی مِمّا وقعتُ فیہ مَخرجاً (صفحہ ۴۴۶)

میں نے جو کچھ کیا، اے اللہ اگر وہ ہدایت ہے اس کی تصدیق میرے دل میں ڈال دے۔ ورنہ جس میں پڑ گیا ہوں اس سے میرے لئے نکلنے کی صورت پیدا فرما۔

اسی کے ساتھ اگلے دن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ انھوں نے آپ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے میں ایک معاملہ میں پڑ گیا ہوں۔ اور اس سے نکلنے کی صورت مجھے نظر نہیں آتی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ہدایت ہے یا گمراہی ہے۔ اس لئے آپ اس معاملہ میں مجھے بتائیے۔ اے بھتیجے میں تم سے اس معاملہ میں سننا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے ان کو نصیحت کی انھیں خوف دلایا اور ان کو اللہ کے انعام کی خوش خبری دی۔ اس کے بعد اللہ نے ان کے دل میں یقین ڈال دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صادق ہیں۔ اے میرے بھتیجے، اپنے دین کا اعلان عام کرو۔ خدا کی قسم، اگر مجھے وہ سب کچھ دیا جائے جس پر آسمان نے سایہ کیا ہے، تب بھی میں اس دین کو نہیں چھوڑوں گا (صفحہ ۴۴۶)

اس کے بعد حضرت حمزہ آپ کے مکمل ساتھی بن گئے۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ ایک دولت مند شخص تھے اسلام میں آنے کے بعد ان کی دولت ختم ہوگئی۔ انھیں اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا۔ اسلام کی خاطر انھیں اپنی قوم سے لڑائی لڑنی پڑی۔ یہاں تک کہ احد کی جنگ میں وہ شہید ہوگئے۔ تاہم آخر تک وہ پوری وفاداری کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ رہے۔

یہ وہ عظیم سعادت ہے جو حضرت حمزہ کو حاصل ہوئی۔ تاہم یہ سعادت انھیں سادہ طور پر نہیں مل گئی انھوں نے اپنے غیرت کے جذبات کو خدا کے دین کے لئے استعمال کیا۔ جب شیطان نے ان کے اندر شبہ ڈالا تو انھوں نے اس شبہ کو قبول نہیں کرلیا، بلکہ اس کے لئے گریہ و زاری کے ساتھ دعائیں کیں۔ رسول اللہؐ سے مل کر اس کی وضاحت معلوم کی۔ اور جب بات واضح ہوگئی تو پھر کوئی چیز ان کے لئے اعتراف میں مانع نہیں ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف کھلے دل سے اعتراف کیا بلکہ ہر نقصان اور مصیبت کو برداشت کرتے ہوئے برابر اس پر قائم رہے۔

یہ ہے حضرت حمزہ کی وہ قربانی جس کے نتیجہ میں ساری دنیا کے مسلمان ہر ہفتہ جمعہ کے خطبہ میں "سید الشہداء حمزہ" کہہ کر ان کی دینی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس میں سبق ہے

مولانا اکرام الدین قاسمی (پیدائش ۱۹۳۸) ڈمراواں (ضلع بھاگل پور) کے رہنے والے ہیں۔ ۷ فروری ۱۹۹۰ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے کچھ واقعات بتائے جن میں بہت بڑا سبق ہے۔

۱۹۶۶ کا واقعہ ہے۔ مولانا اکرام الدین صاحب نے گنگا کو اسٹیمر سے پار کیا۔ وہ براری ریلوے شیشن پر بھاگل پور جانے والی پسنجر ٹرین پر سوار ہو گئے۔ ٹرین میں بھیڑ تھی۔ ایک جگہ سیٹ پر ڈالڈہ کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ وہ ڈبہ کو کھسکا کر وہاں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ہندو نوجوان آیا۔ یہ ڈبہ اسی کا تھا۔ وہ اس کو سیٹ پر رکھ کر باہر چلا گیا تھا۔ جب اس کو اندازہ ہوا کہ ڈبہ اپنی جگہ سے ہٹایا گیا ہے تو اس نے پوچھا کہ اس کو کس نے ہٹایا ہے۔ مولانا اکرام الدین صاحب نے کہا کہ میں نے ہٹایا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ سخت غصہ ہو گیا۔ کیوں کہ اس کے عقیدہ کے مطابق ایک مسلمان نے اس کو چھو کر اس کو گندہ کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس ڈبہ میں گنگا جل تھا۔ اس کو لے کر میں دیوگھر جا رہا تھا۔ اس کو تم نے اَپوتر کر دیا۔ اب وہ لے جانے کے قابل نہیں رہا۔

وہ غصہ میں آپے سے باہر تھا۔ اور نہایت گرم اور اشتعال انگیز لہجہ میں بار بار کہہ رہا تھا کہ تم نے میرے گنگا جل کو اپوتر کر دیا۔ مولانا اکرام الدین صاحب نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سیٹ نوجوان کے لئے خالی کر دی۔ انھوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس ڈبہ میں گنگا جل ہے۔ اور وہ میرے چھونے سے اپوتر ہو جائے گا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دو۔

ہندو نوجوان ان کے خلاف برستا رہا اور وہ خاموشی سے کسی ردعمل کے بغیر اس کو سنتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر ڈبہ کے تمام ہندو اس نوجوان کے خلاف ہو گئے۔ اور مولانا اکرام الدین صاحب کی حمایت کرنے لگے۔ انھوں نے نوجوان سے کہا کہ مولانا جب چپ ہیں اور اپنی غلطی مان رہے ہیں تو تم کیوں ان کے خلاف اتنا زیادہ چیخ رہے ہو۔ انھوں نے مولانا اکرام الدین صاحب سے کہا کہ آپ بالکل مطمئن رہئے۔ یہ آپ کا کچھ نہیں کر سکتا۔

آخر کار ہندو نوجوان چپ ہو گیا۔ مولانا اکرام الدین صاحب اپنی جگہ برابر کھڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بے رخی کے ساتھ مولانا اکرام الدین صاحب سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔ انھوں

نے بتایا کہ کھڑک باز ار سے (اس وقت مولانا اسی مقام پر رہتے تھے) نوجوان نے کہا کہ کھڑک باز ار میں ایک مولانا اکرام الدین ہیں ۔ کیا آپ ان کو جانتے ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میری ماں ان کے پاس گئی تھی اور ان سے تعویذ لائی تھی۔ اس تعویذ سے بہت فائدہ ہوا۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

مولانا اکرام الدین صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ابھی تو وہ سفر میں ہیں۔ کل تک وہ وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ ہندو نوجوان نے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم کہ وہ سفر میں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جس مسافر سے تم بات کر رہے ہو وہی مولانا اکرام الدین ہیں۔

یہ سنتے ہی ہندو نوجوان نے مولانا اکرام الدین کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس نے کہا کہ مجھے چھما کر دیجئے مجھ سے بہت بھاری غلطی ہو گئی۔ اس غلطی پر جی چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو مار لوں۔ وہ نوجوان اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اصرار کر کے مولانا اکرام الدین صاحب کو اپنی جگہ بٹھا دیا۔ اس کے بعد وہ آخری اسٹیشن تک برابر کھڑا رہا۔ اگلے اسٹیشن پر جب دونوں اترے تو نوجوان نے اصرار کر کے مولانا کو ناشتہ کرایا۔

مولانا اکرام الدین صاحب نے اس طرح کے اور کئی واقعات سنائے اور کہا کہ ہندوؤں میں ہم نے جو اخلاق پایا وہ اخلاق ہم نے موجودہ مسلمانوں میں نہیں پایا۔

اسی طرح انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۲ میں میں تراویح سنانے کے لئے بنگلور گیا ہوا تھا۔ ایک روز میں بنگلور سے کورم پلی بذریعہ اسکوٹر جا رہا تھا۔ راستہ میں میرے اسکوٹر کا پٹرول ختم ہو گیا۔ کچھ دور تک میں اسکوٹر کو دھکیل کر لے گیا۔ پھر سڑک کے کنارے ناریل کا ایک باغ دکھائی دیا۔ اس کے اندر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں باغ کے اندر گیا۔ وہاں ایک ہندو بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے اپنے آدمی سے کہا کہ ایک کرسی لے آؤ۔ مجھ کو کرسی پر بٹھا کر پوچھا کہ حضرت کیا کام ہے۔ میں نے کہا کہ میری گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے آٹھ کیلومیٹر دور جانے پر مجھے پٹرول مل سکے گا۔ میں کار دیکھ کر یہاں آگیا کہ شاید یہاں سے مجھے پٹرول مل جائے۔

مذکورہ ہندو نے فوراً اپنے ڈرائیور سے کہا کہ دیکھو اگر باہر پٹرول ہو تو اس کو حضرت کی گاڑی میں ڈال دو۔ اور اگر باہر نہ ہو تو اپنی گاڑی میں سے نکال کر ان کو پٹرول دے دو۔ پٹرول لینے کے بعد میں نے اپنی جیب سے بیس روپیہ کا نوٹ نکالا تا کہ پٹرول کی قیمت ادا کروں۔ اب ہندو

ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ہم کو معاف کیجئے۔ پیسہ کی ضرورت نہیں۔ ہم کو بس آپ کی دعا چاہئے۔

انسان کو غصہ نہ کیجئے۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ غصہ ہو جائے تو جوابی غصہ نہ کرکے اس کو ٹھنڈا کر دیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جس کو آپ اپنا دشمن سمجھ رہے تھے، وہ آپ کے لئے ایسا ہو گیا ہے جیسے کہ وہ آپ کا قریبی دوست ہو۔

ہر آدمی خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اس دنیا میں کوئی آدمی نہیں جس کو خدا کے علاوہ کسی اور نے پیدا کیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر وہی فطرت ہے جو کسی دوسرے کے اندر ہے۔ ہر آدمی کے اندر اچھے اور برے کی وہی تمیز موجود ہے جو کسی دوسرے کے اندر پائی جاتی ہے۔

تاہم اسی کے ساتھ ہر آدمی کے اندر انا (ایگو) بھی موجود ہے۔ یہی "انا" ساری خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے ہر آدمی کی انانیت کو اس کے سینہ کے اندر سلا رکھا ہے۔ ہر آدمی کی انا ابتدائی طور پر حالت خواب میں ہے۔ آپ کی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی کی اس انا کو سویا رہنے دیں، اس کو کبھی بیدار نہ کریں۔

جب آدمی کی انا سوئی ہو تو وہ اپنی حالت فطری پر ہوتا ہے۔ اس وقت وہ وہی کرتا ہے جو سچی انسانیت کا تقاضا ہے۔ کوئی آدمی صرف اس وقت برا بنتا ہے جب کہ اس کی انانیت کو جگا دیا جائے۔ عقل مند آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں کی انا کو جگانے سے آخری حد تک پرہیز کرے، اور بالفرض اگر کسی کی انا جاگ اٹھے تو پہلی فرصت میں اپنے حکیمانہ رویہ سے اس آگ کو بجھا دے۔

جو لوگ عقل مندی کی اس روش کو اختیار کریں، ان کو کبھی دوسروں کی طرف سے شکایت نہ ہوگی، خواہ وہ ایک ملک میں رہتے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں۔

دو ملک ایک واقعہ

ہندستان کے شہر بھاگلپور میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ہندو مسلم فساد ہوا جس کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ اس میں مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس کے بارہ میں بہت سی رپورٹیں اخبارات میں آچکی ہیں۔ بھاگل پور کے مولانا اکرام الدین قاسمی نے ذاتی جائزہ کے بعد ایک مفصل رپورٹ شائع کی ہے جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رپورٹ کا عنوان ہے: بھاگلپور میں آگ اور خون کی ہولی۔

اس رپورٹ کے ٹائٹل پر ایک تصویر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سات مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ جلایا اور قتل کیا گیا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے: بھاگلپور کے ایک خاندان کے سات افراد کی لاشیں، جن میں ایک سال کا معصوم بچہ بھی شامل ہے۔

اب دوسری تصویر دیکھئے۔ پاکستان کے شہر کراچی میں ۷ فروری ۱۹۹۰ کو مسلم مسلم فساد ہوا۔ جس کا سلسلہ کئی روز تک برابر جاری رہا۔ پاکستان کے مشہور اخبار نوائے وقت (۸ فروری ۱۹۹۰) کے صفحۂ اول پر اس کی خبر نمایاں طور پر چھپی ہے۔ اس خبر کی سرخی یہ ہے: کراچی میں آگ اور خون کا کھیل۔

اس سلسلہ میں نوائے وقت (۱۰ فروری ۱۹۹۰) کے صفحۂ اول پر مزید یہ خبر درج ہے کہ کراچی میں پانچ افراد پیٹ چاک کرنے کے بعد زندہ جلا دیے گئے۔ یہ الم ناک اور بہیمانہ واقعہ منگھو پیر روڈ پر ہوا۔ یہاں ایک جلی ہوئی سوزوکی وین سے پانچ مسخ شدہ لاشیں برآمد کی گئیں۔ ان پانچ افراد کو رسیوں کے ساتھ وین کے اندر باندھا گیا اور ان کا پیٹ پھاڑ کر زندہ جلا دیا گیا۔

جو لوگ "بھاگلپور" کے واقعہ کو ہندو ظلم کے خانہ میں ڈالتے ہیں، وہ "کراچی" کے اسی قسم کے واقعہ کو کس کے ظلم کے خانہ میں ڈالیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں واقعات کا کوئی مشترک سبب تلاش کرنا ہوگا۔ یہ مشترک سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ عدم برداشت ہے۔

زندگی ناخوش گوار واقعات کو خوش گواری کے ساتھ برداشت کرنے کا نام ہے۔ اگر آپ اس برداشت کے لیے تیار ہوں تو آپ اپنی زندگی میں کامیاب رہیں گے۔ اور اگر آپ اس برداشت پر راضی نہ ہوں تو آپ "آگ اور خون" کے حوالے کیے جائیں گے، خواہ آپ مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں۔

نفرت، محبت

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے صحاب بھی وہاں موجود تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی (دیہاتی گنوار) وہاں آیا۔ وہ مسجد کے اندر ایک جگہ کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ اس کو پکڑنے اور مارنے کے لیے دوڑے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کہ اسے چھوڑ دو۔ جب اعرابی پیشاب کر چکا تو آپ نے صحابہ سے کہا کہ ایک بالٹی پانی لو اور جہاں اس نے پیشاب کیا ہے وہاں پانی بہا کر اس کو صاف کر دو۔ اس کے بعد آپ نے اعرابی کو بلایا اور نرمی کے ساتھ اس سے کہا کہ دیکھو یہ مسجد ہے۔ یہاں خدا کا ذکر اور عبادت کی جاتی ہے۔ یہ بول و براز کرنے کی جگہ نہیں۔

اعرابی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ ابتدا میں اگر اس کا گنوار پن جاگا ہوا تھا تو اب اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ وہ اسی حالت میں اپنے قبیلہ میں واپس گیا۔ وہاں وہ دیوانہ وار لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ دیکھو، میں مدینہ گیا۔ وہاں میں نے یہ گندا کام کیا کہ محمد کی مسجد میں پیشاب کر دیا۔ مگر انھوں نے صرف یہ کیا کہ جہاں میں نے گندا کیا تھا اس کو پانی سے دھو دیا۔ خدا کی قسم محمد نے نہ مجھ کو جھڑکا اور نہ وہ میرے اوپر غصہ ہوئے (واللہ ما زجرنی محمد۔ واللہ ما قہرنی محمد) اعرابی کا یہ کہنا اس کے قبیلہ والوں کے لیے اسلام کی تبلیغ بن گیا۔ چنانچہ پورا کا پورا قبیلہ اسلام کے دین میں داخل ہو گیا۔ جس قبیلہ کے ایک آدمی نے مسجد میں آکر پیشاب کر دیا تھا، اسی قبیلہ کے تمام آدمی دوبارہ مسجد میں اس لیے آئے کہ مسجد کا احترام کریں اور اس میں ایک خدا کے آگے سجدہ کر کے اپنی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کریں۔

یہ دور رسالت کا واقعہ ہے۔ اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ ۱۸۳۱ میں سید احمد شہید بریلوی کو زبانی طور پر یہ خبر ملی کہ پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی کچھ مسجدوں کو اصطبل بنا دیا ہے۔ وہاں اس کے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ اس خبر کے بعد انھیں کسی مزید تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بہت سے مسلمانوں کو لے کر پنجاب پہونچے اور رنجیت سنگھ کی فوجوں سے لڑ گئے۔ اس لڑائی میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ ایک تذکرہ نگار کے الفاظ میں، پنجاب کی زمین مسلمانوں کے

خون سے لالہ زار ہو گئی۔

۱۸۵۷ کے غدر (یا جنگ آزادی) میں یہ واقعہ ہوا کہ مسلمان اس بات پر بھڑک اٹھے انھیں وقت کے حکمرانوں کی طرف سے ایسے کارتوس دیئے گیے ہیں جن میں خنزیر کی چربی لگی ہو ہے یا کچھ انگریز سپاہی اپنے گھوڑوں پر چڑھ کر کسی مسجد کے اندر داخل ہو گیے ہیں۔ اس کے نتیجہ مسلمانوں نے انگریزوں سے جو لڑائی لڑی، اس میں لاکھوں مسلمان مارے گیے۔ بے شمار مسلمانوں کا بہا۔ مگر سب کچھ لا حاصل، کیوں کہ جو صورت حال تھی، وہ بدستور مزید شدت کے ساتھ برقرار رہی۔

اس وقت سے لے کر اب تک لڑائی بھڑائی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مسلمان ہر طرف اپنا خون رہے ہیں۔ غیر قوم کا کوئی شخص مسجد کی دیوار پر رنگ ڈال دے۔ کوئی مسجد کے سامنے غلط نعرے لگا دے۔ کوئی جلوس باجا بجاتا ہوا مسجد کی سڑک سے گزر جائے۔ اس طرح کا کوئی واقعہ تو مسلمان مشتعل ہو کر اٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان فساد ہوتا گولیاں چلتی ہیں۔ بے شمار لوگ مارے جاتے ہیں۔ اس طرح کے جھگڑے اور لڑائیوں میں مسلمانوں جو خون بہتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو ناپنے کے لیے بالٹی کی نہیں بلکہ ڈرم کی ضرورت ہو گی مسلمانوں کے اپنے بیان کے مطابق سڑکوں پر مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ بستیاں مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو رہی ہیں۔

اب دیکھیے کہ یہ سارا خون جو بہایا جا رہا ہے اس کا فائدہ کیا ہے۔ کیا اس کی وجہ سے خدا کے بندے خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے اسلام کے دشمن اسلام کے دوست بن رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے کہ قومیں اور قبیلے اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی طاقت بن جائیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کے خون کا سیلاب ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت سے بہہ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص نہیں جس کی روح کو خون کے اس دریا نے پاک کیا ہو۔ کوئی ایک آدمی نہیں جو اس خون کی وجہ سے مسلمانوں کے دین میں داخل ہوا ہو۔ کوئی ایک قبیلہ نہیں جس نے مسلمانوں کے اس عمل کو دیکھ کر ایسا کیا ہو کہ وہ خدا کی نافرمانی کو چھوڑ کر خدا کا مومن و مسلم بن جائے

یہ فرق کیوں ہے۔ دور رسالت میں پانی نے جو نتیجہ دکھایا تھا، بعد کے دور میں خون بھی وہ نتیجہ

نہ دکھا سکا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا پانی محبت کا پانی تھا۔ اور موجودہ مسلمانوں کا خون نفرت کا خون ہے۔ رسول نے انسان کے اوپر معافی، خیر خواہی، شفقت اور مہربانی کی بارش برسائی تھی۔ اس کے برعکس آج کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انسان کے اوپر نفرت اور غصہ اور اشتعال کا خون انڈیل رہے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دورِ اول کے عمل کا یہ نتیجہ پیدا کیا تھا کہ قومیں کی قومیں اور قبیلے کے قبیلے اسلام کے سایہ میں داخل ہوگئے۔ اسلام ساری دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ غالب دین بن گیا۔ اور موجودہ زمانہ میں اسلام ساری دنیا میں حقیر ہو رہا ہے، وہ ایک بلین مسلمانوں کے باوجود ساری دنیا میں کمزور اور مغلوب مذہب بنا ہوا ہے۔

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر دو مختلف صلاحیتیں ہیں۔ ایک نفس لوامہ (ضمیر) اور دوسرے نفسِ امارہ (انانیت)۔ یہ دونوں صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہیں۔ اب اگر آپ فریق ثانی کے نفسِ لوامہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا انسانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔ اور اگر آپ فریق ثانی کے نفسِ امارہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا حیوانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ آپ آدمی کے وجود کے انسانی حصہ کو جگائیں۔ اس لیے آپ نہ صرف اچھوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے بلکہ بروں کے ساتھ بھی آپ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آدمی کی چھپی ہوئی فطرت جاگتی تھی۔ اور آخر کار وہ اسلام قبول کر کے آپ کا ساتھی بن جاتا تھا۔

موجودہ مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل نہیں کرتے کہ بروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ وہ ہمیشہ ردِ عمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا طریقہ صرف فریق ثانی کی انانیت کو جگانے کا باعث بنتا ہے۔ خدا کے بندوں کے لیے ان کے پاس "محبت کا پانی" نہیں، البتہ ان کے پاس "نفرت کا خون" کافی مقدار میں موجود ہے۔ جس کو وہ لوگوں کے اوپر انڈیلتے رہتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو خدا کے اس باغ میں صرف کانٹے ملیں گے۔ وہ اس باغ کے پھولوں کے مالک نہیں بن سکتے۔ یہی قانونِ قدرت کا فیصلہ ہے۔

سائنس کی گواہی

ڈاکٹر مارس بوکائی (Dr Maurice Bucaille) فرانس کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قرآن کے بارہ میں ایک کتاب لکھی۔ وہ اولاً فرانسیسی زبان میں ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دس زبانوں میں اس کے ترجمے چھپے۔ انگریزی میں اس کتاب کا نام یہ ہے:

The Bible, the Qur'an and Science

اس کتاب میں ڈاکٹر مارس بوکائی نے دکھایا ہے کہ علم سائنس کے بارہ میں قرآن کے بیانات حیرت انگیز طور پر جدید تحقیقات کے مطابق ہیں۔ قرآن اگرچہ دورِ سائنس سے بہت پہلے پیش کیا گیا، مگر بعد کے زمانہ میں ظاہر ہونے والی علمی حقیقتوں کا اس میں بالکل صحیح بیان موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن ایک برتر ذہن کی تخلیق ہے۔ وہ انسانی ذہن کی تصنیف نہیں (ملاحظہ ہو عظمت قرآن، اور اسلام عصر حاضر)

ڈاکٹر مارس بوکائی کی دوسری کتاب انسان کی پیدائش اور رحم مادر میں اس کے ارتقاء کے بارہ میں ہے جو کہ ڈاکٹر بوکائی کا خاص موضوع ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ انسان کی پیدائش کے بارہ میں قرآن میں جو بیانات ہیں، وہ جدید تحقیقات کے عین مطابق ہیں، جب کہ یہ تحقیقات کے نتائج صرف بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں انسان کو معلوم ہو سکے ہیں۔

ڈاکٹر بوکائی کی اس دوسری کتاب کا فرانسیسی اڈیشن ۱۹۸۴ میں پیرس سے شائع ہوا۔ ۲۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے انگریزی اڈیشن کا نام یہ ہے:

What is the Origin of Man?
Published by Seghers, 6 Place Saint-Sulpice,
75006 Paris

ڈاکٹر مارس بوکائی اپنی دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ مجھے فرانس میں یہ بتایا گیا تھا کہ قرآن محمد کی کتاب ہے۔ انھوں نے اس کو بائبل سے کچھ گھٹا کر یا بڑھا کر تیار کر لیا ہے۔ اپنے اس ذہن کی بنا پر میں فطری طور پر یہ سمجھتا تھا کہ بائبل کے اندر جو علمی غلطیاں (scientific errors) ہیں، وہ لازماً قرآن کے اندر بھی ہونی چاہئیں (۱۵۷)

مزید یہ کہ محمد کے اسلام کا زمانہ ۶۱۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشرق و مغرب میں ہر طرف علمی تاریک خیالی (scientific obscurantism) کا ذہن چھایا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ بھی ہونا چاہئے کہ اس تاریک علمی دور کے اثرات ان کی کتاب میں پائے جارہے ہوں۔

مگر بعض تجربات کے دوران انھیں معلوم ہوا کہ قرآن کے بیانات اور بائبل کے بیانات میں اگرچہ کئی باتیں مشترک ہیں مگر قرآن حیرت انگیز طور پر اس قسم کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان علمی غلطیوں کو حذف کر دیتا ہے جو موجودہ بائبل میں پائی جاتی ہیں۔ اب ان کا تجسس بڑھا۔ یہاں تک کہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں سمجھنے کے لئے انھوں نے پچاس سال کی عمر میں عربی زبان سیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد جب انھوں نے قرآن کو براہ راست پڑھا تو انھوں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ بائبل ایک طرف علمی غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ مگر دوسری طرف قرآن کا حال یہ ہے کہ وہ علمی غلطیوں سے یکسر خالی ہے۔

اگر قرآن محمدؐ کی کتاب ہو اور انھوں نے اس کو بائبل اور وقت کی معلومات کی مدد سے مرتب کیا ہو تو کیا وجہ ہے کہ قرآن میں وہ تمام علمی غلطیاں حذف ہیں جو بائبل میں یا محمدؐ کے زمانہ میں پائی جارہی تھیں۔ مثلاً بائبل میں انسان کے ظہور کی جو تاریخ دی گئی ہے اس کے لحاظ سے ۱۹۸۱ کے حساب کے مطابق، زمین پر انسان کا ظہور پہلی بار ۵۷۴۲ سال پہلے ہوا۔ مگر اس قسم کی بے معنی غلطیاں قرآن میں بالکل نہیں پائی جاتیں (صفحہ ۱۵)

بائبل میں کثرت سے علمی غلطیاں ہیں۔ وہ اتنی واضح ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں۔ جین گوٹن (Jean Guitton) نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بائبل کی علمی غلطیاں انسانی غلطیاں ہیں۔ کیوں کہ اس وقت انسان ایک بچہ کی مانند تھا، اور اس بنا پر وہ علمی حقائق سے بے خبر تھا:

> The scientific errors in the Bible are the errors of mankind, for long ago man was like a child, as yet ignorant of science (p. 152).

ایسی حالت میں محمد کے لئے کیسے ممکن ہوا کہ وہ قرآن کو مرتب کرتے ہوئے بائبل کی یا اپنے زمانہ کی غلطیوں کو قرآن سے حذف کر دیں۔ وہ ایسی کتاب تیار کریں جس میں استثنائی طور پر کوئی بھی علمی غلطی موجود نہ ہو (۱۶۰) مصنف یہ کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن محمد کی کتاب نہیں۔ وہ

ایک ماورائے انسانی ذہن کی تخلیق ہے۔ علم کی تاریخ ہم کو اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی موجودگی کی کوئی انسانی توجیہہ ممکن نہیں :

> The history of science leads us to conclude that there can be no human explanation for the existence of these verses in the Qur'ān (p. 188).

قرآن کا یہ استدلالی پہلو قرآن کی اس آیت کی تصدیق ہے جو چودہ سو سال پہلے قرآن میں شامل کی گئی تھی —— ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور خود لوگوں کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔ اور کیا یہ بات کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز پر گواہ ہے (حم السجدہ ۵۳)

جو لوگ قرآن کو خدا کی کتاب ماننے کے لئے اس کی سائنسی دلیل چاہتے ہیں، ان کو ڈاکٹر ماریس بوکائی کی مذکورہ دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

قرآن فنی معنوں میں سائنس کی کتاب نہیں۔ مگر قرآن جن عقائد کو ماننے کی دعوت دیتا ہے، اس کے لئے وہ فطرت کی نشانیوں کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ یہ فطرت کی نشانیاں کیا ہیں، یہ وہی نیچر ہے جس کا مطالعہ سائنس میں کیا جاتا ہے۔

نیچر قرآن کا موضوع بھی ہے اور سائنس کا موضوع بھی۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ قرآن میں فطرت کے بعض پہلوؤں کا ذکر بطور دلیل آیا ہے۔ جب کہ سائنس میں فطرت کا مطالعہ مستقل فن کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں جہاں کہیں بھی نیچر کا کوئی حوالہ ہے، وہ بعد کی سائنسی تحقیقات کے مطابق ہے۔ اس مطابقت کی کوئی بھی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ قرآن کو اس خدا کی کتاب مانا جائے جو تمام کھلی اور چھپی باتوں کو جانتا ہے، جس کا علم بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

عمل کے نام پر بے عملی

شیخ محمد اکرام (آئی سی ایس) کی کتاب "موج کوثر" ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۴۷ تک کی مسلم تحریکوں اور رہنماؤں کا ذکر ہے۔ اس کے ایک باب کا عنوان ہے "دور ردعمل کی خصوصیات" اس باب کے تحت وہ لکھتے ہیں:

"دور ردعمل میں" پدرم سلطان بود" اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کی آوازیں جس طرح بلند ہوئیں، اس پر دیدہ ور لوگوں نے کان کھڑے کئے اور آنکھیں دکھائیں۔ علامہ شبلی نے، جب وہ ابھی علی گڑھ سے وابستہ تھے اور سرسید کے رفیق کار تھے، اُن خدشات کو بڑے لطف سے نظم کیا جو سلف پرستی سے پیدا ہونے والے تھے:

سلف کا تذکرہ جو ہمت و غیرت کا ہے افسوں
ہمارے حق میں وہ سرمایۂ خوابِ پریشاں ہے
یہ افسانے بڑھا تے ہیں ہماری نیند کی شدت
یہ افسوں حق میں اپنے اور مدہوشی کا ساماں ہے
ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی تباہی کا
کہ سب پیشِ نظر اسلاف کی وہ شوکت و شاں ہے
ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سن کر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احساں ہے
مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولتِ عباس کا اب تک ثنا خواں ہے
نہیں رہنے کو یاں گھر تک، مگر چرچے یہ رہتے ہیں
کہ اب تک قصرِ حمرا قبلہ گاہِ رہ نورداں ہے
ہیں خود اَن پڑھ، مگر اس زعم میں اترائے پھرتے ہیں
کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ اب تک نامِ یوناں ہے
نظر آتے ہیں، ہم کو عیب اپنے خوبیاں بن کر
ہم اپنے جہل کو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے

نواب عماد الملک بلگرامی نے بھی اس کے چند سال بعد علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں کہا:

ہم مسلمانوں میں آج کل ایک نیا مرض شائع ہو گیا ہے۔ جس کو اسلاف پرستی کہتے ہیں... ان حضرات نے آفت برپا کر دی ہے۔ کوئی مسلمانوں کی علمی دولت کو شمار کرتا ہے۔ کوئی تمدنی خوبیاں گنتا ہے۔ کوئی ہمارے مدارس اور یونیورسٹیوں کی فہرست تیار کرتا ہے۔ کوئی ہماری یونانی کتابوں کے ترجموں کا حساب دیتا ہے۔ کوئی اندلس کی حکومت کا زور دکھاتا ہے۔ کوئی ہارون اور مامون کی شان بیان کرتا ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ اسلاف پرستی بہت عمدہ شیوہ ہے مگر اسی حد تک کہ ہم اپنے بزرگوں کی محنت، ان کی یک
ان کی نفس کشی کی تقلید کریں اور ان کا سا صبر و استقلال، ان کا سا انہماک طلب علم میں پیدا کریں
نہ یہ کہ ہمارے بزرگوار جو کچھ اپنے وقت میں کر گئے تھے، ان پر غرّہ کریں اور مثل زن بیوہ کے ان
پر بیٹھ رہیں اور ان کی علمی بزرگیوں کا تذکرہ دوسروں سے سن کر زمانہ حال کی دولت علمی کو حقیر سمجھیں اور
کے دریافت سے اغماض کریں۔" (موج کوثر ۸۳ - ۲۸۴)

اس زمانہ میں مسلمانوں کے احیاء نو کی سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ سمجھ لی گئی تھی کہ ماضی
شاندار تاریخ کو یاد دلاکر لوگوں میں حال کا ولولہ پیدا کیا جائے۔ یہ مزاج اتنا بڑھا کہ خود م
شبلی نعمانی اس کا شکار ہو گئے جنھوں نے ابتدائی طور پر اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا
چنانچہ بعد کے زمانہ میں انھوں نے خود بھی یہی کیا کہ دور فتوحات کے کارنامے بتا کر مسلمانوں میں ج
عمل پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

مگر یہ طریقہ سراسر بے فائدہ تھا۔ اس تدبیر میں بنیادی خامی یہ تھی کہ وہ "تیاری" کے دور کو حذ
کر کے صرف "نتیجہ" کے دور کو نمایاں کر رہا تھا۔ وہ ابتدائی جدوجہد کو چھوڑ کر آخری منزل سے اپنے سف
آغاز کرنا چاہتا تھا۔ ایسا سفر اس اسباب کی دنیا میں کبھی شروع نہیں ہوتا۔ چنانچہ سو سال کے پر جوش
لفظی ہنگاموں کے باوجود وہ شروع بھی نہ ہو سکا، اور منزل پر پہنچنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

اس قسم کی تحریکیں آدمی کے اندر صرف فخر کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ حالاں کہ احیاء نو کے لئے ا
ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر عمل کا جذبہ ابھارا جائے۔ اس طرح یہ طریقہ ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کر
والا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی وہ ہمارے حق میں ثابت ہوا۔ مسلمان فرضی بھرم میں مبتلا ہو کر ایک ا
قوم بن گئے جس کے پاس الفاظ کی دھوم تو بہت ہے مگر حقیقی عمل کا سرمایہ اس کے پاس موجود نہیں۔

احیاءِ قلب ، احیاءِ حکومت

انسانوں کے اندر جب بھی بگاڑ آتا ہے تو اس کی جڑ ہمیشہ قلب میں ہوتی ہے۔ قلب کے بگاڑ سے زندگیاں بگڑ جاتی ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ کیا لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے قلب ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا ان کے کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔ کیوں کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ قلب اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں (الحج ۴۶)

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے کہ سن لو کہ انسانی جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے ، اور وہ قلب ہے (اَلَا وَ اِنَّ فِی الجَسَدِ مُضْغَةً اذا صَلَحَتْ صَلَحَ الجَسَدُ کُلُّه و اذا فَسَدَتْ فَسَدَ الجسدُ کُلُّه اَلَا وَهِیَ القلبُ (متفق علیه)

جب ہر قسم کے انسانی بگاڑ کا سرچشمہ قلب ہے تو ہر بگاڑ کے موقع پر ہمیشہ اصلاح کا آغاز قلب کی اصلاح سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی اس آیت کا مطالعہ کیجئے :

کیا ایمان والوں کے لئے وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہوا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے آسمانی کتاب دی گئی تھی ، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے ، اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد۔ ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو (الحدید ۱۶ - ۱۷)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر لمبی مدت (طول امد) گزرنے سے افراد کے قلوب میں سختی (قساوت) آجاتی ہے۔ اس سے ان کے اندر باتوں کو سمجھنے اور اس سے اثر لینے کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ جب کسی قوم کا یہ حال ہو جائے تو اس وقت کیا کرنا چاہئے ، اس کو زمین کی مثال کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

جو زمین خراب ہو جائے ، اس میں کام کا آغاز فصل بونے سے نہیں کیا جاتا ، بلکہ زمین تیار کرنے سے کیا جاتا ہے۔ ایسی زمین سے پہلے اینٹ پتھر اور جھاڑ جھنکار صاف کیا جاتا ہے۔ اس کو ہموار کیا جاتا ہے۔ اس کی جتائی کر کے اس کو زرخیز بنایا جاتا ہے۔ پانی اور کھاد کا انتظام

کیا جاتا ہے۔

جب یہ سب کام ہو جائے، اس وقت زمین پیداوار کے لئے صالح ہو جاتی ہے۔ اب کسان اس زمین میں بیج ڈالتا ہے۔ جو کسان اس طرح زرعی عمل کرے، وہی اپنی زمین سے عمدہ فصل حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو کسان زمین کی تیاری سے پہلے اس میں دانہ بکھیر دے، وہ دانہ بکھیرنے کے باوجود اپنی زمین سے عمدہ فصل حاصل نہ کر سکے گا۔ کیوں کہ عمدہ فصل ہمیشہ تیار کی ہوئی زمین سے اگتی ہے نہ کہ غیر تیار شدہ زمین سے۔

قرآن کی یہ آیت اس بارہ میں قاطع حیثیت رکھتی ہے کہ کسی قوم پر جب تنزل کا دور آجائے تو اس کو دوبارہ اٹھانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ ایسی حالت میں وہی کرنا چاہئے جو مردہ (خراب) زمین پر کسان کرتا ہے۔ یعنی فصل بونے سے پہلے زمین تیار کرنا۔

اس قرآنی اصول کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھئے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان زوال کا شکار ہوئے۔ ان کی حکومتیں ختم ہو گئیں۔ قوموں کے درمیان ان کی عظمت باقی نہیں رہی۔ ماضی کے غالب لوگ حال کے مغلوب لوگ بن گئے۔

قرآن کے مذکورہ اصول کے مطابق، اب مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کا کام احیاء قلب سے شروع ہونا چاہئے تھا نہ کہ احیاء حکومت سے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما تھے، انھوں نے تقریباً بلا استثناء یہ کیا کہ احیاء حکومت کے نعرہ سے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ قلب کی سطح پر قوم کو زندہ کرنے کی کوشش انھوں نے نہیں کی۔ ہر ایک نے یہ کیا کہ حکومت کی سطح پر کوشش کر کے قوم کی نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھنے لگا۔

خلافت تحریک، آزادی کی تحریک، تقسیم ملک کی تحریک، اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ دوسری تحریکیں بھی کم و بیش اسی خانہ میں جاتی ہیں۔ ان میں نام کے اعتبار سے یا الفاظ کے استعمال کے اعتبار سے بظاہر فرق نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں۔

اس غلطی کے نتیجہ میں مسلم رہنماؤں کا حال اس معمار کا ہوا جو ٹوٹے کھمبوں اور بوسیدہ دیواروں کے اوپر چھت کھڑی کرنے کی کوشش کرے۔ ایسی چھت کبھی قائم نہیں ہو سکتی اور نہ ایسا گھر

کبھی بن سکتا۔ ایسے گھر میں تعمیر کا آغاز کھمبوں اور دیواروں کی مضبوطی سے ہوگا نہ کہ چھت کا ڈھانچہ کھڑا کرنے سے۔

ماضی کی اس غلطی کی واحد تلافی یہ ہے کہ غلطی کا اعتراف کیا جائے۔ اور حال میں وہ کام شروع کر دیا جائے جو ماضی میں نہ ہو سکا۔ یعنی احیا حکومت پر نظریں جمانے کے بجائے احیاء قلب پر اپنی ساری طاقت صرف کرنا۔ اس کے سوا ہر سرگرمی صرف وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس وقت تمام کاموں سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مسلمان عمل اور نتیجہ کے فرق کو سمجھیں۔ اس دنیا میں جب بھی کوئی شخص کسی نتیجہ کو پاتا ہے تو وہ اس کے موافق ضروری عمل کرنے کے بعد اسے پاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص عمل کو حذف کر کے اچانک اپنے مطلوبہ نتیجہ کو پالے۔ ایسا کبھی کسی کے لئے نہیں ہوا، اور نہ آج وہ کسی کے لیے ہو سکتا ہے۔

مزید یہ کہ عمل محض حرکت کا نام نہیں ہے، بلکہ صحیح حرکت کا نام ہے۔ جو نتیجہ مطلوب ہو، اس کے مطابق ایک درست عمل ہوتا ہے۔ اس درست عمل کو اس کے تمام تقاضوں کے تحت انجام دینا پڑتا ہے اس ابتدائی مرحلہ کو اس کی تمام ضروری شرائط کے ساتھ گزارنے کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے کہ آدمی اپنے مطلوب نتیجہ کو پائے۔

ضروری عمل کے بغیر نتیجہ کو پانے کے لئے دوڑنا ایک بے معنی اچھل کود ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ کسی کے حق میں نکلنے والا نہیں، خواہ اس نے اپنی اچھل کود کو اسلام کا خوبصورت نام کیوں نہ دے رکھا ہو۔

ایک سفر

ایک بین اقوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے مارچ ۱۹۹۰ میں ایک سفر ہوا۔ مہینہ کے آخر میں دوبارہ دہلی واپسی ہوئی۔

۱۷ مارچ کو فجر سے پہلے گھر سے ایرپورٹ جانے کے لئے نکلا تو ایک حدیث یاد آگئی جس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جس آدمی کو اندیشہ ہوتا ہے وہ صبح سویرے سفر کے لئے نکلتا ہے۔ اور جو آدمی سویرے سفر کے لئے نکلتا ہے وہی اپنی منزل پر پہنچتا ہے (مشکاۃ المصابیح الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۶۹)

حدیث میں ادلاج کا لفظ ہے جس کے معنی رات کے آخری حصہ میں یا صبح کے اندھیرے میں سفر کے لئے نکلنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب آغاز سفر میں جلد روانگی کا اہتمام کرنا ہے تاکہ سفر کامیابی کے ساتھ طے ہو سکے۔ یہی معاملہ آخرت کے سفر کا بھی ہے۔ آخرت کے سفر میں کامیابی کے ساتھ منزل پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کا پورا اہتمام کیا جائے۔

دہلی سے جہاز کی روانگی کا وقت صبح ساڑھے چھ بجے تھا۔ فجر سے پہلے گھر سے روانہ ہوا۔ راستہ میں لال بتی پر گاڑی رکی تو مجھے قرآن کی آیت وقفوهم انهم مسئولون (الصافات ۲۴) یاد آگئی۔ آخرت میں وہی شخص پار ہوگا جس کو روکا نہ جائے۔ جس آدمی کو جانچ کے لئے روکا گیا وہ ہلاک ہوا۔

میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم نے ایک بار ایک ٹرک خریدا۔ جلد ہی بعد انہوں نے اس کو بیچ دیا۔ انھوں نے بتایا کہ ٹرک کے بارہ میں حکومت نے اتنے زیادہ قانون اور قاعدے بنا رکھے ہیں کہ اس کا پکڑ سے بچنا سخت مشکل ہے۔ پولیس والوں نے جس ٹرک کو جانچ کے لئے روکا اس کا چالان ہونا لازمی ہے۔ آخرت میں ٹکنکل قسم کے ضابطوں پر تو کسی کی پکڑ ہونے والی نہیں ہے۔ البتہ عمل کے خالص پن (purity) پر ضرور وہاں جانچ ہوگی۔ جس آدمی کا عمل خالص اللہ کے لئے ہوگا وہ بچے گا اور جس آدمی کا عمل خالص اللہ کے لئے نہ ہو، اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

ایرپورٹ کے اندر امیگریشن پر بڑی لمبی لائن تھی۔ کمزوری سے طبیعت گھبرا اٹھی۔ میں

نے سوچا کہ آخرت میں اگر کوئی اور سزا نہ ہو، صرف اتنا ہو کہ کروروں انسانوں کی قطار کے درمیان تیز سورج میں کھڑا کر دیا جائے تو آدمی کا کیا حال ہوگا۔

دہلی سے ۶ مارچ ۱۹۹۰ کی صبح کو اردن ایر لائنز (فلائٹ ۱۹۳) کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ وقت پر جہاز کا گیٹ بند ہو گیا اور جہاز اپنا پر پھیلائے ہوئے رن وے پر چلنے لگا۔ اتنے میں کچھ ہندستانی مسافروں نے جہاز کے عملہ سے بحث شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری فیملی کا ایک آدمی باہر رہ گیا ہے اور ہمارا ٹکٹ اسی کے پاس ہے۔ کچھ دیر کی بحث کے بعد آخر کار جہاز دوبارہ گیٹ کی طرف واپس روانہ ہوا۔ آدمی کو تلاش کر کے اس کو دوبارہ اندر لا کر بٹھایا گیا۔ اس کے نتیجہ میں جہاز تقریباً دو گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔

یہ سطحیت اور نادانی کی ایک مثال ہے۔ اس قسم کی سطحیت اگر ایک آدمی اپنی ذاتی زندگی میں کرے تو وہ حماقت ہے، وہ جرم نہیں ہے۔ مگر اجتماعی زندگی میں اس طرح کی سطحیت ایک سنگین جرم بن جاتی ہے۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی میں ایسی سطحی حرکت کی سزا پوری قوم کو بھگتنی پڑتی ہے۔

جہاز کے اندر امریکی میگزین نیوز ویک (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے صفحہ ۵۰ پر ایک فرانسیسی خاتون گروٹ (Groult) کی کتاب پر تبصرہ تھا۔ اس میں کتاب کے حوالہ سے بتایا گیا تھا کہ فرانس میں تحریک نسواں (Feminism) مایوسی کے دور سے گزر رہی ہے۔ مثلاً کتابوں کے ناشرین نے تحریک نسواں کے متعلق لٹریچر چھاپنا بند کر دیا ہے، کیوں کہ اس کی فروخت میں بہت کمی آگئی ہے:

Publishers have stopped printing feminist literature because of poor sales.

فرانس میں تحریک نسواں کی مشہور خاتون لیڈر سیمون (Simone de Beauvoir) چار سال پہلے مر گئیں۔ ان کے بعد کوئی خاتون لیڈر ابھر نہ سکی۔ فرانس کی تحریک نسواں کو زندہ رہنے کے لئے ایک لیڈر کی تلاش ہے۔ ایک فرانسیسی خاتون نے اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کی عورتیں ایک غالب شوہر سے دور بھاگ سکی ہوں گی، مگر آخری چیز جو وہ چاہتی ہیں وہ دوسرا غالب ہے:

They may have escaped from a domineering husband and the last thing they want is another dominator.

مرد کو اللہ تعالیٰ نے فعال صفات کے ساتھ پیدا کیا ہے اور عورت کو منفعل صفات کے ساتھ۔ دونوں صنفوں کے فریضۂ حیات کے اعتبار سے یہی فطری تقسیم ہے۔ مغرب میں اس تقسیم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آخر کار فطرت غالب آئی۔ انسان کے خود ساختہ نظریات بے حقیقت ہو کر رہ گئے۔

جہاز میں ایک صاحب آکر میرے قریب کی خالی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ عملہ کے ایک آدمی نے ان کے بورڈنگ کارڈ کو دیکھ کر کہا کہ یہ اوپر کا درجہ ہے، آپ کا ٹکٹ اکانومی کلاس کا ہے۔ اس لئے آپ پیچھے کی سیٹ پر جائیں۔ وہ صاحب نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ دیر تک بحث کرنے کے بعد آخر کار وہ اٹھے اور جہاز کے آدمی کو برا بھلا کہتے ہوئے دوسرے درجہ میں چلے گئے۔ موجودہ سیٹ پر بیٹھنے کے لئے ان کی دلیل یہ تھی کہ وہاں تو کوئی شخص بیٹھا ہوا نہیں ہے:

Nobody is sitting here.

مسافر کو معلوم نہ تھا کہ اس دنیا میں کوئی سیٹ آدمی کو اس لئے نہیں ملتی کہ وہ خالی ہے۔ یہاں کوئی سیٹ آدمی کو ملتی ہے تو اس لئے ملتی ہے کہ اس نے اس کی ضروری قیمت ادا کی ہے۔ جہاں دوسرے لوگ قیمت ادا کرکے بیٹھے ہیں وہاں آپ قیمت ادا کئے بغیر اپنے لئے نشست نہیں پا سکتے۔ یہ زندگی کی ایک سادہ حقیقت ہے۔ مگر بہت سے لوگ اس سادہ حقیقت کو نہیں جانتے۔

مارچ ۱۹۹۰ کی ۱۷ تاریخ ہے۔ گھڑی میں دن کے ایک بجے ہیں۔ ہمارا جہاز تقریباً ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہے۔ میں نے جہاز کی کھڑکی کے باہر دیکھا تو سورج کی تیز روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جہاز کے نیچے گہرے بادلوں کی تہیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس وقت اگر آپ نیچے زمین کی سطح پر کھڑے ہوئے ہوں تو آپ کو اپنے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا نظر آئے گا۔ مگر عین اسی وقت بادلوں کے اوپر مکمل سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح زندگی کے مطالعہ کی بھی دو سطحیں ہیں۔ زندگی کے معاملہ کو ایک رخ سے دیکھئے تو آپ کو اپنے ماحول میں ہر طرف مشکلات کے اندھیرے پھیلے ہوئے دکھائی دیں گے۔ مگر ٹھیک اس وقت ایک اور سطح موجود ہوتی ہے، اگر آپ اس دوسری سطح سے دیکھیں تو زندگی روشن امکانات سے بھری ہوئی دکھائی دینے لگے گی۔

مثال کے طور پر جو لوگ آج مسلمانوں کے معاملہ کو مادی اور سیاسی اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو

مسلمان ہر طرف مشکلات و مسائل سے گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے معاملہ کو دعوتی امکانات کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے لئے آج کی دنیا میں دعوت کے نئے شاندار مواقع کھل گئے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ اسلام کا نیا مستقبل بنا سکتے ہیں، اور اسی کے ساتھ خود اپنا مستقبل بھی۔ ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھنے میں مسلمان تاریخ کا معمول نظر آتے ہیں۔ مگر دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو مسلمان تاریخ کا عامل بننے کے مقام پر کھڑے ہوئے نظر آئیں گے۔

چھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز کے اناؤنسر نے اپنے اعلان میں بتایا کہ سوف تھبط الطائرۃ (جلد ہی جہاز زمین پر اترے گا) اس جہاز کے کیپٹن (قائد الطیارۃ) ایک عرب عصام الناصر تھے۔ جہاز ایرپورٹ کے علاقہ میں داخل ہوا تو میں نے سوچا کہ دیکھوں وہ جہاز کو کس طرح اتارتے ہیں۔ کیوں کہ جہاز میں سب سے زیادہ مشکل کام لینڈنگ ہوتا ہے۔ بعض پائلٹ جہاز کو اس طرح اتارتے ہیں جیسے اس کو زمین پر گرا دیا جائے۔ مگر عصام الناصر نے جہاز کو اس طرح اتارا کہ کوئی جھٹکا نہیں لگا اور جہاز تقریباً غیر محسوس طور پر زمین پر اتر کر دوڑنے لگا۔

ایران ۔ عراق جنگ نے عرب ملکوں کی مالیات کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ مگر اس نقصان میں فائدے کے بھی کچھ پہلو ہیں۔ اس نے انھیں جگا دیا ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو ہر قسم کی اعلیٰ تربیت دے رہے ہیں۔ تاکہ وہ بیرونی ملکوں کے ماہرین سے مستغنی ہو سکیں۔

عمان ایئر پورٹ ایک چھوٹا ایئر پورٹ ہے مگر خوبصورت ہے۔ اس کا نام مطار الملکۃ علیاء الدولی (Queen Alia International Airport) ہے۔ اسی طرح دہلی کے ہوائی اڈہ کا نام اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس طرح کا نام پسند نہیں۔ ہوائی اڈوں کے نام سادہ طور پر دہلی ایئرپورٹ یا عمان ایئرپورٹ ہونے چاہئیں۔

اردن ایک چھوٹا ملک ہے۔ اردن ایئرلائن بھی ایک چھوٹی ایئرلائن ہے، مگر اس کی ہر چیز ایئرانڈیا سے بہتر نظر آئی۔ اس کا راز یہ نہیں ہے کہ اردن، ہندستان کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اردن کی ہر چیز مغربی ملکوں سے آئی ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں وہ کرپشن نہیں ہے جو موجودہ ہندستان کی سب سے بڑی خصوصیت بن چکا ہے۔

ہندستان ٹائمس (۱۲ اگست ۱۹۸۶) کے صفحہ اول پر ایک روسی جہاز کی تصویر نمایاں طور پر چھپی

ہوئی تھی۔ اس تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ درج تھے :

Prime Minister Rajiv Gandhi returned on a Soviet plane following engine trouble in the Air-India aircraft in which he left Prague for Delhi.

وزیر اعظم راجیو گاندھی ایک روسی جہاز سے واپس آئے۔ کیوں کہ ایئر انڈیا کے جہاز کے انجن میں خرابی پیدا ہوگئی تھی جس میں وہ پراگ سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس واقعہ پر تبصرے شروع ہوئے۔ ہندستان ٹائمس (۱۸ اگست ۱۹۸۶) صفحہ ۸ پر ایک تبصرہ میں کہا گیا تھا :

On one trip abroad the air-conditioning in the Prime Minister's plane fails. On another occasion something else in his aricraft fails and he is stuck on foreign soil for three hours. Now, due to a threat of fire in one engine his plane is diverted to Moscow and he returns home in a soviet aircraft. Is that the standard of maintenance of Air India?

ایک بیرونی سفر میں وزیر اعظم کے جہاز میں ایئر کنڈیشننگ کا نظام خراب ہوگیا۔ ایک اور موقع پر ان کے جہاز میں کوئی اور خرابی پیدا ہوگئی اور وہ ایک بیرونی سرزمین میں تین گھنٹے کے لئے رکنے پر مجبور ہوگئے۔ اب ان کے جہاز کے ایک انجن میں آگ لگنے کا خطرہ پیدا ہوا اور وہ ماسکو کی طرف موڑ دیا گیا اور وزیر اعظم ایک روسی جہاز میں دہلی واپس آئے۔ کیا ایئر انڈیا میں کارکردگی کا معیار یہی ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ بہت سے چھوٹے ملکوں کا معیار کارکردگی ہندستان سے نمایاں طور پر بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان ملکوں میں وہ کرپشن نہیں جو آج ہندستان کے ہر شعبہ میں آخری حد تک سرایت کر گیا ہے۔

اردن ایک چھوٹا ملک ہے۔ ۱۹۶۷ کی جنگ میں اس کے رقبہ کا ۶ فی صد حصہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا۔ یہ ۶ فی صد حصہ اردن کی زرعی زمین کا ۵۰ فیصد حصہ تھا۔ عمان اردن کی راجدھانی ہے اور ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ پورا شہر پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں قبل مسیح زمانہ کے آثار اب تک کھنڈر کی صورت میں موجود ہیں۔ ۶۳۵ء میں یزید بن ابی سفیان نے عمان کو فتح کر کے اس کو اسلامی مملکت میں شامل کیا تھا۔

اردن کے علاقہ میں تاریخی آثار بہت ہیں۔ مثلاً اسی ملک میں بطرا (Petra) اور جراش واقع ہیں۔ یہاں قدیم سلطنتوں کے چھوڑے ہوئے نشانات پائے جاتے ہیں۔ ایک سیاح کے لئے یہ مقامات صرف تفریح کے مقامات ہیں۔ مگر مومن کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ عبرت اور نصیحت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین (الانعام)

اردن کے ایک میگزین میں ایک اشتہار دیکھا۔ اس میں عالمی سیاحوں کو ترغیب دلائی گئی تھی کہ وہ اردن آئیں اور یہاں کے تاریخی مناظر دیکھیں۔ اس کا عنوان تھا:

Discover Jordan: the jewel of the Middle East

اس مضمون میں سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لئے خاص طور پر بطرہ کے سنگی مکانات کی تصویریں دی گئی تھیں۔ قدیم زمانہ میں سنگ تراشی کی ایک صنعت پیدا ہوئی۔ اس کے تحت پہاڑوں کو تراش کر انھیں مکان کی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ بطرہ میں اسی قسم کی عمارتیں ہیں۔ ایلورا اور اجنتا بھی اسی قسم کی سنگ تراشی کے نمونے ہیں۔

ایک عرب قبیلہ نے یہاں ایک سلطنت قائم کی تھی جن کو نبطی (Nabataeans) کہا جاتا ہے۔ یہ ۳۱۲ ق م کا واقعہ ہے۔ یہاں انھوں نے پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت مکانات بنائے اور اس کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ رومیوں نے اس کو ۱۰۶ء میں فتح کیا۔ ۶۳۵ء میں وہ اسلامی علاقہ میں شامل کیا گیا۔

مغربی مورخین جب اس کا ذکر کرتے ہیں تو وہ رومیوں کے تذکرہ کے ذیل میں رومی عہد (Roman times) کا لفظ لکھتے ہیں، اور مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کے لئے اسلامی حملہ (Islamic invasion) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ فرق بلاشبہہ قابل شکایت ہے۔ مگر بدقسمتی سے مسلمان جب اپنی تاریخ اور دوسروں کی تاریخ پر لکھتے ہیں تو وہ بھی اسی طرح دہرا انداز اختیار کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کم از کم مسلمانوں کو اس شکایت کا حق نہیں۔

اردن کی آمدنی کا ایک خاص ذریعہ سیاحت ہے۔ اور سیاحوں کے لئے یہاں سب سے زیادہ پرکشش چیز بطرا وغیرہ کے قدیم آثار ہیں۔ یہ آثار جو تاریخی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے اتنے قیمتی ہیں، ان کو پہلی بار سوئزرلینڈ کے ایک سیاح برخارٹ (John Lewis Burckhardt) نے ۱۸۱۲ء میں دریافت کیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بارہ میں ایک یہودی روایت ہے جس کا تعلق اسی عمان (عموا
سے ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ــــــ داؤد نے بادشاہی محل کی چھت سے ایک عورت کو دیکھ
جو نہا رہی تھی۔ وہ نہایت خوبصورت تھی۔ داؤد نے اس عورت کو اپنے محل میں بلایا اور اس سے
صحبت کی۔ اس کے بعد وہ حاملہ ہوگئی۔ اب داؤد نے اس عورت کے شوہر حتی اوریاہ کو عمون کی جنگ
میں بھیج دیا اور سردار فوج سے کہا کہ اس کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے
ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے۔ چنانچہ حتی اوریاہ مارا گیا اور پھر وہ عورت داؤد کی بیوی ہوگئی۔ اس
کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پر اس کام سے جسے داؤد نے کیا تھا خداوند ناراض ہوا (۲۔ سموئیل
باب ۱۱) حضرت داؤد کے یہی فرزند ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کہے جاتے ہیں۔

یہ لغو قصہ قرآن (ص ۲۳) کے تحت خود ہماری تفسیروں میں بھی آگیا ہے۔ مفسرین نے اس
لمبی بحثیں کی ہیں۔ چنانچہ مستشرقین کو موقع مل گیا کہ وہ اس کو قرآن کے ساتھ منسوب کردیں۔ ایک مستشر
نے لکھا ہے کہ داؤد نے اوریا حتی کو ایک جنگ میں قلعہ کی دیوار تک بھیج دیا تاکہ وہ مارا جائے اور وہ اس
کی بیوی سے نکاح کرسکیں۔ یہ واقعہ مسلم کہانیوں کا بھی ایک حصہ ہے :

....the incident is also a part of Muslim folklore (I/317)

عمان کی آبادی تقریباً ۶ لاکھ ہے۔

۱۹۴۸ - ۴۹ میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جو جنگ ہوئی، اس کے بعد فلسطینی پنا
گزیں عمان میں آنے لگے۔ ۱۹۶۷ کی جنگ کے بعد دریائے اردن کے مغرب کا پورا علاقہ اسرائیل کے
قبضہ میں چلا گیا۔ اب فلسطینی پناہ گزیں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ عمان جو پہلے ایک چھوٹا سا قصبہ تھ
اب بہت بڑا شہر بن گیا۔

غالباً ۱۹۶۹ کی بات ہے۔ میری ملاقات اردن کے ایک فلسطینی سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اردن میں
ہماری طاقت اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہم جب چاہیں اردن کی حکومت پر قبضہ کرلیں۔ فلسطینیوں کا یہی ذہ
تھا جس کی بنا پر ۱۹۷۰ میں فلسطینیوں اور حکومت اردن کے درمیان باقاعدہ سول وار چھڑ گئی۔ اردا
نے نہایت فیاضی کے ساتھ فلسطینیوں کو اپنا مہمان بنایا تھا۔ مگر جب یہ نوبت آئی تو حکومت نے نہایت سخ
کے ساتھ ان کو کچل دیا۔ حتی کہ فلسطینی کیمپوں پر بمباری کی گئی۔

ہر آدمی کی ایک حد ہے۔ آدمی اگر اپنی حد پر رہے تو اس کو ہر جگہ کام کے مواقع ملتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو اس کو ہر جگہ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا، خواہ وہ کسی مسلم ملک میں ہو یا غیر مسلم ملک میں۔

عمان سے طرابلس کے لئے اردن ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۴۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں جہاز کے اندر ایک فلسطینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام ناصر عبد الفتاح عامر بتایا۔ ان کی عمر تقریباً ۱۴ سال تھی۔ ان کا خاندان غزہ (فلسطین) میں رہتا ہے۔ فلسطین کے بارہ میں انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ آخر میں میں نے پوچھا کہ فلسطین کے مستقبل کے بارہ میں آپ کیا امید رکھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: تحریر ارض فلسطين وان ارى بلادى تنعم تحت حكم اسلامى (سرزمین فلسطین کی آزادی، اور یہ کہ میں اپنے ملک کو اسلامی حکومت کے تحت خوش حال ہوتا ہوا دیکھوں)

فلسطین کے مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اپنا بہت کچھ کھو دیا ہے، مگر انھوں نے اپنا حوصلہ نہیں کھویا۔ اور حوصلہ بلا شبہہ کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

اس جہاز میں اردن ایئر لائنز کا انگریزی میگزین رائل ونگ (Royal Wings) کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس میں ایک مضمون چھٹی حس (sixth sense) سے متعلق تھا۔ اس میں مختلف نمبر لکھے ہوئے تھے۔ اور ہر نمبر کو دیکھنے سے ایک متعین جواب نکلتا تھا۔ میں نے سرسری طور پر نمبر ۲ کو دیکھا۔ اس نمبر کے تحت حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ملے:

You are blessed with a remarkable ability.
Your powers are alert and working for you.
Don't be afraid of your "sixth sense" but explore it.

میں اس قسم کی چیزوں میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس نوعیت کے مجھے کئی عجیب تجربے ہوئے ہیں۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں وہاں کے کتب خانہ میں مصر کا ایک عربی مجلہ المقتطف آتا تھا جس کو میں دل چسپی سے پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار المقتطف میں اسی قسم کا ایک مضمون آیا۔ اس میں ایک طلسماتی لفظ "ابراکادابیس کاتن" کو پڑھ کر خاص انداز سے اپنے بارہ میں کوئی جواب معلوم کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں میرا امتحان قریب تھا۔ میں نے اسی کے بارہ میں معلوم کیا۔ جواب آیا: ستنجح نجاحاً كبيراً (تم ایک بڑی کامیابی حاصل کرو گے) عجیب بات ہے کہ

اس کے بعد امتحان ہوا تو میں پورے درجہ میں اول آیا۔ اس وقت ہمارے درجہ میں غالباً ۲۴ طالب علم تھے۔

اردن ایئر لائنز کا عربی میگزین " الاجنحۃ " کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ آذار ۱۹۹۰ (صفحہ ۵۸) میں ایک عرب خاتون یمانبیل کا ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا: غرناطۃ الفردوس المفقود (غرناطہ، فردوس گم شدہ)

موصوفہ سیاح کے طور پر غرناطہ گئیں۔ وہاں انھوں نے عرب عہد کے آثار کو دیکھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ غرناطہ میں میں نے عرب تاریخ کو اپنے سامنے پایا اور اپنے ماضی کی عظمت کا مشاہدہ کیا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ وہ وہاں کے ایک ایک پتھر سے پوچھتی رہیں کہ یہاں عرب کی عظمت تھی اور یہیں سے پانچ سو سال پہلے عرب کی ذلت شروع ہوئی (ھنا کان المجد العربی وھنا ایضاً بدأ الذل العربی قبل خمس مائۃ عام)

وہ جذباتی انداز میں لکھتی ہیں کہ عربوں نے یہاں اپنے قلعوں اور محلوں اور مسجدوں کو چھوڑ دیا۔ وہ اس شہر سے عورتوں کی طرح روتے ہوئے نکلے۔ وہ مردوں کی طرح اس کی حفاظت نہ کر سکے (ترکوا قلاعھم وقصورھم ومساجدھم۔ خرجوا من ھٰذہ المدینۃ یبکون مثل النساء۔ ملکا لم یحافظوا علیہ مثل الرجال۔ وخرجتُ من غرناطۃ اطأطئ راسی۔ واسأل نفسی الی متی سیستمر ھٰذا اللیل العربی وماذا سیکتب التاریخ عنّا)

عرب خاتون نے اپنے اس تاثراتی جملہ میں غرناطہ کے آخری سلطان کی ماں کے قول کو دہرایا ہے۔ مگر یہ سادہ معنوں میں مرد اور عورت کا مسئلہ نہیں۔ یہ قومی استعداد کا مسئلہ ہے۔ ۱۷۹۹ میں ٹیپو مرد کی جنگ لڑے مگر وہ ہار گئے۔ ۱۹۷۱ میں اندرا گاندھی ایک عورت تھی مگر وہ پاکستان کے مقابلہ میں جیت گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرد اور عورت کا معاملہ نہیں، بلکہ قومی استعداد اور حالات کا معاملہ ہے۔ اگر حالات موافقت نہ کر رہے ہوں تو کوئی شخص خواہ کتنی ہی زیادہ بہادری کے ساتھ لڑے، وہ مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

جہاز کا بیشتر سفر خشکی کے اوپر ہوا۔ بالائی فضا میں پرواز کرتا ہوا ہمارا جہاز ہندستانی وقت

کے لحاظ سے پانچ بجے بحر روم کے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے سفر کو نہ خشکی کی پستی اور بلندی نے روکا، اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہوا۔ وہ شہری آبادیوں کے اوپر سے بھی اسی طرح تیزی سے گزر گیا جس طرح کھلے میدانوں کے اوپر سے۔

بے شمار لوگ روزانہ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں۔ مگر مسافروں کے چہرے اور ان کی گفتگوئیں بتاتی ہیں کہ اس قدرتی معجزہ کو سوچ کر کسی کے اندر تموج کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ مذہبی انسان ہو یا سیکولر انسان، دونوں قسم کے لوگ ہوائی جہاز کا سفر تو کر رہے ہیں، مگر ہوائی جہاز کے سفر کے دوران ان کا شعور ربانی مسافت طے نہیں کرتا۔ ان کا حال تقریباً اس چوپایہ کا سا ہے جس کو ایک مقام پر جہاز میں بیٹھا یا جائے اور لے جا کر اس کو دوسرے مقام پر اتار دیا جائے۔

اردو کے ایک مرثیہ گو نے قدیم زمانہ میں حضرت حسین اور ان کے خاندان کے لوگوں کے سفر کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا تھا کہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین کو مختصر کر کے ان کا راستہ آسان بنا دو:

طنابیں کھینچ کر کم کر زمیں کو کہ ہووے راہ کم ان مہ جبیں کو

آج اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے لئے زمین کی طنابیں کھینچ کر سفر کو مختصر بنا دیا ہے۔ مگر قرآن کے مطابق انسانوں میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو قابل شکر باتوں کو شدت کے ساتھ محسوس کریں اور شکر کے جذبات سے سرشار ہو جائیں (سبا ۱۳)

ہوائی جہاز کی سواری آج بہت زیادہ عام ہو چکی ہے۔ اس لئے لوگوں کو اس کے غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوائی جہاز اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ ہوائی جہاز نے آج لمبے سفروں کو ہر آدمی کے لئے ممکن بنا دیا ہے۔ ورنہ قدیم زمانہ میں بہت ہی کم افراد لمبے سفر کا حوصلہ کر سکتے تھے۔

لارڈ کرزن ایک بے حد امیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ انیسویں صدی کے آخر میں ہندستان کا بڑے جاہ و جلال کا وائسرائے بنا۔ مگر ۱۸۹۸ء میں جب وہ ہندستان کا وائسرائے ہو کر روانہ ہوا تو لندن سے کلکتہ تک کا سفر طے کرنے میں اس کو سترہ دن لگ گئے۔ اس وقت تک ہوائی جہاز کا سفر رائج نہیں ہوا تھا۔ آج ایک عام آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر چند گھنٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں پہنچ جاتا ہے۔

۱۷ مارچ کو میں نے فجر کی نماز دہلی کے ہوائی اڈہ پر پڑھی تھی۔ اسی دن میں عصر کی نماز کے وقت طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ موجودہ زمانہ میں تیز رفتار سواریوں نے سفر کے معاملہ کو کتنا زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ ہوائی جہاز اپنے اندر سیکڑوں مسافروں کو بٹھا کر ہوا میں اڑتا ہے اور خشکی اور پہاڑ اور سمندر کی ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ لوگوں کو ان کی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ کتنا حیرت ناک واقعہ ہے۔ آج بے شمار لوگ اس سفری سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر ان میں شاید ہی کوئی ہو جس کا حال یہ ہو کہ خدا کی اس عظیم نعمت کو سوچ کر اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ استعجاب (awe) کے سمندر میں غرق ہو کر کہہ اٹھے: فبأی آلاء ربکما تکذبان۔

فلپائن کے ایک صاحب (احمد نوح) سے ائیرپورٹ پر ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن میں سات ملین مسلمان ہیں۔ مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ حتی کہ ان کے بیان کے مطابق سارے فلپائن میں ایک بھی مسلمانوں کا پریس موجود نہیں۔

فلپائن کے ایک علاقے میں مسلمان آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس تحریک آزادی کے لیڈر پہلے صرف مسٹر نور میسواری تھے۔ ہاشم سلامات ان کے نائب تھے۔ اب دونوں میں سخت اختلاف ہو گیا ہے۔ دونوں الگ الگ اپنی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ احمد نوح صاحب دونوں لیڈروں سے ملے۔ انھوں نے نور میسواری سے کہا کہ اگر آپ نے اپنی سیاست کو نہ بدلا تو انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ (ان لم تغیر سیاستك الآن فالثورة ستفشل) مگر دونوں کو متحد کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ فلپائن کے دونوں لیڈر اگرچہ اپنا اختلاف اور علیحدگی کے لئے اصولی الفاظ بولتے ہیں، مگر اصلاً یہ قیادت کا جھگڑا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ وہی جھگڑا ہے جو ہندستان سمیت تمام ملکوں میں پیش آ رہا ہے۔ لوگ اسلام کے نام پر اٹھتے ہیں۔ کام شروع کرتے ہیں۔ مگر جلد ہی بعد ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی سرگرمیاں حقیقۃً اسلام کے لئے ہوتیں تو اختلاف کے وقت ایک شخص پیچھے ہو جاتا اور پھر اختلاف اپنے آپ ختم ہو جاتا۔ مگر جب اصل مقصد لیڈری ہو اور اسلام کا نام محض نعرہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو ہمیشہ ایسا ہی

پیش آتا ہے۔

طرابلس میں میرا قیام فندق المہاری (کمرہ ۱۲۷) میں تھا۔ یہ ہوٹل بحر روم کے کنارے واقع ہے۔ ایک طرف خشکی کے مناظر ہیں، اور دوسری طرف سمندر کی موجیں حد نظر تک متحرک نظر آتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب احسان ہے۔ انسان کو پانی کی ضرورت تھی۔ پانی کو اگر سطح ارض پر پھیلا دیا جاتا تو انسان کے لئے رہنے کی جگہ باقی نہ رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں بڑی بڑی گہرائیاں پیدا کیں اور ان میں پانی کو بھر دیا۔ مزید یہ کہ اس پانی میں نمک کا جزء شامل کر دیا تاکہ وہ کبھی خراب نہ ہونے پائے۔ اس سمندر کے بے شمار فائدے ہیں جن کو کسی انسائیکلو پیڈیا میں بھی شمار کرنا ممکن نہیں۔ آدمی اگر اس معاملہ کا احساس کرے تو اس کے سینہ میں وہی تلاطم مزید شدت کے ساتھ پیدا ہو جائے جو سمندر کی سطح پر ہر آن جاری رہتا ہے۔

اس ہوٹل میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے عین سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک خوبصورت مسجد تھی۔ اذان کی آواز کمرہ تک پہنچتی تھی۔ اور یہ ممکن تھا کہ بآسانی وہاں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاسکے۔ دنیا کے ساتھ دین کا یہ جوڑ اگر مسلمان کی پوری زندگی میں آجائے تو زندگی ہر اعتبار سے کتنی بہتر ہو جائے۔

سفر کے دوران ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمانہ میں جو نئے وسائل انسان کے قبضہ میں دئے ہیں، وہ ابھی تک دین کی اشاعت کے لئے استعمال نہ ہوسکے۔ مثال کے طور پر ہوائی جہاز نے سفر کو کتنا زیادہ تیز رفتار بنا دیا ہے، مگر وہ عام طور پر صرف دنیوی اغراض کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔

مذکورہ بزرگ نے ایک "عالمی تحفظ نبوت کانفرنس" میں شرکت کی تھی۔ وہ کہنے لگے کہ آپ ایسا کس طرح کہتے ہیں۔ دیکھئے فلاں مقام پر مسلمانوں نے بڑے پیمانہ پر تحفظ نبوت کانفرنس کی۔ اس میں ساری دنیا کے مسلم علماء جمع ہوئے۔ اگر ہوائی جہاز کا استعمال نہ کیا جاتا تو اتنی وسیع انداز کی عالمی کانفرنس منعقد کرنا ممکن نہ ہوتا۔

میں نے کہا کہ "تحفظ نبوت کانفرنس" کو میں کوئی اسلامی کام نہیں سمجھتا۔ اس پر وہ حیرت میں پڑ گئے۔ میں نے کہا کہ اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری تو خود خدا نے لے لی ہے۔ اس دین کو لانے

والے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے ابدی طور پر مقام تعریف (مقام محمود) پر کھڑا کر دیا ہے۔ اس کی حفاظت آپ کیا کریں گے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام آپ کے تحفظ سے مستغنی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "تحفظ نبوت کانفرنس" کرنا اتنا ہی بے معنی ہے جتنا "تحفظ آفتاب کانفرنس" کرنا۔ پیغمبر اسلام کو اس کی ضرورت نہیں کہ مسلمان ان کا تحفظ کریں۔ پیغمبر اسلام کے امتی ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ آپ کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچائیں (بلغوا عنی ولو آیۃ) آج مسلمانوں کی ذمہ داری اشاعت نبوت ہے نہ کہ تحفظ نبوت۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جو کرنا ہے اس کو کرتے نہیں، اور جو نہیں کرنا ہے اس کے لئے دوڑتے ہیں۔

اس سفر میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک عرب نوجوان نے ۱۸ مارچ کی ملاقات میں بڑی عجیب بات بتائی۔ انھوں نے راقم الحروف کی عربی کتابیں پڑھی ہیں اور الرسالہ مشن سے واقف ہیں۔ تاہم وہ میرے احوال اور میری مشکلات سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ انھیں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے خلاف لوگوں نے مخالفت کا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ حتی کہ مجھے "اہانت امت" کی سزا دینے کا فتویٰ دیا جا رہا ہے۔

مذکورہ عرب نوجوان نے بتایا کہ فروری ۱۹۹۰ میں انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ ایک مکان میں ہیں۔ ہم لوگ سخت خطرے میں گھرے ہوئے ہیں اور بے حد پریشان ہیں۔ اس دوران مذکورہ عرب نوجوان گھر سے باہر نکلے تاکہ حالات کا اندازہ کریں۔ اتنے میں انھوں نے دیکھا کہ سامنے کی سڑک سے حضرت عمر فاروق گزر رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق وہاں سے گزرے۔ وہ وہاں ٹھہر گئے اور مذکورہ عرب نوجوان سے کہا:

قل لوحید الدین واصحابه ، اخرجوا ولا تخافوا ، انتم فی حمایة الله

ایک اور عرب جنھوں نے اپنا نام العیساوی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی اکثر عربی مطبوعات پڑھی ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمارے مشن کا خلاصہ آپ نے کیا سمجھا ہے۔ انھوں نے کہا: هٰذه الرسالة تقدم الهدف الاساسی للانسان۔ نحن مخلوقون للآخرة ، والامور الاخری تخضع للاحوال والظروف۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے خود اس سے کیا تاثر لیا۔ ان کا جواب یہ تھا: حولتنی من مسلم مادی الی مسلم صرف۔ یعنی اس نے مجھے مادی سوچ والے مسلمان سے

بدل کر خالص مسلمان بنا دیا۔

کئی عربوں نے میرے بارہ میں اور اسلامی مرکز کے مشن کے بارہ میں اپنے خواب بتائے جو نہایت عجیب اور بظاہر ناقابل قیاس تھے۔ مثلاً ایک عرب نوجوان نے کہا کہ میں نے آپ کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میرے پاس عربی لباس نہیں۔ اس پر عرب نوجوان نے کہا کہ میرے پاس دو عربی لباس ہیں۔ ان میں سے ایک میں آپ کو دے دیتا ہوں۔

ایک اور عرب نے بتایا کہ خواب میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ اس وقت میں نے ان سے جو گفتگو کی وہ انگریزی زبان میں تھی۔ میں نے انگریزی داں قوموں میں اسلام کی اشاعت کی ضرورت پر زور دیا۔ وغیرہ۔

پاکستان کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ فکری تعلیم کا کام تو بہت اچھا کر رہے ہیں، مگر عملی انقلاب کے لئے ابھی تک آپ نے کوئی پروگرام شروع نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ "عملی انقلاب" نتیجہ کا نام ہے نہ کہ کوشش کا۔ میں نے کہا کہ ہر انقلاب در اصل حالات کے انفجار کا نام ہے۔ مثلاً ایران کا انقلاب اینٹی شاہ جذبات کے ابل پڑنے کا نام تھا۔ وہ تمام واقعات جن کو انقلاب کہا جاتا ہے، ان کی صورت یہی تھی کہ رائج الوقت نظام کے خلاف ناراضی پیدا ہوئی۔ یہ ناراضی اندر اندر پکتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ تخریبی لاوا کی صورت میں ابل پڑی۔

تمام انقلابات تخریبی لاوا کے ابل پڑنے کے نتیجہ میں ظہور میں آئے ہیں۔ تاریخ میں ایک ہی انقلاب اس سے مستثنیٰ ہے، اور وہ پیغمبر اسلام کا انقلاب ہے۔ پیغمبر اسلام کا لایا ہوا انقلاب بھی ایک لاوا کے پھٹنے سے ظہور میں آیا۔ مگر یہ تعمیری لاوا تھا، نہ کہ دوسرے انقلابات کی طرح تخریبی لاوا۔

پیغمبر اسلام کے انداز کا انقلاب لانے کے لئے تعمیری لاوا تیار کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ صرف تعمیر شعور کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ الرسالہ مشن اس وقت یہی کام کر رہا ہے۔ یہ مشن گویا ایک تعمیری لاوا پکا رہا ہے۔ جس دن یہ لاوا پک کر تیار ہو گا وہ اپنے آپ پھٹ پڑے گا۔ مگر اس کا پھٹنا خاموش تعمیری انقلاب کی صورت میں ہوگا نہ کہ پرشور تخریب کاری کی صورت میں جس کے نمونے آج جگہ جگہ نظر آ رہے ہیں۔ (باقی)

۱۔ فروری ۱۹۹۰ کے تیسرے ہفتہ میں کتابوں کی نویں بین اقوامی نمائش (ورلڈ بک فیر) نئی دہلی کے پرگتی میدان میں ہوئی۔ ۱۹۷۲ میں اس قسم کی پہلی نمائش ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے ہر دو سال بعد ہوتی ہے۔ پہلی نمائش میں ۲۰۰ کتابی اداروں نے شرکت کی تھی، اس بار مختلف ملکوں کے ۴۰۰ سے زائد اداروں نے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کا اسٹال بھی رکھا گیا۔ بہت سے لوگوں نے کتابیں دیکھیں اور حاصل کرکے لے گئے۔

۲۔ ہندستان کے صنعتی شہر مراد آباد سے ایک پندرہ روزہ اخبار " جانکاری " کے نام سے جاری ہوا ہے۔ یہ بیک وقت اردو اور ہندی میں شائع ہوتا ہے۔ جانکاری میں الرسالہ کے مضامین اور تذکیر القرآن کے حصے مستقل شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کی دعوت ایک نئے عوامی حلقہ میں پہنچ رہی ہے۔ یہ اخبار یکم جنوری ۱۹۹۰ سے چھپنا شروع ہوا ہے۔

۳۔ جرمنی کی ایک خاتون پروفیسر ڈگمار برنشراف ۱۶ فروری ۱۹۹۰ کو اسلامی مرکز میں آئیں:

Dr Dagmar Bernstorff, Executive Director,
Center for the Study of Indian Politics and Society,
Heidelberg, West Germany.

وہ ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک پیپر تیار کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہا۔ آخر میں انھیں مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات برائے مطالعہ دی گئیں۔ صدر اسلامی مرکز نے خاص طور پر اس پہلو پر زور دیا کہ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی تعلیمی پسماندگی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بےشعوری ہے۔ اسی بےشعوری کا ایک نقصان یہ ہے کہ موجودہ مسلم قوم اپنے استحصال پسند لیڈروں کی شکارگاہ بن کر رہ گئی ہے۔

۴۔ مہاراشٹر یونیورسٹی ٹیکسٹ بک پروڈکشن بورڈ کے تحت امراوتی یونیورسٹی نے " انتخاب اردو " کے نام سے ایک سلسلۂ کتب شائع کیا ہے۔ اس کا تیسرا حصہ بی اے کے طلبہ کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ کتاب (انتخاب اردو، حصہ سوم) ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صدر اسلامی مرکز

کا پانچ صفحات کا ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے: ایٹمی ہلاکت۔

۵۔ مولانا محمد یوسف ندوی نے بتایا کہ بھوپال میں ۲۳-۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ کو تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع تھا۔ اجتماع کے پہلے دن انھوں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک آدمی کتابیں پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ قریب جاکر دیکھا تو دسمبر اور جنوری کا الرسالہ تقریباً دو سو تھا۔ اس کے علاوہ الرسالہ کی کچھ مطبوعات بھی تھیں۔ پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں تو الرسالہ کا دیوانہ ہوں۔ اس آواز کو تمام انسانوں تک پہنچانا ہی میرا مشن ہے۔ ان کے تمام رسالے اور کتابیں پہلے دو دن کے اندر ختم ہو گئیں۔ یہ پربھنی کے جناب عبد اللہ صاحب تھے۔

۶۔ ۱۰ فروری ۱۹۹۰ کو گول مارکٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ہوئی۔ اس کا موضوع "مسلمانان ہند کے موجودہ مسائل اور ان کا قرآنی حل" تھا۔ تقریر سوا گھنٹہ کی تھی۔ اس کا کیسٹ مرکز میں محفوظ ہے۔

۷۔ ۸ فروری ۱۹۹۰ کو آصف علی روڈ پر ایک مشترکہ اجتماع تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں خصوصیت سے اس بات پر زور دیا گیا کہ اس وقت ملک میں سب سے زیادہ ضروری کام ہندو مسلم منافرت کو ختم کرنا ہے۔ اس کام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہندو ہندوؤں کو سمجھائیں اور مسلمان مسلمانوں کو نصیحت کریں۔ مسلمانوں کا ہندوؤں کو نصیحت کرنا اور ہندوؤں کا مسلمانوں کو نصیحت کرنا مفید نہیں ہو سکتا۔

۸۔ جناب حکیم الدین صاحب نے بتایا کہ انھوں نے ضلع اعظم گڈھ کے مختلف مدرسوں اور کتب خانوں میں جاکر اس کے ذمہ داروں سے ملاقات کی اور اسلامی مرکز کی مطبوعات انھیں دکھائیں۔ لوگوں نے پسند کیا اور کافی مقدار میں کتابوں کی فرمائش کی۔ چنانچہ وہ مکتبہ الرسالہ سے کتابیں حاصل کر کے انھیں سپلائی کر رہے ہیں۔ اس نوعیت کا کام دوسرے مقامات پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ کئی کتابوں کے عربی ترجمے تیار ہو کر طباعت کی منزل میں ہیں۔ ان میں "دین کامل" بھی شامل ہے۔ تذکیر القرآن کا عربی ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ تقریباً سورہ البقرہ تک ترجمہ ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ دونوں جلدوں کا مکمل عربی ترجمہ تیار کیا جائے گا۔

۱۰۔ متعدد مقامات کے تبلیغی حضرات نے بتایا کہ ان کے یہاں کے تعلیم یافتہ افراد تبلیغ میں نہیں نکلتے

تھے اور تبلیغ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں کو الرسالہ پڑھایا گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ تبلیغ میں نکلے اور اس میں شامل ہو کر کام کرنے لگے۔ ان تبلیغی حضرات نے کہا کہ الرسالہ ہمارے لئے ایک تبلیغی ہتھیار ہے۔

۱۱۔ غازی آباد سے ایک پندرہ روزہ اخبار "اودھ اخبار" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہر اشاعت میں الرسالہ کے مضامین اہتمام کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ اس طرح ایک نئے حلقہ میں الرسالہ کی دعوت مسلسل پہنچ رہی ہے۔

۱۲۔ عربی مدارس میں الرسالہ بہت مقبول ہو رہا ہے۔ مثلاً ایک عربی مدرسہ کے طلبہ لکھتے ہیں: ہم طلبہ اس رسالہ کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور بڑی دل چسپی سے مطالعہ کرتے ہیں اور یہ ہمارے لیے بے حد مفید اور کارآمد ہے اس پرچہ کی رسائی ہوتے ہی ہم طلبہ ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے تمام مضامین شستہ اور معیاری ہوتے ہیں

۱۳۔ جناب کلیم الدین صاحب حیدرآبادی الرسالہ مشن سے خصوصی دل چسپی رکھتے ہیں۔ آج کل وہ نیو یارک میں مقیم ہیں۔ انھوں نے مطلع کیا ہے کہ وہ وہاں الرسالہ انگریزی اور الرسالہ کی انگریزی مطبوعات کے ذریعہ دعوتی کام کر رہے ہیں۔ الرسالہ کیسٹ بھی لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔

۱۴۔ الرسالہ کے مطالعہ سے بہت سے نوجوانوں میں یہ جذبہ پیدا ہوا ہے کہ برادران وطن تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ انھیں میں سے ایک سید عبد اللطیف صاحب (حیدرآباد) اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دعوتی کام کر رہے ہیں اور مختلف طریقوں سے غیر مسلمین تک دعوت پہنچا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس سلسلہ میں الرسالہ خصوصی طور پر ان کے لئے مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

۱۵۔ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس میں ایسے نئے دلائل اور نئی مثالیں ملتی ہیں جن کو وہ اپنی تقریروں میں پیش کریں۔ مثلاً شیخ محمد اقبال (کراچی) لکھتے ہیں کہ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں، اس کے علاوہ کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں ان کی باتوں کو لے کر بیان کرتے ہیں، لوگ بہت دل چسپی سے سنتے ہیں اور اثر قبول کرتے ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۴ جولائی ۱۹۹۰

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

آخری انجام

جنرل نوریگا (Manuel Antonio Noriega) نے پناما میں فوجی انقلاب کرکے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ پناما کے ڈکٹیٹر بن گئے۔ انھوں نے اقتدار کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بے شمار دولت اور جائداد اکٹھا کر لی۔ مگر اپنی پالیسیوں سے انھوں نے امریکہ کو ناراض کر لیا۔ امریکہ نے دسمبر ۱۹۸۹ میں پناما میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ جنرل نوریگا اپنا عالی شان محل چھوڑ کر بھاگے اور ویٹیکن کے سفارت خانہ میں پناہ لی۔ مگر یہ پناہ ان کے کام نہ آسکی۔ امریکہ نے ویٹیکن پر دباؤ ڈالا۔ یہاں تک کہ اس نے ۳ جنوری ۱۹۹۰ کو جنرل نوریگا کو امریکی سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶ جنوری ۱۹۹۰)

۳ جنوری کا وہ منظر بہت عبرت ناک تھا جب جنرل نوریگا ویٹیکن مشن سے ایک ہارے ہوئے انسان کی حیثیت سے باہر نکلے اور امریکی سپاہیوں نے فوراً ہی ان کے ہاتھ کو ہتھکڑیوں میں جکڑ دیا۔ اے پی کے رپورٹر کے الفاظ میں، جنرل نوریگا کا خاندان، دوست، محبت کرنے والے، دولت اور پسند کرنے والوں کی بھیڑ سب ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ کل تک جو شخص ایک طاقت ور انسان تھا، آج اس کے لیے دنیا میں کوئی جگہ نہ تھی جہاں وہ جا سکے۔

ایک مبصر کے الفاظ میں، جنرل نوریگا کو شاید ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک اندھیری سرنگ میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ مشن کی عمارت میں بھی تنہا تھے اور اس کے باہر بھی تنہا۔ ان کے میزبانوں نے انھیں یاد دلایا کہ وہ ان کے یہاں صرف ایک ناپسندیدہ مہمان تھے۔ پچھلے ایک ہفتے سے جنرل نوریگا ویٹیکن مشن کے ایک بند کمرہ میں خاموش پڑے ہوئے تھے۔ یہاں ان کے کان ایسے گانے سننے پر مجبور تھے جس میں کہا گیا تھا کہ اب تمہارے لیے کہیں بھاگنے کی جگہ نہیں، تمہارے لیے چھپنے کا کوئی مقام نہیں :

No where to run, Nowhere to hide.

جنرل نوریگا کی یہ کہانی ہر انسان کی کہانی ہے۔ جو کچھ جنرل نوریگا کے ساتھ اس دنیا میں پیش آیا، وہی تمام انسانوں کے ساتھ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ ہر آدمی بالآخر گرفتار ہو کر خدا کی عدالت میں حاضر کیا جانے والا ہے۔ ہر آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ ہر آدمی کو یہ صورت حال پیش آنی ہے کہ وہ محسوس کرے گا کہ میرے لیے نہ بھاگنے کی کوئی صورت ہے اور نہ چھپنے کی کوئی جگہ۔

مقابلہ کی ہمت

۶ جنوری ۱۹۹۰ کے اخبارات جو خبریں لائے، ان میں سے ایک خبر یہ تھی کہ اظہر الدین کو اتفاق رائے سے قومی ٹیم کا کیپٹن مقرر کیا گیا ہے۔ وہ نیوزی لینڈ جانے والی انڈین کرکٹ ٹیم کے لیڈر ہوں گے۔ یہ بات کرکٹ حلقوں کے لیے انتہائی تعجب خیز تھی۔ کیوں کہ عام خیال تھا کہ یہ عہدہ سری کانت کو دیا جائے گا جو شارجہ کپ، نہرو کپ اور پاکستان کے دورہ پر جانے والی حالیہ ٹیم کے کپتان رہے ہیں۔ ۲۷ سالہ اظہر الدین حیدرآبادی کو کرکٹ میں ان کی مہارت کی وجہ سے ونڈر بوائے (wonder boy) کہا جاتا ہے۔ اظہر الدین ہندستانی کرکٹ کے دوسرے کم عمر کپتان ہیں۔ ان سے قبل منصور علی خان پٹودی ۲۱ سال کی عمر میں قومی ٹیم کے کپتان بنائے گئے تھے۔

اظہر الدین کو جس چیز نے اس اعلیٰ عہدے پر پہونچایا، وہ ان کی یہ صلاحیت ہے کہ چیلنج پیش آنے پر وہ بے ہمت نہیں ہوتے، بلکہ مزید طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۹ میں دورۂ پاکستان کے آغاز میں اظہر الدین کا ٹسٹ کیریر خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ کیوں کہ فیصل آباد ٹسٹ کی پہلی باری میں وہ کوئی خاص اسکور نہ کر سکے تھے۔ بلکہ صفر پر ہی آوٹ ہو گئے تھے۔ لیکن دوسری باری میں شاندار سنچری بنا کر انھوں نے اپنا ٹسٹ کیریر تباہ ہونے سے بچا لیا۔

ٹائمس آف انڈیا (۶ جنوری ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق، سلکشن کمیٹی کے چیرمین مسٹر راج سنگھ دونگرپور نے کہا کہ اظہر الدین کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کو محبوب رکھتے ہیں، جیسا کہ پاکستان کے دورہ میں دیکھا گیا جہاں وہ پہلے ٹسٹ میں چھنہ نہ جانے کے قریب پہونچ گئے تھے۔ اور یہ قیادت کی نہایت اہم خصوصیت ہے:

He loves getting out of challenging situations, as was seen on the tour of Pakistan where he was on the verge of being dropped from the first Test, and that's an important ingredient in leadership.

یہ دنیا چیلنج کی دنیا ہے۔ یہاں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو چیلنج کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ یہ صفت کسی آدمی کے اندر جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ بڑی کامیابی وہ اس دنیا میں حاصل کرے گا۔

ایک جائزہ

ظہیرالدین محمد بابر (۱۵۳۰-۱۴۸۳) نے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ ۱۵۱۹ میں برصغیر ہند میں داخل ہوا۔ مختلف لڑائیوں کے بعد آخرکار ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرکے مغل سلطنت کا آغاز کیا۔ بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا۔

جلال الدین محمد اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) ہمایوں کا بیٹا تھا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد ۱۵۵۶ میں وہ مغل تخت پر بیٹھا۔ اس وقت مغل سلطنت ایک غیر مستحکم سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مغلوں کی حیثیت ایک بیرونی حملہ آور کی تھی اور اس بنا پر یہاں کے قدیم باشندوں میں ان کے خلاف ناراضگی پائی جاتی تھی۔ اس ناراضگی کو ختم کرنے کے لیے اکبر نے وہ تدبیر کی جو عام طور پر دین الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔ دین الٰہی حقیقۃً کوئی دین نہ تھا، وہ ملک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کو ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ اپنے ظاہری بھونڈے پن کے باوجود یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ اکبر اس میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اپنے سیاسی استحکام کے لیے ملک کی اکثریت کا تعاون حاصل کر سکے۔

اکبر نے یہ کام اگرچہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے کیا تھا۔ مگر جب ملک میں ہندو مسلم نفرت ختم ہوئی تو اس کا فائدہ اسلام کو بھی پہونچنے لگا۔ لوگ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے۔ اکبر سے لے کر شاہجہاں تک لاکھوں کی تعداد میں مقامی باشندے اسلام میں داخل ہوئے۔ اس میں سب سے بڑا دخل اسی معتدل فضا کا تھا جو اکبر کی پالیسی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔

اکبر کی نیت کے بارہ میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ تاہم اگر بالفرض وہ اتنا ہی برا ہو جتنا کہ کچھ لوگ اس کو سمجھتے ہیں، تب بھی ہمارے مذکورہ تجزیہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ اکبر کی میل ملاپ کی پالیسی کے نتیجہ میں ہندستان میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ نتیجہ کی حد تک یہ واقعہ بدستور مسلّم ہے۔ البتہ اگر وہ بالفرض ایک غلط آدمی رہا ہو تو اس کا معاملہ اس حدیث کے تحت شمار کیا جائے گا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ:

ان اللّٰہ لیؤید ھذا الدین برجل ... بے شک اللہ اس دین کی مدد فاجر آدمی کے ذریعہ

فساجب   بھی کرے گا۔

آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ – ۱۶۱۸) کے زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات دوبارہ خراب ہو گیے۔ اورنگ زیب نے اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں سے راجپوت مراٹھا اور سکھ، ہر ایک کو اپنا مخالف بنا لیا۔ حتیٰ کہ عام ہندو بھی اس کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ میں از سر نو کشیدگی کا ماحول قائم ہو گیا۔ اسلام کے پھیلنے کا جو عمل اکبر کے بعد اپنے آپ جاری ہوا تھا، وہ رک گیا۔ ہندو مسلم منافرت کی بنا پر وہ معتدل ماحول ختم ہو گیا جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔

اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت زوال کا شکار ہو گئی۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد صوفیا کو کھڑا کیا۔ سارے ملک میں صوفیا اپنی خانقاہیں بنا کر بیٹھ گیے۔ ان کا خاص مقصد لوگوں کو محبت کا پیغام دینا تھا۔ صوفیا کو اپنے اس مشن میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقہ میں شامل ہو گیے۔ یہاں تک کہ صوفیا ہی سماج کا وہ عنصر بن گیے جو سماج کے اوپر سب سے زیادہ اثر رکھتا تھا اور لوگوں کے مزاج کی تشکیل کرتا تھا۔

بابر کی پیدا کی ہوئی نفرت کو اکبر نے ختم کیا تھا، اورنگ زیب کی پیدا کی ہوئی نفرت کو صوفیا نے ختم کیا۔ اس کے بعد دوبارہ وہ معتدل فضا قائم ہو گئی جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بعد اگرچہ مغل سلطنت پر زوال آ گیا، مگر اسلام کی اشاعت تیزی سے جاری ہو گئی۔ اس دور میں دوبارہ لاکھوں لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیے۔

اسلام کی اشاعت کا یہ عمل بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ مسٹر محمد علی جناح (۱۹۴۸ – ۱۸۷۶) کا ظہور ہوا۔ انھوں نے دو قومی نظریہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں سے الگ ہیں اور مسلمان ہندوؤں سے الگ۔ یہ علاحدگی اگر صرف اعتقادی معنوں میں ہوتی تو اس میں کوئی خاص خرابی نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے اس علاحدگی کو جغرافی مفہوم دیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دو قومی گروہوں کے درمیان نفرت اور مقابلہ آرائی ایک مستقل سیاسی اصول بن گیا۔

دو قومی نظریہ حقیقۃً دو قوموں کے درمیان نفرت کے ہم معنی تھا۔ مخصوص اسباب کے تحت اس نظریہ کو مسلمانوں کے درمیان زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ پورے ملک میں دو قومی نفرت

ایک نئی فصل آگ آئی۔ ہندو مسلم نفرت ہی دونوں فرقوں کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ اس زہریلی سیاست کی تکمیل ۱۹۴۷ میں ہوئی جب کہ پاکستان کی صورت میں دونوں فرقوں کے درمیان نفرت کی ایک ایسی دیوار کھڑی ہو گئی جو دیوار برلن سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔

بیسویں صدی کے وسط سے دوبارہ اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا کام رک گیا ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ مسٹر جناح کی وہ سیاست ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا کر دی۔ اب دوبارہ زمین و آسمان کو کسی ایسے دن کا انتظار ہے جب کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت کا یہ ماحول ختم ہو اور اسلام کی اشاعت کا دروازہ دوبارہ کھل جائے جس طرح وہ اس سے پہلے کھلا ہوا تھا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ تحریف سے پاک ہے۔ لمبی تاریخ کے نتیجہ میں وہ ایک قائم شدہ دین بن چکا ہے۔ اسلام کی ان خصوصیات نے اب اس کے اندر یہ طاقت پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے آپ پھیلے۔ وہ خود اپنے زور پر انسانوں کے دلوں میں داخل ہو۔ خود بخود اشاعت کے اس عمل میں واحد رکاوٹ یہ ہے کہ اسلام اور اس کی مدعو قوموں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا ہو جائے۔ اسلام کی اشاعت کے لیے اب مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے کسی عمل سے ایسی غیر موافق فضا پیدا نہ ہونے دیں۔ اگر مسلمان صرف اتنا کر سکیں تو اسلام اپنے آپ لوگوں کے اندر نفوذ کرنے لگے گا۔ اس کے بعد اسلام کی توسیع و اشاعت کے لیے کسی براہ راست جدوجہد کی ضرورت نہیں۔

تبلیغی جماعت کا اصل نشانہ اگرچہ مسلمانوں کی دینی اصلاح ہے۔ مگر اس کے ذریعہ سے منافرت کو ختم کرنے کا وہ کام بالواسطہ طور پر انجام پا رہا ہے جو اس سے پہلے صوفیار کے ذریعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر انجام پایا تھا، اگر یہ عمل قابل لحاظ حد تک بڑھ جائے تو انشاء اللہ اشاعت اسلام کا رکا ہوا کام دوبارہ ملک میں جاری ہو جائے گا۔

سب سے بڑی ضمانت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تقویٰ والے لوگ اللہ کے محبوب ہیں (التوبہ ۳۶) ان کے لئے نہ خوف ہے اور نہ غم (الاعراف ۳۵) ان کے لئے خدا آسانی پیدا کرتا ہے (اللیل ۵) ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے (آل عمران ۱۷۲) ان کے لئے زمین و آسمان کی برکتیں کھول دی جاتی ہیں (الاعراف ۹۶) ان کو اللہ کی خصوصی مدد ملتی ہے (آل عمران ۱۲۵) ان کے لئے اللہ گنجائش اور کشادگی پیدا کرتا ہے (الطلاق ۲) ان کے معاملات میں آسانی پیدا کی جاتی ہے (الطلاق ۴) وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں (النور ۵۲) انجام کار صرف ان کے لئے ہے (القصص ۸۳) وغیرہ۔

تقویٰ اہل ایمان کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ مخالفوں اور دشمنوں سے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ تقویٰ سے یہ عظیم فائدے کس طرح حاصل ہوتے ہیں، اس کے لئے مندرجہ ذیل روایت پر غور کیجئے:

ان عمر بن الخطاب سأل أُبَيَّ بن كعب عن التقوىٰ۔ فقال له اما سلكت طريقاً ذا شوك۔ قال بلىٰ۔ قال فما عَملتَ۔ قال شمرت و اجتهدت۔ قال فذالك التقوىٰ۔

(تفسیر ابن کثیر ۱/۴۰)

حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کبھی ایسے راستہ پر نہیں چلے جہاں کانٹے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر آپ نے کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے دامن سمیٹ لئے اور خوب بچ بچ کر چلا۔ انھوں نے کہا کہ بس یہی تقویٰ ہے۔

ابن المعتز نے تقویٰ کے اسی مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

خل الذنوب صغیرها وکبیرها ذاك التقىٰ ۔۔۔ واصنع کماش فوق ارض الشوك یحذر ما یریٰ

تقویٰ یہ ہے کہ تم چھوٹے اور بڑے گناہوں کو چھوڑ دو، اور کانٹے دار زمین پر چلنے والا جس طرح بچ بچ کر چلتا ہے، اسی طرح تم بھی کرو۔

تقویٰ (و ق ی) کا اصل مفہوم بچاؤ ہے۔ یعنی اذیت اور ضرر والی چیزوں سے بچ کر رہنا (مفردات راغب اصفہانی)، نجات اور کامیابی کو تقویٰ کے عمل سے وابستہ کرکے اللہ تعالیٰ نے زندگی

کا اہم ترین راز بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی کو حاصل کرنے کی سب سے ضروری شرط ناکامی کے اسباب سے بچنا ہے۔ اس دنیا میں فائدہ اپنے آپ آرہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی ان نقصان والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے جو آتے ہوئے فائدے کو اس کی طرف آنے میں مانع بن جائیں۔

گویا فائدہ اور کامیابی کا معاملہ عین وہی ہے جو سورج کا معاملہ ہے۔ سورج کی روشنی اپنے آپ ہر آدمی کی طرف بے پناہ مقدار میں آرہی ہے۔ آدمی کے ذمہ جو کام ہے، وہ صرف یہ کہ وہ اپنے اور سورج کی روشنی کے درمیان کسی چیز کو آڑ یا رکاوٹ نہ بننے دے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لئے بھی آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے بچے جو آنے والی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی ہوں۔ آدمی نے اگر اس کا اہتمام کر لیا تو کامیابی اس کی طرف آکر رہے گی۔ وہ کسی حال میں رکنے والی نہیں۔

اس تقویٰ کا ایک پہلو یہ ہے کہ نفس اور شیطان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ اور ان سے دور رہتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ مثلاً خدا کی یاد سے غافل ہونا۔ آخرت کی پکڑ سے نہ ڈرنا، خدائی حدوں کو توڑنا۔ اخلاق اور معاملات میں من مانی کارروائی کرنا۔ مخلوقات کی پرستش میں مبتلا ہونا، اس قسم کی تمام چیزیں انسان کو گھاٹے میں ڈالنے والی ہیں۔ وہ آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتی ہیں۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ان چیزوں سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائے۔ جو ایسا کرے گا وہی جنت میں پہنچے گا۔

یہ تقویٰ جو اہل ایمان کے لئے آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے، وہی ان کی دنیا کی کامیابی کا ضامن بھی ہے۔ جو متقیانہ روش ان کی آخرت کو سنوارتی ہے، وہی ان کی دنیا کو سنوارنے کا بھی یقینی ذریعہ ہے۔

اس دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں اور شریر لوگ بھی۔ یہ شریر لوگ بدکلامی کریں گے۔ وہ طرح طرح سے تکلیف پہنچائیں گے۔ وہ اشتعال انگیز کارروائیاں کریں گے۔ وہ اسلام کے خلاف سازشیں کریں گے۔ وہ ایسے کام کریں گے جن سے اہل ایمان کے جذبات میں برہمی پیدا ہو جائے۔ مگر ایسے تمام مواقع پر اہل ایمان کو ہمیشہ صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہنا ہے۔ برے انسان ان کی راہ میں کانٹے بچھائیں گے، مگر انھیں ان کانٹوں سے بچ کر اپنی زندگی کا راستہ طے کرنا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی کا راز کانٹوں سے بچنا ہے نہ کہ کانٹوں سے الجھنا۔

دین میں تحریف

قدیم زمانہ مائتھالوجی (mythology) کا زمانہ تھا۔ اس کے تحت مشرک قوموں میں تجسد یا تجسیم (incarnation) کا عقیدہ رائج ہوگیا۔ مثلاً رومی اور یونانی سورج کو دیوتا قرار دے کر اس کو پوجتے تھے اور اس کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔

یہود و نصاریٰ نے بھی اپنے بگاڑ کے زمانہ میں اس عقیدہ کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ عزیر اور مسیح کو پیغمبر کہنا انھیں رومیوں اور یونانیوں کے خدائی باپ (divine fatherhood) کے نظریہ کے مقابلہ میں کمتر محسوس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ مشرک قوموں کی زبان کو اپنا کر وہ کہنے لگے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مسیح خدا کے بیٹے ہیں (التوبہ ۳۰)

قرآن میں اس مذہبی تقلید کو مضاہاۃ کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ یہود و نصاریٰ ان لوگوں کی بات نقل کر رہے ہیں جنھوں نے خدا کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اللہ انھیں غارت کرے، یہ لوگ اپنی گمراہی میں کدھر بہکے جا رہے ہیں (التوبہ ۳۰)

مضاہاۃ کی یہ گمراہی موجودہ زمانہ میں ایک اور صورت میں مسلمانوں کے اندر داخل ہوگئی ہے۔ وہ ہے اسلام کو "نظام" کی اصطلاحوں میں بیان کرنا۔ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ کے بہت سے لوگ نظامی طرز فکر سے متاثر ہیں۔ مگر یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی گمراہی ہے جس میں پچھلی امتیں گمراہ قوموں کے زیر اثر مبتلا ہوئیں۔

موجودہ زمانہ میں سوشلزم اور ڈیموکریسی جیسے سماجی اور سیاسی نظریات ظاہر ہوئے۔ ان کے اثر سے یہ ہوا کہ جدید انسان نظامی انداز میں سوچنے لگا۔ فرد کی نجات اُس کو اس میں نظر آنے لگی کہ اجتماعی ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ دوبارہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کو اسلام کا روایتی تصور کمتر دکھائی دینے لگا۔ انھوں نے اپنے آپ کو وقت کے ہم سطح بنانے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام ایک سیاسی نظام ہے۔ وہ اجتماعی انقلاب کا علمبردار ہے، وغیرہ۔

وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں انقلابی تفکیر کہا جاتا ہے۔ وہ مبنی بر نظام (system-based)

تکفیر ہے۔ مگر اسلامی تفکیر، اس کے برعکس، بنی بر فرد (individual-based) تفکیر ہے۔ اسلامی دعوت کا نشانہ نظام نہیں ہوتا۔ اسلامی دعوت کا اصل نشانہ فرد ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق، نظام کو نشانہ بنا کر تحریک چلانا گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے۔ کیونکہ نظام بذات خود کوئی چیز نہیں۔ اس دنیا میں فرد سے نظام بنتا ہے، نظام سے فرد کی تشکیل نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانہ میں "نظامی" انداز کی نام نہاد اسلامی تحریکوں سے اسلام کو بے پناہ نقصانات پہونچے ہیں۔ اس کا پہلا نقصان یہ ہے کہ قرآن کی وہ تمام آیتیں جن میں فرد کی شعوری اور روحانی غذا تھی، اس کو غلط تفسیر کے ذریعہ نظام اور خارجی انقلاب سے جوڑ دیا گیا۔ سیاست بلاشبہ اسلام کا ایک جزء ہے۔ مگر سیاسی مسئلہ کا ان آیتوں سے کوئی تعلق نہیں جن سے اس مسئلہ کو انتہائی جسارت کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔

مثلاً قرآن میں حکم تھا کہ وربك فكبر (اپنے رب کی تکبیر کر) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عظمت کا اعتراف کر۔ اللہ کی عظمت و کبریائی کو اپنے دل و دماغ میں اتار لے۔ مگر نظام پسند ذہن نے اس کی سیاسی تفسیر کر ڈالی۔ یہ کہہ دیا گیا کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خدا کی سیاسی بڑائی قائم کرو۔ سیاست کے ایوان پر خدائی اقتدار کا جھنڈا لہرا دو۔ اسی طرح بہت سی دوسری آیتوں کی غلط تفسیر کی گئی۔

اس طرح کی تفسیریں بلاشبہ مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) ہیں۔ مزید یہ کہ ان تفسیروں نے تواضع کے دین کو سرکشی کا دین بنا دیا ہے۔ انھوں نے امت کے افراد میں تعمیری ذہن کے بجائے تخریب کاری کا ذہن ابھارا ہے۔ جو دین خوف خدا پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ان تحریکوں کے نتیجہ میں بے خوفی کا مزاج پیدا کرنے کا کارخانہ بن گیا ہے۔

اسلامی شناخت

ہندستان کی فرقہ پرست ہندو جماعتیں اگر یہ مطالبہ کریں کہ مسلمان اکثریت کا لباس (مثلاً دھوتی کرتا) پہنیں یا دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کریں تاکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہو، تو تمام مسلم رہنما چیخ اٹھیں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ ہمارے قومی تشخص کو ختم کرنے کی اسکیم ہے، اور ہم کبھی اس پر راضی نہ ہوں گے۔

یہ قومی تشخص کے بارہ میں مسلم رہنماؤں کی حساسیت کا حال ہے۔ مگر یہی رہنما اسلامی تشخص کے بارہ میں بالکل بے حس بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر اپنے اسلامی تشخص کو ختم کر رکھا ہے، مگر اس کے بارہ میں ہمارے رہنما کوئی مہم نہیں چلاتے۔ شاید اس لیے کہ "قومی تشخص" کے لیے خطرہ غیر قوم کی طرف سے ہے، اس لیے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کی جا سکتی ہے۔ مگر "اسلامی تشخص" کو مٹانے والے خود مسلمان ہیں، اس لیے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کرنا ممکن نہیں۔

اسلامی تشخص کے پہلو سے ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ جب وہ لغو بات کو سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں (القصص ۵۵ نیز الفرقان ۷۲) اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ نادان لوگ جب برے قول کے ذریعہ ان کے خلاف نادانی کرتے ہیں تو وہ برے قول کے ساتھ ان کا جواب نہیں دیتے۔ بلکہ وہ ان کو معاف کر دیتے ہیں اور ان سے درگزر کرتے ہیں۔ وہ بھلی بات کے سوا اور کچھ نہیں کہتے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تھا کہ جاہل کی شدت صرف آپ کے حلم اور بردباری کو بڑھاتی تھی (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۲۵-۳۲۴)

یہی بات دوسری جگہ اس طرح کہی گئی ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں کہ جب کسی لغو اور بے ہودہ چیز سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ اس سے گزر جاتے ہیں (الفرقان ۷۲) اس کی تشریح مقاتل نے یہ کی ہے کہ اہل ایمان جب کافروں سے گالی اور اذیت کی بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور اس سے درگزر کرتے ہیں (واذا اسمعوا من الکفار الشتم والاذی اعرضوا وصفحوا، التفسیر المظہری، المجلد السابع، صفحہ ۵۴)

ان آیات اور اس طرح کی دوسری آیتوں اور حدیث کے مطابق، اہل ایمان کا اسلامی تشخص یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح سب وشتم کرنے والوں سے الجھتے نہیں، بلکہ وہ ایسی باتوں کو نظرانداز کرتے

ہیں۔ وہ ایسے مقام سے متانت کے ساتھ گزر جاتے ہیں جہاں ان کے خلاف اذیت ناک باتیں کی جارہی ہوں۔

اب اس قرآنی حکم کی روشنی میں جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس ملک کے مسلمانوں نے اس اعتبار سے اپنا اسلامی تشخص بالکل کھو دیا ہے۔ اس معاملہ میں انھوں نے اپنی اسلامی شناخت کو باقی نہیں رکھا ہے۔

اس ملک میں بار بار ایسا ہورہا ہے کہ ہندستان کی غیر مسلم اکثریت کے لوگ اپنا جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں وہ وہی فعل کرتے ہیں جس کو قرآن میں "جہالت" کہا گیا ہے۔ وہ اپنا جلوس اس سڑک سے لے جاتے ہیں جو کسی مسلم محلہ سے گزرتی ہو۔ وہ اپنے جلوس میں ایسے نعرے لگاتے ہیں جو مسلمانوں کے لیے اذیت کا باعث ہوں۔

ایسے موقع پر مسلمان کیا کرتے ہیں۔ وہ جلوس کو روکنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کے نعروں پر مشتعل ہو کر مختلف قسم کی جوابی کارروائیاں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ ردعمل سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ جس موقع پر قرآن نے واضح طور پر صبر و اعراض کا حکم دیا ہے، وہاں وہ جوابی اشتعال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں نے اس معاملہ میں اپنے اسلامی تشخص کو مکمل طور پر ختم کر رکھا ہے۔

یہ بلاشبہ لباس کے معاملہ میں اپنے قومی تشخص کو چھوڑنے سے بہت زیادہ بڑا مسئلہ ہے۔ مگر یہاں تمام مسلم رہنما خاموش ہیں۔ ان مواقع پر وہ مسلمانوں سے نہیں کہتے کہ تم قرآنی حکم پر قائم رہو اور اس معاملہ میں اپنی اسلامی شناخت کو نہ چھوڑو۔

موجودہ مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ قومی شناخت بمقابلہ ہندو کے تحفظ پر خوب بولتے ہیں، مگر اسلامی شناخت بمقابلہ مسلمان کے مسئلہ پر کچھ نہیں بولتے۔ رہنماؤں کی یہ کوتاہی بلاشبہ جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی اس روش سے وہ موجودہ مسلمانوں کے درمیان اپنی مقبولیت کو باقی رکھنے میں کامیاب ہیں۔ مگر سخت اندیشہ ہے کہ ان کی یہ روش خدا کے یہاں ان کو غیر مقبول بنادے۔ اور پھر کوئی بھی لفظی مہارت ان کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہ ہو۔

بے حسی کا مرض

انسانی بیماریوں میں ایک ڈراؤنی قسم کی بیماری وہ ہے جس کو جذام (leprosy) کہا جاتا ہے۔ یہ مہلک بیماری ایک مخصوص جراثیم کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ جراثیم جسم کے محیطی اعصاب کو برباد کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر حساسیت کا مادہ ختم ہو جاتا ہے:

It is caused by Hansen's bacillus. Destruction of the peripheral nerves by the bacillus leads to a loss of sensation. (VI/159)

مثلاً جذام کے مریض کا ہاتھ اگر آگ پر پڑ جائے تو ہاتھ جلتا رہے گا مگر وہ اپنے ہاتھ کو آگ سے ہٹانے کے لیے حرکت میں نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہی حساسیت کا خاتمہ ہے۔ آدمی کے جسم میں باریک قسم کے نازک اعصاب ہوتے ہیں۔ یہ اعصاب بے حد حساس ہوتے ہیں۔ جسم کے کسی حصہ میں کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ اسی وقت اس کی خبر دماغ کو پہونچاتے ہیں۔ دماغ فوراً اس حصۂ جسم کو مقام حادثہ سے ہٹانے کا حکم دیتا ہے۔ اور ایک لمحہ میں جسم کا وہ حصہ وہاں سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ جذام کے مریض کے اندر یہ مخصوص اعصاب مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر اس کا ہاتھ آگ پر پڑ جائے تو دماغ تک اس کی خبر نہیں پہونچ سکے گی، اس لیے دماغ کا حکم بھی جاری نہیں ہوگا۔ اور وہ ہاتھ جلتے رہنے کے باوجود وہیں پڑا رہے گا۔

یہ جسمانی بیماری ایک خدائی نشانی ہے جو ہم کو ایک روحانی بیماری کی پہچان کراتی ہے۔ یہ روحانی بیماری وہی ہے جس کو قرآن میں قساوت (الحدید ۱۶) کہا گیا ہے۔ یہ اخلاقی اور روحانی موت کی ایک حالت ہے جب کہ برائی اور اچھائی کے بارہ میں آدمی کی حساسیت مردہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس قلبی تڑپ سے محروم ہو جاتا ہے جو آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ جب وہ بھلائی کو دیکھے تو اس کی طرف دوڑے اور برائی کو دیکھے تو اس سے بھاگ کر اپنے آپ کو اس سے بچائے۔

ایمانی حساسیت سے اس محرومی کی مثالیں قرآن و حدیث میں کثرت سے بتائی گئی ہے۔ مثلاً غزوہ بنی المصطلق (۶ھ) کے بعد ایک سادہ واقعہ کو شوشہ بنا کر مدینہ کے کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے خلاف ایک جھوٹا قصہ گھڑا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بلا تحقیق اس کو ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے۔ اس پر قرآن میں کہا گیا کہ جب تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل کر رہے تھے، اور اپنے منھ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ اور تم اس کو ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے (النور ۱۵)

کسی شخص کے بارہ میں ایک بری خبر سُن کر اس کو بلا تحقیق پھیلانے لگنا، حساس دل کے لیے نہایت سنگین بات ہے۔ مگر جن لوگوں کی روحانی موت ہو چکی ہو، وہ اس کو بے تکلف چھاپنا اور نقل کرنا شروع کر دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ، جذام کے مریض کی طرح، ان کی وہ حساسیت ختم ہو چکی ہوتی ہے جو اس طرح کے معاملہ میں انھیں چونکائے اور ان کو یہ کہنے پر مجبور کر دے کہ مایکون لنا ان نتکلم بھذا (ہم کو حق نہیں کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں) النور ۱۶۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے، وہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتا، حالاں کہ اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے (إنَّ العَبدَ لَیتکلّمُ بالکلمةِ مِن سَخَطِ اللهِ تعالىٰ لایلقی لها بالاً یهوی بها فی جهنم)

ایک بات جس سے کسی کی آبروریزی ہوتی ہو، کسی کے اوپر جھوٹا الزام عائد ہوتا ہو۔ اس سے کسی کی کردارکشی ہو رہی ہو، اس قسم کی بات اپنی زبان سے نکالنا ایسے آدمی کے لیے ہمالیہ پہاڑ سر پر اٹھانے کے برابر ہے جس کا دل خوفِ خدا سے کانپ رہا ہو۔ مگر جس آدمی کے اندر احتسابِ خداوندی کا احساس مردہ ہو جائے وہ ایسی باتوں کو اس طرح دہرائے گا جیسے وہ کوئی پرلطف قصہ بیان کر رہا ہے۔

جذام کی بیماری جسمانی حساسیت کھونے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر ذمہ دارانہ بات کرنا اور بلا تحقیق الزامات کو پھیلانا بھی ایک روحانی بیماری ہے۔ یہ بیماری اس آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے جس کی حساسیت آخرت کی پکڑ کے بارہ میں مردہ ہو جائے۔

عبادت

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور جن کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ)۔ یہ آیت حقیقتِ واقعہ کے اتنا زیادہ مطابق ہے کہ اگر صرف اسی ایک آیت پر غور کیا جائے تو وہ کسی آدمی کے اندر یہ یقین پیدا کرنے کے لیے کافی ہوگی کہ قرآن خداوند عالم کی کتاب ہے، انسان جیسی ایک مخلوق اس قسم کی کتاب وجود میں لانے پر قادر نہیں۔

انسان کی ہستی کے دو پہلو ہیں۔ ایک نفسیاتی (یا روحانی) اور دوسرے جسمانی۔ ان دونوں پہلوؤں سے انسان کی ترکیب ایسی ہے گویا وہ عبادتِ الٰہی کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ عبادت کا سب سے زیادہ کامل مظہر نماز (صلاۃ) ہے۔ اس آیت کی روشنی میں نماز اور انسانی شخصیت کا مطالعہ کیجیے۔

انسان کی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان میں اپنی تخلیق کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے آپ کو جھکا دے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر انسان کسی نہ کسی کے آگے اپنے آپ کو جھکائے ہوئے ہوتے ہیں، اور اس جھکاؤ سے انھیں خصوصی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ مگر غیر خدا کے آگے جھکنا اس جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ اس طرح آدمی غیر خدا کو وہ چیز دیدیتا ہے جو اسے صرف خدا کو دینا چاہیے۔

نماز میں جب آدمی خدا کے آگے جھکتا ہے تو اس کو اپنے اس جذبہ کی پوری تسکین حاصل ہوتی ہے۔ نماز میں خدا کے آگے جھک کر وہ اپنے وجود کے اس پورے تقاضے کا جواب پالیتا ہے جو اس کے اندر اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ وہ اس کو نکالنا چاہے تب بھی وہ اس کو نکال نہ سکے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے فطری جذبہ کا مرجع حقیقی طور پر خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد انسان کے جسم کو لیجیے۔ آپ کسی آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے شروع سے آخر تک دیکھیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ نماز آدمی کے پورے جسم کا مکمل استعمال ہے۔ آپ کو ایسا معلوم ہوگا گویا آدمی اسی لیے بنایا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھے۔

نماز کے لیے آدمی کا اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہونا، قبلہ رخ متوجہ ہونا۔ پھر ہاتھ باندھنا۔ زبان سے نماز کے کلمات ادا کرنا اور امام کی آواز سن کر ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف جانا، دونوں ہاتھ گھٹنے پر رکھ کر رکوع کرنا، ہاتھ اور پیشانی اور بقیہ پورے جسم کو استعمال کرتے ہوئے سجدہ میں جانا، پھر چہرہ کو دائیں اور بائیں

گھما کر سلام کرنا، دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کرنا۔ وغیرہ

یہ ساری چیزیں انسان کے جسم سے اتنا زیادہ مطابقت رکھتی ہیں، اور ان حرکات میں انسان کے تمام اعضاء اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان کا پورا جسم اسی لیے بنایا گیا تھا کہ وہ نماز کی شکل میں اپنے رب کی عبادت کرے۔

تمام انسان فطرت اللہ پر پیدا کیے گیے ہیں۔ یہ فطرت اللہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور نماز کی صورت میں اس کی عبادت کرے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ منيبين اليه واتقوه واقيموا الصلاة ولا تكونوا من المشركين۔

پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف سیدھا رکھو۔ اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو۔

نماز کی یہی خاص صفت ہے جس کی بنا پر تاریخ میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں کہ بہت سے لوگوں نے صرف مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔

آدمی کے اندر جو فطرت ہے وہ عبادت کی فطرت ہے۔ آدمی کا پورا وجود عبادت کا طالب ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر نماز پڑھنے کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا پورا جسم اور اس کے تمام اعضاء نماز کی صورت میں ڈھل جانے کا خاموش داعیہ لیے ہوئے ہیں۔

اب جب ایک آدمی کسی نمازی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا پورا وجود کہہ اٹھتا ہے کہ یہی وہ عمل ہے جس کی طلب وہ اپنے اندر لیے ہوئے تھا۔ نماز اس کو خود اپنی تلاش کا جواب معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی فطرت کی یہ تڑپ اس کو مجبور کرتی ہے اور وہ نمازیوں کے ساتھ نماز میں جھک جاتا ہے۔

(اركعوا مع الراكعين)

اوصاف انسانی

قرآن میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو مقام پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالے جو اس کے جی میں ہے (ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم ، الرعد ۱۱)

اس خدائی سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے ما بقوم (اجتماعی حالت) کا انحصار اس کے ما بانفس (انفرادی حالت) پر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حیثیت قومی کا دارومدار اوصاف انسانی پر ہے۔ کسی قوم کے افراد میں انسانی یا اخلاقی اوصاف جیسے ہوں گے، اسی نسبت سے اس کو دنیا میں اجتماعی مقام حاصل ہوگا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے موجودہ زمانہ کی ایک مثال لیجئے۔ یہ بات سبھی لوگ مانتے ہیں کہ جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد بہت غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس ترقی کا ایک خاص راز ان کا اتحاد ہے۔ جاپانی ہر کام کو متحدہ انداز میں کرتے ہیں۔ وہ اپنے اتحاد کو آخر وقت تک برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہتے ہیں۔

جاپان کے اس اتحاد کا راز ان کے افراد کا ایک شخصی مزاج ہے جو تقریباً تمام جاپانیوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ پروفیسر چی نکانی (Chie Nakane) کی جاپانی زبان میں ایک کتاب ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں جاپانی سماج (Japanese Society) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں جاپانی پروفیسر نے لکھا ہے کہ جاپانیوں کا انفرادی مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں:

I am under someone (p. 51).

دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر جاپانی احساس ماتحتی میں جیتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی اجتماعیت قائم ہوتی ہے تو وہ فوراً اس سے جڑ جاتا ہے، وہ تنظیم کے سربراہ کو فوراً اپنا سربراہ مان لیتا ہے، کیوں کہ وہ پہلے ہی سے یہ مانے ہوئے تھا کہ میں کسی کے ماتحت ہوں ——— یہ ہے جاپانیوں کے اس اتحاد کا راز جس کے نتیجہ میں انھوں نے موجودہ زمانہ میں حیران کن ترقی حاصل کی ہے۔

اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ مسلمانوں کا معاملہ جاپانیوں کے بالکل برعکس ہے۔ مسجد

سے لے کر سیاست تک کوئی معاملہ ایسا نہیں جس میں مسلمان متحد ہوں۔ موجودہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ برباد قوم ہیں، اور اس کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ ان کا عدم اتحاد ہے۔ اس بے اتحادی نے ایک ارب انسانوں کی عظیم قوم کو دنیا کی سب سے کمزور قوم بنا دیا ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی اس بے اتحادی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب دوبارہ ان کے افراد کا وہ غلط مزاج ہے جو کسی بھی اتحاد کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ بن گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جب مسلمان تنزل اور مغلوبیت کا شکار ہوئے تو ان کے رہناؤں کی تشخیص یہ تھی کہ مغرب سے مرعوبیت نے ان کو زوال سے دوچار کیا ہے۔ چنانچہ تمام رہناؤں نے ایک یا دوسری صورت میں یہ کیا کہ اسلام کو پرفخر انداز میں ان کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ ان کی مرعوبیت ختم کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ پوری نسل فخر اور حاکمیت کے احساس پر پرورش پاکر اٹھی ہے۔ ہر آدمی نظری اور اعتقادی طور پر اپنے اندر برتری کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ کیوں کہ یہی جذبہ اس کے اندر بھرا گیا تھا۔

یہ نفسیات اتحاد کی قاتل ہے۔ اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ ایک شخص کو بڑا بنا کر بقیہ تمام لوگ اس کے مقابلہ میں چھوٹے بننے پر راضی ہو جائیں۔ مگر مسلمانوں کی پرفخر نفسیات اس میں مانع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر آدمی سردار بننا چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی بات چلے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ حاکمانہ سیٹ پر بیٹھے۔ ایسی حالت میں اتحاد قائم ہونا ممکن نہیں۔ اور مسلمانوں کی یہی وہ نفسیات ہے جس نے آج ان کے درمیان کسی بھی اتحاد کو سراسر ناممکن بنا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ اقتدار کو کھونا نہیں ہے بلکہ انسانی اوصاف کو کھونا ہے۔ موجودہ مسلمان، اپنے رہناؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں، اعلیٰ انسانی اوصاف سے خالی ہو گئے ہیں۔ اب سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ اوصاف پیدا کیے جائیں جو اعلیٰ انسانیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب تک یہ کام نہیں کیا جائے گا مسلمانوں کے احوال تبدیل نہیں ہو سکتے۔ کوئی دوسری کوشش خواہ وہ کتنی ہی بڑی مقدار میں کی جائے، مسلمانوں کے لیے کسی نئے بہتر مستقبل کی تخلیق نہیں کر سکتی۔

کاروان ملت

غالباً ۱۹۳۶ کی بات ہے جب کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵) کے تحت ہندستان کا پہلا الکشن ہوا۔ ہر طرف انتخابی سرگرمیوں کی دھوم تھی۔ لوگ نہایت جوش و خروش میں تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۷) کا یہ شعر پہلی بار میرے کانوں نے سنا:

اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گام زن ہو ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرّ قو کی

۱۹۳۶ سے پہلے اور اس کے بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ملت کے قافلے اٹھے۔ مسلم رہناؤں نے بے شمار تعداد میں طوفان خیز تحریکیں چلائیں۔ ان سرگرمیوں سے لوگوں نے بہت بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرلیں جس کا ریکارڈ ماضی کے نظم و نثر کے ذخیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ طفیل احمد منگلوری نے "روشن مستقبل" کے نام سے ضخیم کتاب لکھی۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۹۵۶ - ۱۸۷۱) نے اپنی ایک نظم میں یہ اعلان کیا:

عنقریب اسلام کی فصلِ بہار آنے کو ہے

ان سرگرمیوں پر نصف صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ اب ہمارے لکھنے اور بولنے والے دشمنانِ اسلام کی ان "سازشوں" کے انکشاف میں مشغول ہیں جنھوں نے ہماری پچھلی نسل کی طوفانی کوششوں کو بے نتیجہ کر دیا۔ مگر یہ صرف خود فریبی ہے۔ کیوں کہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ اس دنیا میں کوئی قوم ہمیشہ اپنی داخلی کمیوں کی بنا پر بازی ہارتی ہے نہ کہ بیرونی سازشوں کی بنا پر۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہناؤں نے اپنی قوم کو جو رہنمائی دی، وہ ایک لفظ میں یہ تھی کہ — ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر آگے بڑھو اور ساری دنیا میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دو۔ چنانچہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسلمان لفظی یا عملی تلوار بازی کے اسی مشغلہ میں مصروف رہے ہیں۔ آجکل پاکستان اور کشمیر میں یہی منظر دیکھا جاسکتا ہے جہاں مسلم نوجوان دہشت گردی کے عمل میں مشغول ہیں اور پرجوش طور پر یہ ترانہ گا رہے ہیں:

دل میں ہے اللہ کا خوف ہاتھ میں ہے کلاشنکوف (Kalashnikov)

اس رہنمائی میں بیک وقت دو غلطیاں تھیں۔ اس میں انتہائی معصومانہ طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن ہے اور ان کے دل میں اللہ کا خوف موجود ہے۔ حالاں کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ صدیوں کے زوال کے نتیجہ میں قرآن سے مسلمانوں کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اور قساوت کے نتیجہ میں ان کے دل اللہ کے خوف سے خالی ہو چکے تھے۔

ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ لمبی اور خاموش جدوجہد کے ذریعہ جدید مسلم نسلوں کے دماغ میں دوبارہ قرآن کی روشنی پیدا کی جائے اور ان کے دلوں کو دوبارہ خدا کے خوف سے کانپنے والا بنایا جائے۔ یہ ایک بے حد صبر آزما کام تھا۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس داخلی محاذ پر محنت کیے بغیر خارجی نعروں پر قوم کو دوڑانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کی ساری کوششوں کا انجام اس چھت کا سا ہوا جو دیمک زدہ لکڑی کے اوپر کھڑی کر دی گئی ہو۔

اس رہنمائی میں دوسری بھیانک غلطی یہ تھی کہ انھوں نے زمانہ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ قدیم زمانہ میں "تلوار" طاقت کا نشان تھی، موجودہ زمانہ میں "علم" طاقت کا نشان ہے۔ مگر مسلم رہنما اندوہناک حد تک اس فرق سے بے خبر رہے۔ انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت سائنس کے دور میں ہر طرف تلوار کا ترانہ گانا شروع کر دیا۔

اس غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کی پوری نسل جنگ جویانہ ذہنیت میں مبتلا ہو گئی۔ ہر شخص بس جنگ اور ٹکراؤ کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا۔ جس کے پاس تلواری جنگ چھیڑنے کا موقع تھا۔ اس نے اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف تلواری جنگ چھیڑ دی۔ اور جن لوگوں کے پاس صرف الفاظ تھے، انھوں نے الفاظ کی لامتناہی بم باری کا مشغلہ اپنے لیے اختیار کر لیا۔

اس انداز کار کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ اب مسلمانوں میں وہی آوازیں مقبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہیں جو جنگ جویانہ لہجے میں بولی گئی ہوں۔ تعمیر اور حقیقت پسندی کی بات مسلمانوں کو اپیل نہیں کرتی۔ جنگ جویانہ نعروں پر فی الفور ان کی بھیڑ جمع کی جا سکتی ہے مگر پر امن اور خاموش پروگرام کے نام پر انھیں بلائیے تو آپ کا پنڈال بالکل سونا پڑا رہے گا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا پورا ادب اور ان کی تمام سرگرمیاں اسی نہج پر قائم ہو گئی ہیں۔ ان کی ہر تحریک میں کسی نہ کسی اعتبار سے یہی روح کارفرما ہے۔ آپ ان کے جس

فکری یا عملی رخ کا مطالعہ کیجیے، ہر جگہ آپ کو اسی کی جھنکار سنائی دے گی۔

نثر کے دور میں شاعری، خاموش تدبیر کے دور میں خطابت، عملی منصوبہ بندی کے دور میں لفظی ہنگامہ آرائی۔ تعمیر کے دور میں تخریب، پُر امن جدوجہد کے دور میں عسکری سرگرمی، سائنسی تفکیر کے دور میں روایتی تفسیر، حقائق کی بنیاد پر اٹھنے کے دور میں خوش خیالیوں کی بنیاد پر اٹھنے کا خواب —— سب اسی کے مظاہر ہیں، اور یہی مختصر طور پر موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنماؤں کی رہنمائی کا خلاصہ ہے۔ اس قسم کی ہر کوشش خلاف زمانہ حرکت (anachronism) کی مصداق تھی، اور خلاف زمانہ حرکت کبھی کسی کے لیے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

ملت کے کاروان کو دوبارہ متحرک کرنے کے لیے شاعری اور خطابت اور انشا پردازی کا انداز صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس قسم کی پُر جوش لفاظی کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک پچھڑی ہوئی قوم دوبارہ خوش فہمیوں کے گڑھے میں پڑ کر رہ جائے۔

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ ملت کے افراد میں دوبارہ سچی دینی روح پیدا کی جائے۔ ان کو "کلمہ گو" کی سطح سے اٹھا کر "کلمہ فہم" کی سطح پر لایا جائے۔ تقلیدی ایمان کی جگہ ان کے اندر زندہ اور شعوری ایمان پیدا کیا جائے۔ ان کے عقیدہ کو دوبارہ فکری انقلاب بنا دیا جائے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ ملت کو عصر حاضر کے تقاضوں سے باخبر کیا جائے۔ ایک روایت میں مومن کو بصیراً بزمانہ (اپنے زمانہ سے باخبر انسان) بتایا گیا ہے۔ یہ بلاشبہ انتہائی اہم ہے۔ اس کے بغیر ملت کا قافلہ اپنی مطلوبہ منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔

فخر کا نقصان

ایک مسلم رہنما نے اسلامی تعلیمات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا آغاز وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں ——— "دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک کا نام یا تو کسی خاص شخص کے نام پر رکھا گیا ہے یا اس قوم کے نام پر جس میں وہ مذہب پیدا ہوا۔ مثلاً عیسائیت کا نام اس لیے عیسائیت ہے کہ اس کی نسبت حضرت عیسیٰ کی طرف ہے۔ بودھ مت کا نام اس لیے بودھ مت ہے کہ اس کے بانی مہاتما بدھ تھے۔ زردشتی مذہب کا نام اپنے بانی زردشت کے نام پر ہے۔ یہودی مذہب ایک خاص قبیلہ میں پیدا ہوا جس کا نام یہوداہ تھا۔ ایسا ہی حال دوسرے مذاہب کے ناموں کا بھی ہے۔ مگر اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شخص یا قوم کی طرف منسوب نہیں ہے۔ بلکہ اس کا نام ایک خاص صفت کو ظاہر کرتا ہے جو لفظ اسلام کے معنی میں پائی جاتی ہے۔ یہ نام خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں ہے۔ نہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کو شخص یا ملک یا قوم سے کوئی علاقہ نہیں۔ صرف اسلام کی صفت لوگوں میں پیدا کرنا اس کا مقصد ہے"۔

مگر انھیں مسلم رہنما نے بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اپنے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی تحریک اٹھائی تو اس کا نام انھوں نے "نظامِ مصطفےٰ" رکھا۔ یعنی محمدی نظام نہ کہ اسلامی نظام۔ جس مذہب کی شان انھوں نے یہ بیان کی تھی کہ اس کا نام کسی شخص کے نام پر نہیں ہے، اسی مذہب کو شخص کے نام پر منسوب کرکے اپنی پوری تحریک چلادی۔ یہ تضاد کیوں پیش آیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ انھوں نے کتاب میں جو کچھ لکھا، وہ اپنے فخر کا اظہار تھا۔ جو چیز فخر کے اظہار کے طور پر ہو وہ آدمی کی نفسیات کا جزء نہیں بنتی اور اسی لیے وہ اس کے حقیقی عمل میں شامل نہیں ہوتی۔

فخر ہمیشہ دوسروں کے سامنے کیا جاتا ہے۔ کوئی آدمی کسی جزیرہ میں بالکل تنہا ہو تو وہاں فخریہ کلام اس کی زبان پر جاری نہیں ہوگا۔ جب وہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تو وہ فخر کرے گا تو کس کے لیے کرے گا۔ وہ کس کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا دکھائے گا۔

بالفاظ دیگر، فخریہ کلام دوسروں کے لیے نکلتا ہے نہ کہ خود اپنے لیے۔ اور جو کلام دوسروں کے لیے نکلے وہ اپنی اصلاح کا ذریعہ کیوں کر بن سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ظہور میں آنے والی تقریروں اور تحریروں کو کسی ایک خانہ میں رکھنا ہو تو وہ یقینی طور پر فخر کا خانہ ہوگا۔ "ہمارا نبی سب سے افضل، ہمارا دین سب سے کامل، ہماری تاریخ سب سے شاندار" یہی وہ نفسیات ہے جو موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والوں کے کلام میں رچی بسی ہوئی ہے۔ شعراء نظم کے اسلوب میں اور مصنفین نثر کے اسلوب میں اسی کے نغمے گا رہے ہیں۔ اس نفسیات نے موجودہ زمانہ میں ہماری تمام کوششوں کو "اندر رخی" کے بجائے "باہر رخی" بنا دیا ہے۔

ہم اس لیے لکھتے اور بولتے ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے فخر کا اظہار کریں، دوسروں کے درمیان اپنی بڑائی ثابت کر کے خوش ہوں۔ اس طرح ہمارا کلام اپنے آغاز ہی میں دوسروں کے لیے ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے اپنے لیے نہیں رہتا۔ جس کلام کا مقصد پُرفخر جذبات کی تسکین ہو اس کا نشانہ بالکل فطری طور پر دوسرے ہو جاتے ہیں۔ آدمی کی اپنی ذات اس کی زد میں نہیں آتی۔ آدمی اپنی برتری کے جذبات کی تسکین حاصل کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ جو مطلوب تھا وہ اس کو مل گیا۔ اس کے بعد خود اپنی ذات کو اس کی میزان پر کھڑا کرنے کا خیال اسے کبھی نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اس کا مقصود ہی نہ تھا۔

مضحکہ خیز

اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) ۱۹۴۲ میں پیدا ہوئے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کے شعبہ میں لوکاسین پروفیسر ہیں۔ یہ وہ علمی منصب ہے جو اس سے پہلے نیوٹن اور ڈیراک جیسے اعلیٰ سائنس دانوں کو حاصل رہا ہے۔ وہ آئن سٹائن کے بعد سب سے زیادہ ممتاز نظریاتی طبیعیات داں (theoretical physics) سمجھے جاتے ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ کی ایک کتاب نیویارک سے ۱۹۸۸ میں چھپی ہے۔ یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ہے ـــــ وقت کی مختصر تاریخ :

A Brief History of Times

یہ ایک بہت دلچسپ اور سبق آموز کتاب ہے۔ وہ اتنی مقبول ہوئی کہ صرف ایک سال میں اس کے چودہ اڈیشن چھاپے گئے۔ اس کتاب کا آغاز حسب ذیل سطروں سے ہوتا ہے:

"ایک مشہور سائنس داں نے ایک بار فلکیات کے موضوع پر ایک عوامی لکچر دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ برٹرینڈ رسل تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور کس طرح سورج ہماری کہکشاں کے مرکز میں گھومتا ہے جو کثیر ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ لکچر کے خاتمہ پر ایک چھوٹی بوڑھی عورت

A well-known scientist (some say it was Bertrand Russell) once gave a public lecture on astronomy. He described how the earth orbits around the sun and how the sun, in turn, orbits around the center of a vast collection of stars called our galaxy. At the end of the lecture, a little old lady at the back of the room got up and said: "What you have told us is rubbish. The world is really a flat plate supported on the back of a giant tortoise." The scientist gave a superior smile before replying, "What is the tortoise standing on?" "You're very clever, young man, very clever," said the old lady. "But it's turtles all the way down!"

Most people would find the picture of our universe as an infinite tower of tortoises rather ridiculous, but why do we think we know better? What do we know about the universe, and how do we know it? Where did the universe come from, and where is it going? Did the universe have a beginning, and if so, what happened *before* then? What is the nature of time! Will it ever come to an end? Recent breakthroughs in physics, made possible in part by fantastic new technologies, suggest answers to some of these longstanding questions. Someday these answers may seem as obvious to us as the earth orbiting the sun – or perhaps as ridiculous as a tower of tortoises. Only time (whatever that may be) will tell.

کرہ کے پچھلے حصہ سے اٹھی اور کہا: تم نے جو کچھ ہمیں بتایا وہ بالکل لغو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا پلیٹ کی مانند چپٹی ہے جو ایک بہت بڑے کچھوے کی پیٹھ پر ٹکی ہوئی ہے۔ سائنس داں جواب دینے سے پہلے فاتحانہ انداز سے مسکرایا اور پھر خاتون سے پوچھا کہ یہ کچھوا کس چیز کے اوپر کھڑا ہے۔ بوڑھی عورت بولی: اے نوجوان، تم بہت چالاک ہو، مگر یہ کچھوے پر کچھوا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے تک چلا گیا ہے۔

بہت سے لوگ ہماری دنیا کی اس تصویر کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ کچھوؤں کا ایک لامتناہی کھمبا ہے جس کے اوپر یہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ مگر کیوں ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ اس سے بہتر ہے۔ ہم کائنات کے بارہ میں کیا جانتے ہیں اور ہم کس طرح اس کو جانتے ہیں۔ کائنات کہاں سے آئی اور وہ کہاں جا رہی ہے۔ کیا کائنات کا ایک آغاز ہے اور اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے جو گزرا وہ کیا تھا۔ وقت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا وہ کبھی ختم ہوگا۔ فزکس کے حالیہ انکشافات نے جزئی طور پر نئی حیرت ناک ٹکنالوجی کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس سے کچھ قدیم سوالوں کے جواب معلوم کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ کچھ دن تک یہ جوابات ہم کو اسی طرح واضح دکھائی دے سکتے ہیں جیسے کہ سورج کے گرد زمین کا گھومنا۔ یا شاید وہ آئندہ اتنے ہی مضحکہ خیز نظر آنے لگیں جیسا کہ کچھوؤں کا کھمبا۔ صرف وقت، خواہ وہ جو بھی ہو، اس کے بارہ میں بتا سکے گا۔" صفحہ ۱-۲

جدید نظریات کے مضحکہ خیز ثابت ہونے کے لئے ہمیں مستقبل کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اہل دانش کے لئے ان کا مضحکہ خیز ہونا آج ہی معلوم اور ثابت شدہ ہے۔ مثلاً جدید سائنسی فکر کے مطابق دنیا کے واقعات اسباب وعلل کی ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب ہے، اور پھر اس سبب کے پیچھے ایک اور سبب۔ اس طرح یہ سلسلہ برابر چلا جا رہا ہے۔ اس قسم کا لامتناہی سلسلۂ اسباب بلاشبہ اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا کہ کچھوؤں کی لامتناہی قطار۔

زندگی اور کائنات کی حقیقت کے بارہ میں آج کا انسان عجیب عجیب غلط فہمیوں میں پڑا ہوا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک بے مقصد ہنگامہ ہے۔ وہ اپنے آپ شروع ہوا اور اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کسی کا خیال ہے کہ بہت سی روحیں یا دیوتا ہیں جو اس دنیا کے مالک ہیں۔ کوئی اسباب وعلل یا قانون اتفاق (law of chance) کے تحت اس کی تشریح کر رہا ہے۔ وغیرہ

یہ تمام باتیں بلا شبہ لغو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک خدا ہے جو تمام چیزوں کا مالک ہے۔ اس نے انسان کو اور کائنات کو پیدا کیا۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔ یہ دنیا کوئی الل ٹپ یا بے مقصد دنیا نہیں۔ یہ خدا کے منصوبہ کے مطابق ہے۔ اس کا آغاز اور اس کا انجام دونوں منصوبۂ خداوندی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مذہب اور جدید چیلنج)

انسان کے بارہ میں خدا کا منصوبہ یہ ہے کہ اس نے انھیں پیدا کر کے امتحان کے لئے موجودہ دنیا میں رکھا ہے۔ اس کا یہ امتحان پیدائش سے موت تک جاری رہتا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی کے جزا کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اپنے دنیوی عمل کے مطابق، یا تو جنت کی پر راحت زندگی پائے گا یا جہنم کے عذاب خانہ میں داخل کر دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ بربنائے امتحان ہے، آخرت میں جو کچھ اس کو دیا جائے گا وہ بربنائے استحقاق ہوگا۔ یہ فرق پورے معاملہ کو آخری حد تک بدل دے گا۔ موجودہ دنیا میں ہر چیز ہر آدمی کو ملی ہوئی ہے۔ کیوں کہ امتحان کے لئے اس کو سب کچھ دینا ضروری تھا۔ اگر چیزیں اور مواقع نہ دئے جائیں تو آدمی کا امتحان کیسے ہوگا۔ مگر موت کے بعد آنے والی دنیا میں صورت حال یکسر بدل جائے گی۔

جو آدمی موجودہ دنیا میں اپنا استحقاق ثابت نہ کر سکے، وہ آخرت کے عالم میں اس طرح داخل ہوگا کہ وہاں وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ ہوا اور پانی اور روشنی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو بے بسی کے عالم میں پائے گا۔ موجودہ دنیا میں اس کو ہر چیز اپنی نظر آتی ہے۔ آخرت میں ہر چیز اس کے لئے غیر ہو جائے گی۔ وہ ایسے ماحول میں ہوگا جہاں اجنبیت اور بے چارگی کے سوا کوئی اس کا استقبال کرنے والا نہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہے، اگر تم سچے ہو۔ کاش یہ انکار کرنے والے اس وقت کو جانتے جب وہ آگ کو اپنے سامنے سے نہ روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے۔ اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آجائے گی، پس وہ حیران رہ جائیں گے، پھر وہ نہ اس کو دفع کر سکیں گے اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی (الانبیا، ۳۸ - ۴۰)

ایک سوال

کہا جاتا ہے کہ خدا کی بنیاد پر کائنات کی توجیہہ کرنا بھی مسئلہ کا حل نہیں۔ کیوں کہ پھر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا تو خدا کو کس نے بنایا۔

مگر یہ ایک غیر منطقی سوال ہے۔ اصل مسئلہ "بے سبب" خدا کو ماننا نہیں ہے۔ بلکہ دو "بے سبب" میں سے ایک بے سبب کو ترجیح دینا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری کائنات موجود ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ ہم اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم کائنات کے وجود کو ماننے پر مجبور ہیں۔ ایک شخص خدا کو نہ مانے، تب بھی عین اسی وقت وہ کائنات کو مان رہا ہوتا ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات کو بے سبب مانے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ کائنات میں تمام واقعات بظاہر اسباب وعلل کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہے۔ اس طرح خود کائنات کی اپنی نوعیت ہی یہ چاہتی ہے کہ اس کے وجود کا ایک آخری سبب ہو۔ جب کائنات کے حال کا ایک سبب ہے تو اس کے ماضی کا بھی لازمی طور پر ایک سبب ہونا چاہئے۔ یعنی وہی چیز جس کو علت العلل کہا گیا ہے۔

بے سبب کائنات کو ماننا ممکن نہیں۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم اس کا ایک سبب مانیں۔ کائنات لازمی طور پر اپنا ایک آخری سبب چاہتی ہے۔ یہی منطق لازمی قرار دیتی ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ اس لاینحل مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری کوئی بھی تدبیر ممکن نہیں۔ بے سبب خدا کو مان کر ہم اپنے آپ کو بے سبب کائنات کو ماننے کے ناممکن عقیدہ سے بچا لیتے ہیں۔

خدا کو ماننا عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ خدا کو مان کر ہم صرف زیادہ عجیب کے مقابلہ میں کم عجیب کو اختیار کرتے ہیں۔

تعلیم — قومی ترقی کی بنیاد

قومی ترقی (نیشنل ڈولپ منٹ) کا مسئلہ ، بنیادی طور پر فرد کی ترقی (انڈوجول ڈولپ منٹ) کا مسئلہ ہے۔ جس طرح کسی مشین کی درست کارکردگی کی ضمانت یہ ہے کہ اس کے پرزے درست ہوں اسی طرح کسی سوسائٹی کے بہتر سوسائٹی ہونے کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے افراد صحیح افراد ہوں۔

قومی تعمیر کا کام دراصل فرد کی تعمیر سے شروع ہوتا ہے۔ اور فرد کی تعمیر کا کام یہ ہے کہ فرد کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ پڑھا لکھا آدمی باتوں کی گہرائی کو سمجھتا ہے۔ مزید یہ کہ پڑھے لکھے آدمی ہی کو گہری باتیں بتائی جاسکتی ہیں۔ جاہل آدمی صرف سطحی نعروں کو جانتا ہے۔ اور جس قوم کے افراد صرف سطحی نعروں کو جانیں ، باتوں کی اصلیت کو نہ جانیں ، ان کو کسی بھی طرح بربادی سے بچایا نہیں جاسکتا۔

اس اعتبار سے قوم کی ترقی کے لئے ہمیں جو کام سب سے پہلے کرنا تھا یا آج جس کام کو سب سے زیادہ کرنا ہے ، وہ تعلیم ہے۔ اور بدقسمتی سے ہمارے یہاں پرشور تحریکوں کے باوجود سب سے زیادہ اسی اہم ترین پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے رہنماؤں نے سوچا کہ ملک کو اگر خود اپنی سیاسی بنیاد (پولٹیکل بیس) حاصل ہوجائے تو اس کے بعد ملک تیزی سے ترقی کرنے لگے گا ۱۹۴۷ کی آزادی نے ملک کو یہ سیاسی بنیاد دے دی۔ مگر قومی ترقی کا خواب اس کے باوجود پورا نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ کے بعد جن رہنماؤں کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار آیا ، ان کی سوچ زیادہ تر یہ تھی کہ ملک کو صنعتی بنیاد (انڈسٹریل بیس) حاصل ہوجائے تو وہ ترقی یافتہ ملک بن جائے گا۔ چنانچہ سب سے زیادہ زور اسی پہلو پر دیا گیا۔ مگر قومی دولت کا سب سے زیادہ حصہ صنعتی ادارے قائم کرنے پر خرچ کرنے کے باوجود آج بھی ملک اس منزل سے محروم ہے جس کو قومی ترقی کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پولٹیکل بیس یا انڈسٹریل بیس کا درجہ قومی ترقی میں نمبر ۲ پر ہے۔ نمبر ایک درجہ پر جو چیز ہے وہ انٹلکچول بیس ہے اور وہ ابھی صحیح معنوں میں ملک کو حاصل نہیں ہوئی۔

اس کے مقابلہ میں آپ جاپان کو دیکھئے۔ جاپان نے اپنا موجودہ سفر تقریباً اسی وقت شروع

کیا جب کہ ہندستان نے آزادی کے بعد اپنا سفر شروع کیا۔ آج جاپان عالمی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں ٹاپ پر شمار ہوتا ہے جب کہ ہندستان عالمی ترقی کے نقشہ میں کہیں موجود نہیں۔

اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ جاپان نے اول دن تعلیم کی اہمیت کو سمجھا۔ چنانچہ جاپان میں نہ صرف لازمی تعلیم رائج کی گئی۔ بلکہ وہاں اسکول کے معیار کو اتنا اونچا کیا گیا کہ اسکول کے ماسٹروں کے لئے منسٹروں کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ ان کو سماج میں سب سے معزز درجہ دیا گیا۔ اور اس فیصلہ پر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ عمل شروع کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی جدید نسل پوری کی پوری ایسے تعلیمی اداروں میں پہنچ گئی جہاں ان کو پڑھانے کے لئے ملک کے بہترین قابلیت والے لوگ موجود تھے۔ اس کا فائدہ انھیں یہ ملا کہ صرف ربع صدی میں جاپان میں ایک نئی تعلیم یافتہ نسل تیار ہو گئی۔

یہ تعلیم جاپان کی ترقی کے لئے انتہائی ضروری تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان کو ایک نیا انقلابی فیصلہ لینا تھا۔ وہ فیصلہ جس کو جاپانیوں نے معکوس راستہ (reverse course) کا نام دیا ہے۔ جاپان، دوسری عالمی جنگ سے پہلے، جنگ اور ٹکراؤ کے راستہ پر چل رہا تھا۔ جنگ کے بعد نئی ترقی کے امکان کو حاصل کرنے کے لئے اس کو امن اور مفاہمت کے راستہ پر چلنا تھا۔ یہ گویا پہیہ کے رخ کو الٹی طرف گھمانا تھا۔ یہ بلاشبہ انتہائی مشکل فیصلہ تھا اور صرف اعلیٰ درجہ کے باشعور دماغ ہی ایسا انقلابی فیصلہ لے سکتے تھے۔ جاپان کے لئے تعلیم پر زور دینے کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ وہ اتنا انقلابی فیصلہ لے سکے اور مختصر مدت میں اس کا پھل پا سکے۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان کے لوگ وحشی سمجھے جاتے تھے۔ آج وہ بہترین مہذب لوگ ہیں۔ اس سے پہلے وہ سب سے زیادہ جنگ جو قوم تھے، آج سب سے زیادہ امن پسند قوم ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کی ہاری ہوئی اور برباد قوم نے چالیس سال کے مختصر عرصہ میں صنعتی دیو (industrial giant) کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ سب کارنامہ ہے اس بات کا کہ انھوں نے اپنے افراد کو تعلیم یافتہ افراد بنانے پر سارا زور صرف کیا۔

میرے نزدیک ہندستان کی ترقی کا راز صرف ایک ہے، اور اس وقت تک ترقی رکی رہے گی جب تک یہ شرط پوری نہ کی جائے۔ اور وہ ہے افراد کو تعلیم یافتہ بنانا۔ اب ہمارا سب سے پہلا نشانہ

صرف ایک ہونا چاہئے۔ یعنی لازمی تعلیم اور صد فی صد تعلیم۔ اس سے کم کی کوئی بھی چیز ہمیں ترقی یافتہ قوم نہیں بنا سکتی۔

ہندستان کی ۵۰ فی صد آبادی ابھی تک تقریباً جاہل ہے۔ ایسی حالت میں ہندستان جیسے بڑے ملک کے لئے "لازمی تعلیم اور صد فی صد تعلیم" کا منصوبہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ بلاشبہ انتہائی مشکل کام ہے۔ اس پر سچائی کے ساتھ عمل کرنے کے لئے ہمیں اپنی سوچ میں انقلابی تبدیلی لانی پڑے گی۔ مثلاً ملکی دفاع کے موجودہ بجٹ میں قابل لحاظ حد تک کمی کرنا، وغیرہ۔ ہمیں خطرات کو نظر انداز کر کے اس کام کی طرف آگے بڑھنا ہوگا۔ اس کے بغیر قوم کو تعلیم یافتہ بنانا ہرگز ممکن نہیں۔

یہاں میں دوبارہ کہوں گا کہ اگر ہم ایسا حوصلہ کریں تو ہم اس میدان میں اکیلے نہیں ہوں گے مثلاً جاپان نے جو معجزاتی ترقی کی ہے، اس کی ایک زبردست قیمت اس کو ادا کرنی پڑی۔ اس کو وہ کام کرنا پڑا جس کو جاپان کے سابق شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے "ناقابل برداشت کو برداشت کرنا" بتایا تھا۔

یہ ناقابل برداشت چیز امریکہ کے سیاسی اور فوجی غلبہ کا مسئلہ تھا۔ جاپان اگر دوسری عالمی جنگ کے بعد اس مسئلہ کو چھیڑتا تو وہ تعلیم و ترقی کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس اصول پر عمل کیا کہ ـــــ مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو:

Starve the problems, feed the opportunities.

جاپان نے امریکی غلبہ کے مسئلہ کو نظر انداز کیا، اور جو میدان اب بھی اس کے لئے کھلا تھا یعنی اپنی نسل کو تعلیم یافتہ بنانا، اس پر اپنی ساری توجہ لگا دی۔ اس تدبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس سال میں پوری تاریخ بدل گئی۔

آخر میں یہاں میں پیغمبر اسلام کا ایک واقعہ نقل کرنا چاہتا ہوں جو اس معاملہ میں ہمارے لئے بہت حوصلہ افزا مثال پیش کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام کو اپنے مخالفین کے ساتھ چند دفاعی جنگیں لڑنی پڑیں۔ ان میں سے ایک جنگ وہ ہے جو جنگ بدر کہی جاتی ہے۔ اس جنگ کے بعد آپ کے پاس دشمن کے ۷۰ افراد جنگی قیدی کے طور پر آئے۔ یہ لوگ مکہ کے تھے۔ آپ نے ان قیدیوں کا یہ فدیہ مقرر کیا کہ ان میں سے ہر ایک شخص اگر مسلمانوں کے دس نوجوانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو اس کو رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا اسکول تھا جو خود پیغمبر نے قائم کیا۔ اس اسکول کے تمام ٹیچر نہ صرف غیر مسلم بلکہ اسلام کے ثابت شدہ دشمن تھے۔ مزید یہ کہ ان لوگوں کو رکھنے میں یہ یقینی خطرہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ منظم ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحیت کریں گے۔ مگر ان تمام ناموافق پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ نے ان کے ذریعہ سے اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔

علم اور تعلیم کو یہ غیر معمولی اہمیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور اول کے مسلمانوں میں یہ روایت قائم ہو گئی کہ علم سب سے بڑی چیز ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو جب مواقع ملے تو انھوں نے سب سے زیادہ علم کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے اپنی ہر مسجد اور ہر گھر کو مدرسہ بنا دیا۔ انھوں نے بے شمار تعداد میں یونیورسٹیاں اور کتب خانے قائم کئے۔ تمام دنیا کی کتابیں (بشمول ہندستان) جمع کرکے ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے نتیجہ میں ایک نئی تہذیب وجود میں آئی۔ توہماتی دور کی جگہ ایک نیا سائنٹفک دور پیدا ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ وہ واقعہ ظہور میں آیا جس کو ایک امریکی انسائکلو پیڈیا میں "اسلام" کے مقالہ کے تحت بتایا گیا ہے کہ اسلام نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history.

علم ہی تمام ترقیوں کی بنیاد ہے، خواہ مذہبی ترقی کا معاملہ ہو یا سیکولر ترقی کا معاملہ۔ اس لئے جو لوگ بھی حقیقی ترقی چاہتے ہوں، انھیں چاہئے کہ سب سے زیادہ تعلیم اور مطالعہ پر زور دیں۔ تعلیم اور مطالعہ افراد کو باشعور بناتا ہے، اور باشعور افراد ہی کسی گہری بات کو سمجھتے ہیں، باشعور افراد ہی اس دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔

قسط ـــــ ۲

انھوں نے کہا کہ اس " تعمیری لاوا " کو پکانے کے لئے الرسالہ کا مسلسل جاری رہنا ضروری ہے، پھر آپ نے اپنے بعد اس کا کیا انتظام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مشن آج بھی اللہ کی مدد سے جاری ہے، اور آئندہ بھی اللہ نے چاہا تو اسی کی مدد سے وہ جاری رہے گا۔ تاہم اسباب کے درجہ میں میں کہہ سکتا ہوں کہ جس قسم کے افراد دوسری تحریکوں کے پاس ہیں اور ان تحریکوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اس قسم کے افراد ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ پھر جس درجہ کے افراد دوسری تحریکوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اسی درجہ کے افراد اس تحریک کو کیوں جاری نہیں رکھ سکتے۔

اس کانفرنس میں میں نے کوئی مقالہ پیش نہیں کیا۔ یہ کانفرنس مقالات کے لئے نہیں تھی۔ اس میں کسی کا بھی کوئی مقالہ پیش نہیں ہوا۔ اس کانفرنس کا خاص موضوع دو چیزوں پر غور کرنا تھا۔ ایک مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کا اتحاد۔ دوسرے، عالم اسلام کو پیش آنے والے خطرات ومسائل۔

لوگوں نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق مختلف باتیں کہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ مسلم دنیا کا اتحاد محض ایک کانفرنس کرکے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مستقل اور متواتر کوشش کرنا ہوگا۔ اس کوشش کا خاص نکتہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو نا جانیں۔ اس دنیا میں کبھی اتحاد کی بنیاد پر اتحاد نہیں ہوتا بلکہ اختلاف کی بنیاد پر اتحاد ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اس نکتہ سے بے خبر ہیں۔ اس لئے وہ جگہ جگہ لڑ رہے ہیں۔ وہ اعراض کرنے والی باتوں میں ٹکراؤ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر جس دن " اختلاف کے باوجود اتحاد " کا مزاج آجائے گا اسی دن ان کے درمیان عملاً اتحاد قائم ہو چکا ہوگا۔

خطرات ومسائل کے بارے میں میں نے کہا کہ خطرات ومسائل اگرچہ بظاہر ہمارے باہر نظر آتے ہیں۔ مگر خطرات ومسائل کے اسباب ہمارے اپنے اندر ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بے شعوری، ان کے اندر مقابلہ کی استعداد کی کمی، زمانی قوت میں ان کا پیچھے ہو جانا، یہ اصل اسباب ہیں جنھوں نے موجودہ مسلمانوں کو ہر جگہ خطرات ومسائل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لئے اس بظاہر بیرونی مسئلہ کے لئے بھی ہمیں سب سے زیادہ اپنے داخلی محاذ پر محنت کرنا چاہئے۔

ہوٹل کے طعام گاہ میں ایک میز پر ہم تین آدمی دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ میرے سوا ایک شارج

کے تھے اور دوسرے مصر کے۔ کچھ دیر بعد ایک اور مصری ڈکتور آئے۔ وہ ہمارے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے ایک منٹ انتظار کے بعد ہوٹل کے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا: هل المتأخرون يأكلون ام لا يأكلون (بعد کو آنے والے کھائیں گے یا نہیں) تھوڑی ہی دیر میں آدمی نے کھانے کی پلیٹ لاکر ان کے سامنے رکھ دی۔ حالانکہ عام حالت میں انھیں دیر میں کھانا پہنچنا چاہئے تھا۔ انھوں نے کہا کہ مزاح اکثر حالات میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ وہ کھانے کے پورے وقت میں مزاحیہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔

اکثر لوگوں کا انداز یہی ہوتا ہے۔ مگر مجھے ذاتی طور پر یہ انداز بالکل پسند نہیں۔ جس وقت کھانا سامنے رکھا ہوا ہو، وہ انتہائی سنجیدگی کا وقت ہوتا ہے۔ کھانا اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی پر سب سے زیادہ شکر کا جذبہ طاری ہونا چاہئے۔ ایسے موقع پر مزاحیہ کلام شکر کے احساسات کا قاتل ہے۔ دسترخوان کے اوپر سب سے بڑا کلام یہ ہے کہ آدمی خاموش رہے اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے کھانا کھائے۔

ایک مشہور عرب شخصیت کے بارہ میں ایک صاحب نے بتایا کہ وہ آپ کی الاسلام یتحدی جیسی کتابوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کا کہنا ہے کہ وحید الدین خاں آخرت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں، مگر قرآن میں آخرت کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں پائی جاتی (الشيخ وحيد الدين يركز على الآخرة ، و الآخرة ليس لها اهمية في القرآن)

میں نے کہا کہ قرآن کے بارہ میں یہ ایک ایسے شخص کا تاثر ہے جو مسلمان ہے۔ دوسری طرف ہندستان میں ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص کو قرآن کا ہندی ترجمہ دیا گیا۔ اس نے پڑھنے کے بعد اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ قرآن کو پڑھ کر تو میں بہت ڈر گیا۔ کیوں کہ اس میں تو سب آخرت اور حساب وکتاب کی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ مسلم ملکوں میں ہر جگہ جبر ہے۔ مگر اس جبر کو ختم کرنے کے لئے کوئی طاقت ور تحریک نہیں اٹھتی۔ میں نے کہا کہ یہ تفکیر پیغمبرانہ تفکیر کے مطابق نہیں۔ پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جبر (سیاست میں بگاڑ) کو برداشت کرتا ہے۔ وہ اپنی ساری کوشش شرک (عقیدہ میں بگاڑ) کو درست کرنے پر لگا دیتا ہے۔ جبر کو ختم کرنے کا کام خود خدا نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ البتہ شرک

کو ختم کرنے کی ذمہ داری داعی کے اوپر ڈالی گئی ہے۔

جبر کو قانون خداوندی کے تحت بہر حال ختم ہونا ہے۔ اس لئے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ عقیدہ کی اصلاح، ذہن کی تربیت اور اخلاق کی تعمیر پر محنت صرف کی جائے۔ تاکہ جب خدا جابروں کے اقتدار کو توڑے تو صالح افراد کا ایک قابل اعتماد گروہ اس کی جگہ لینے کے لئے معاشرہ میں موجود ہو۔

موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی جبر کے نظام کو توڑنے کو اولین اہمیت دے دی۔ وہ اپنی ساری توجہ اور محنت اسی محاذ پر صرف کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک سیاسی جبر ٹوٹا تو اس کی جگہ دوسرے سیاسی جبر نے لے لی، کیونکہ اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی قابل اعتماد صالح گروہ وہاں موجود نہ تھا۔

مثلاً مصر کے اسلام پسندوں نے شاہ فاروق کے سیاسی جبر (۱۹۵۲) کو توڑا تو اس کے فوراً بعد جمال عبد الناصر کا سیاسی جبر قائم ہو گیا۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے ایوب خاں کے سیاسی جبر (۱۹۶۹) کو توڑا تو اس کے بعد جو چیز وہاں قائم ہوئی وہ مسٹر بھٹو کا سیاسی جبر تھا۔

ایک صاحب نے جنرل محمد ضیاء الحق کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں جنرل ضیاء الحق صاحب کا خاص کارنامہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقوام متحدہ کے ایوان میں حق کی آواز بلند کی۔

میں نے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے ساڑھے گیارہ سالہ دور حکومت (۸۸-۱۹۷۷) کے دوران میرے نزدیک اسلام یا ملت اسلام کا کوئی حقیقی کام نہیں کیا۔ جو کام ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں (مثلاً اقوام متحدہ میں تقریر کرنا) وہ سب اخباری اہمیت کے کام ہیں نہ کہ حقیقی اہمیت کے کام۔ البتہ صدر ضیاء الحق کے ذریعہ ایک کارنامہ ضرور انجام پایا ہے۔ اور وہ ہے ایک افسانہ کا خاتمہ۔ ان کے ذریعہ پاکستان کا اسلام پسند طبقہ مکمل طور پر اکسپوز (expose) ہو گیا۔ ضیاء الحق صاحب نے حکومت کے اندر اور حکومت کے باہر وہاں کی اسلام پسند جماعت اور وہاں کے علماء کو مکمل مواقع دئے۔ مگر ان لوگوں نے صرف یہ ثابت کیا کہ وہ لوگ اس کام کے لئے آخری حد تک نااہل ہیں۔ وہ نہ حکومتی عہدوں کو اسلامی انداز پر سنبھالنے کی استعداد رکھتے ہیں اور نہ حکومت کے باہر کوئی گہرا تعمیری کام کرنے کی صلاحیت ان کے اندر موجود ہے۔

موجودہ حالت میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ خاموش فکری مہم کے ذریعہ ذہنوں کو بدلا

جائے۔ اس کو "تعمیر شعور" کی مہم کہا جا سکتا ہے۔ یہ کام اگر صحیح انداز میں کیا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد ایک طرف اعلیٰ صلاحیت کے افراد کی ایک باشعور ٹیم تیار ہو جائے گی جو ذمہ دارانہ مناصب کو چلانے کی اہل ہو۔ دوسری طرف عمومی سطح پر معاشرہ میں صالح تعمیری فضا پیدا ہو جائے گی۔ یہی دونوں وہ چیزیں ہیں جو ایک جابرانہ نظام کے ٹوٹنے کے بعد دوسرے صالح نظام کے قیام کی ضمانت بن سکتی ہیں۔ یہی وہ "صبر" ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے: وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا۔

یہاں جس نشست یا جس مجلس میں بھی مجھ کو بولنے کا موقع ملا، میں نے دعوت کی بات کہی۔ ایک نشست میں میں نے کہا کہ اللہ کی سب سے بڑی مرضی، قرآن و حدیث کے مطابق، یہ ہے کہ اس کے بندے آگ میں جانے سے بچیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کے دین کا پیغام ہر ملک میں اور ہر گھر میں پہنچ جائے۔ اس کام کی تکمیل دور آخر میں ہونے والی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ لا يبقى على ظهر الارض بيت مدر ولا وبر الا ادخله الله كلمة الاسلام۔ حدیث کے راوی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس وقت دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے گا (قلت فيكون الدين كله لله)

اس کے ساتھ اس واقعہ کو ملا لیجئے کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار وہ وسائل اعلام انسان کے قبضہ میں آئے ہیں جو اس قسم کی عالمی اشاعتِ دین کو ممکن بنا دیں۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی مرضی یہ ہے کہ اللہ کے سچے دین کی آواز تمام دنیا اور ہر گھر میں پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ مسلمانوں کو ہر دوسرا کام چھوڑ کر اس کو انجام دینا ہوگا۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کام کو موثر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ہم اسلام کی مخاطب قوموں سے غیر دعوتی عنوانات پر ٹکراؤ کرتے رہیں تو وہ فضا درہم برہم ہو جائے گی جب کہ کسی شخص تک دین کا پیغام پہنچایا جائے اور وہ اس کو سنجیدگی کے ساتھ سنے اور اس پر غور کرے۔

ایک اور نشست میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسلم جماعتیں مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کر رہی ہیں، اس کو میں سراسر لغو سمجھتا ہوں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلام

کا مقصد صالح نظام بنانا ہے۔ اور صالح نظام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ زمانہ کی مسلم حکومتیں ہیں جو سیاسی جبر کے اوپر قائم ہیں۔ اگر ہم اس سیاسی جبر کا خاتمہ نہ کریں تو ہم کبھی بھی صالح نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میں نے کہا کہ جبر (اجباری نظام) کو توڑنے کے لئے ہمیں براہ راست جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام خود خدا کی طرف سے زیادہ موثر طور پر انجام دیا جارہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا کو خدا نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ لوگوں کو اپنے عمل کی آزادی ہو۔ اگر کسی آدمی کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا جائے تو اس پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ اس نے مسجد میں جا کر نماز ادا نہیں کی۔

رات کا اندھیرا ضرور ختم ہوتا ہے۔ رات کو ختم کرنے کے لئے ہمیں اس سے براہ راست لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے اندر یہ استعداد پیدا کریں کہ جب رات ختم ہو کر دن آئے تو ہم اس کو پوری طرح استعمال کر سکیں۔ اسی طرح نظام جبر کے دوران ہمیں یہ تیاری کرنا چاہئے کہ جب خدا اس کو ختم کرے تو ہم نئے مواقع کو استعمال کر کے صالح نظام کی تعمیر کر سکیں۔

۹۰ - ۱۹۸۹ کے درمیان روس میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کے اسی قانون کی بنا پر ہے۔ سوویت یونین نے زمین کے ایک بڑے رقبہ پر کامل جبر کا نظام قائم کر دیا تھا۔ یہ صورت حال خدا کی مصلحت کے سراسر خلاف تھی۔ یہ خدا کی دی ہوئی امتحانی آزادی کو ساقط کرنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ خدا کی طاقت ظاہر ہوئی اور اس نے حیرت انگیز طور پر سوویت امپائر کو توڑ دیا۔

موجودہ زمانہ کے اسلام پسند رہنما اپنے حصہ کا کام نہیں کرتے۔ وہ خدا کے حصہ کا کام کرنے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب خدا نظام جبر کو توڑتا ہے تو اسلام پسند قائدین اس حیثیت میں نہیں ہوتے کہ وہ سابق نظام کی جگہ لے سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جبر کے بعد دوسرا جبر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ یا نظام جبر ٹوٹنے کا فائدہ صرف ان لوگوں کے حصہ میں چلا جاتا ہے جو آزادی کو بے راہ روی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

کھانے کی میز پر دو آدمی بات کر رہے تھے۔ ایک قبرص کے تھے۔ دوسرے سرینام کے۔ دونوں میں تعارف ہوا۔ گفتگو ہونے لگی۔ ایک صاحب اپنے ملک کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ دوسرے

صاحب ایک تنظیم کے سکریٹری تھے۔ ایک نے دوسرے سے کچھ معلومات اپنے ملک کے بارہ میں بھیجنے کے لئے کہا۔ دوسرے نے کہا کہ ضرور بھیجوں گا۔ آپ اپنا فیکس (Fax) نمبر دیدیجئے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید وسائل کے ظہور نے موجودہ زمانہ میں مواصلات کو کتنا تیز رفتار بنا دیا ہے۔ ڈاک اور تار اور ٹیلکس اب "فرسودہ" چیز بن چکے ہیں۔ اب آدمی "فیکس" کی رفتار سے مواصلاتی تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے اسلامی ادارے ابھی اس سے بہت دور ہیں کہ ان کے یہاں فیکس کا طریقہ استعمال ہونے لگے۔ اگر کسی ادارہ میں کسی "شیخ" کی فیاضی سے فیکس کی مشین لگ گئی ہو، تب بھی وہ عملاً بے فائدہ ہے۔ مواصلاتی ذرائع کا مشینی ارتقا جس بلندی تک پہنچا ہے، اسلامی اداروں کا شعوری ارتقا ابھی جب تک اس بلندی تک نہ پہنچے، اس وقت تک فیکس جیسی چیزوں کا صحیح استعمال ان اداروں میں ممکن نہیں۔

عربوں کی ایک مجلس میں میں نے اسلام کے روحی پہلو پر گفتگو کی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال اس آیت جیسا ہو رہا ہے کہ یعلمون ظاھراً من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون (الروم ۷) وہ عظمت ظاہری کو جانتے ہیں مگر وہ عظمت معنوی کو نہیں جانتے۔ دین کا معنوی پہلو ہی اس کا اصل پہلو ہے۔ مگر اپنی اس کمی کی بنا پر وہ اس کے ادراک سے عاجز ہو رہے ہیں اور ظاہری پہلوؤں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔

ایک بار کا واقعہ ہے۔ مجھے یورپ کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ کھانوں سے بھری ہوئی میز کے سامنے بےفکری کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ چھری کانٹے کی دھیمی موسیقی میں لوگوں کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ ہر آدمی تفریحی باتیں کر کے اپنی بے فکری کا اظہار کر رہا ہے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک عرب ساتھی سے کہا کہ لوگوں کو جنت کیسے مل سکتی ہے جب کہ ان کا یہ حال ہو کہ اس کے لئے عمل کرنا تو درکنار، انھوں نے خدا سے اس کو مانگا بھی نہیں۔

(کیف تکون لھم الجنۃ وھم لم یسألوا اللہ الجنۃ فضلاً عن ان یعملوا لھا)

میں نے کہا کہ جنت کا مستحق بننے کے لئے کم سے کم جو چیز درکار ہے، وہ یہ کہ آدمی کے دل میں اس کی شدید طلب پیدا ہو۔ ایک طرف اپنی بے مائگی کا احساس اور دوسری طرف جنت کا اشتیاق۔

اس دو طرفہ احساس کے نتیجہ میں اس کی زبان سے بے اختیارانہ نکل پڑے کہ خدایا، میرے پاس کوئی عمل نہیں جو مجھ کو جنت میں لے جائے۔ لیکن خدایا، میں عاجز ہوں۔ جہنم کو برداشت کرنے کی طاقت میرے اندر نہیں۔ میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں۔ تو مجھے جنت دیدے، اس لئے نہیں کہ میں نے اس کے لئے عمل کیا، بلکہ اس لئے کہ میں نے تجھ سے اسے مانگا:

یارب لیس عندی عمل یوٴدی بی الی الجنۃ، ولکن انا عاجز لا استطیع الصبر علی النار۔ فانا اسألک الجنۃ۔ رب ھب لی الجنۃ، لا لِاَنّی عملتُ لھا بل لانی سألتُھا منک۔

اکثر بالواسطہ نتیجہ زیادہ بڑا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن لوگ اپنی ظاہر پسندی کی وجہ سے صرف براہ راست واقعات کو دیکھ پاتے ہیں۔ اور اسی کی بابت بحث و مباحثہ میں الجھے رہتے ہیں۔ مثلاً جمال عبدالناصر کے سوشلزم اور قوم پرستی کے نظریات مسلم پریس میں زیادہ تنقید کا موضوع رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ دوررس نتائج وہ ہیں جو جمال عبدالناصر کی لایعنی پالیسیوں کے ذریعہ بالواسطہ طور پر برآمد ہوئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں پڑھیں ہیں اس کے بعد گفتگو کے دوران جمال عبدالناصر کا ذکر آیا تو وہ جمال عبدالناصر کی پالیسیوں پر سخت تنقید کرنے لگے۔

میں نے کہا کہ مجھے جمال عبدالناصر کے سوشلزم اور ان کے قوم پرستی کے نظریات سے اتفاق نہیں۔ تاہم یہ جمال عبدالناصر ہی کی "برکت" ہے کہ ان شخصیتوں کو عرب دنیا میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جن کا آپ نے ذکر کیا۔ یہ گویا ناصرازم کا بالواسطہ نتیجہ تھا۔

جمال عبدالناصر نے سوشلزم کا نعرہ لگایا اور روس سے اپنا رشتہ جوڑا۔ وہ عالم عرب کا لیڈر بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ اپنے اس جوش کے تحت انھوں نے یہ حماقت کی کہ انھوں نے کمیونسٹ یمن کی تائید کی اور یمن کے راستہ سے اپنی فوجیں سعودی عرب میں داخل کر دیں۔

ناصر کی ان پالیسیوں کے نتیجہ میں ناصر اور سعودی حکمرانوں کے درمیان شدید رقابت قائم ہوگئی۔ مشہور ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ چونکہ سید ابوالاعلیٰ مودودی فکری حیثیت سے اور

سید قطب سیاسی رقیب کی حیثیت سے ناصر کے مخالفین میں تھے ، اس لئے ان دونوں (اور بعض دوسرے افراد کو) سعودی عرب میں پذیرائی حاصل ہوگئی۔ ان کی کتابیں سعودی عرب کی قیمت پر ہر زبان میں بڑی تعداد میں پھیلائی جانے لگیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب کی کتابوں کے بڑے پیمانہ پر پھیلنے کا خاص سبب یہی سعودی تعاون ہے۔ حالانکہ استدلالی اعتبار سے دونوں صاحبان کی کتابیں سطحی تھیں۔ ان کی اہمیت زیادہ تر ان کی انشاء پردازی میں تھی نہ کہ ان کی علمی حیثیت میں۔ خریداری کی بنیاد پر یہ کتابیں کبھی نہ پھیلتیں۔ مگر مفت تقسیم کی بنا پر وہ ہر جگہ پہنچ گئیں۔

ایک عرب عالم اخوان سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے میرے بارہ میں کہا کہ آپ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ اسلام دعوت کا نام ہے۔ اسلام کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر انھوں نے مولانا مودودی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مودودی سے پہلے اسلام صرف نماز اور عبادت کا نام تھا۔ مودودی نے بتایا کہ اسلام ایک کامل اور شامل نظام ہے۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ دین کو ایک ڈھانچہ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ آپ نماز کو بھی ایک ظاہری ڈھانچہ سمجھتے ہیں اور نظام حکومت کو بھی ایک ظاہری ڈھانچہ۔ اس لئے آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ نماز دین کا جزئی ڈھانچہ ہے اور نظام حکومت دین کا مکمل ڈھانچہ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دین ایک معنوی حقیقت کا نام ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کا۔ یہ ایک ہی معنوی حقیقت ہے جو مسجد میں نماز کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور سیاست میں اسلامی نظام حکومت کی صورت میں۔

میرے فکر اور دوسروں کے فکر میں آپ کا یہ تقابل صحیح نہیں۔ دونوں میں اصل فرق یہ ہے کہ ہم دین کو ایک معنوی حقیقت سمجھتے ہیں جس کو شریعت میں تقویٰ کہا گیا ہے۔ اور آپ نے دین کو ایک ظاہری ڈھانچہ سمجھ رکھا ہے۔ ہم دین کے احیاء کے لئے اس کی معنویت کے احیاء کی کوشش کر رہے ہیں، اور دوسرے لوگ دین کے احیاء کے لئے اس کے خارجی نظام کا احیاء کرنا چاہتے ہیں۔

طرابلس کے ہندستانی سفارت خانہ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ جناب ذکر الرحمٰن صاحب

وہاں سکنڈ سکریٹری کے طور پر ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹر رحمٰن کو سفارت خانہ میں بہت باعزت مقام حاصل ہے۔ ہر ایک ان کا احترام کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا کام نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اور اکثر اپنی واقعی ڈیوٹی سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ شاید یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لفظوں میں بیان کیا: ان قيمة المرء ما يحسنه۔

آدمی جب کوئی برا کام کرے تو لوگوں کو صرف اس کی برائی یاد رہتی ہے۔ ہر آدمی اس کو بری نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب کوئی اچھا کام کرے تو وہ صرف اس اچھے کام کے واسطے سے جانا جانے لگتا ہے۔ اس کا اچھا کام ہی اس کی تصویر بنتا ہے۔ اس کی زندگی میں اگر کچھ کمتر پہلو ہیں، تو وہ سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

ایک عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے مشن سے پوری طرح واقف ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے نہایت تاثر کے ساتھ کہا کہ آپ کا یہ مشن عربوں کے لئے رحمت ہے۔ کیوں کہ اگر وہ اس فکر کو اختیار کرلیں تو ان کے لئے ممکن ہوجائے گا کہ وہ انٹگریٹی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں نے عالم عربی میں جو حالات پیدا کر دئے ہیں، اس کے بعد ان کے لئے دو برائیوں میں سے ایک برائی کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یا قید یا نفاق۔ اگر وہ چاہیں کہ وہ اپنے موجودہ دینی خیالات کے ساتھ زندہ رہیں تو انھیں عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور اگر وہ سیاسی نظام کے ساتھ موافقت کرکے زندہ رہیں تو یہ ان کے لئے منافقت ہوگی، کیونکہ ان کے دل میں کچھ ہوگا اور عمل میں کچھ :

ان رسالتك هذه رحمة للعرب لان بهذه الرسالة هم يستطيعون أن يعيشوا بشخصية انسجامية ، ففي الاحوال القائمة التي توجد في العالم العربي اليوم بسبب الحركات الاسلامية المعاصرة ، لم يبق لهم الا الاختيار بين الشرين ، اما السجن واما النفاق۔ بحيث انهم اذا ارادوا ان يعيشوا طبقاً لمشاعرهم الدينية عُذّبوا وان ارادوا ان يعيشوا وفق النظام ينافقوا

ایک عرب ملک کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہاں ایک اسلامی جماعت کے افراد گھریلو انداز پر اپنا اجتماع کیا کرتے تھے۔ اس پر حکومت کی طرف سے پابندی لگادی گئی۔ بعد کو ان لوگوں نے ذمہ داروں

سے مل کر اس کی اجازت حاصل کرلی۔ مگر یہ اجازت انھیں صرف اس وقت ملی جب کہ انھوں نے اقرار کیا کہ ان کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ یہ اقرار ان کے تصور دین کے مطابق سراسر خلاف واقعہ تھا۔ کیوں کہ ان کا جو تصور اسلام ہے اس کی بنیاد ہی سیاست پر قائم ہے۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۰ کی شام کو عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد شہادت علی الناس ہے۔ یعنی خالص دعوتی انداز میں وہ کام کرنا جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کہا گیا ہے۔ یہ از اول تا آخر ایک فکری مہم ہے، اس کا کوئی تعلق جنگ اور قتال سے نہیں۔ حتی کہ فریق ثانی اگر اشتعال انگیزی کرے تب بھی ہمیں ٹکراؤ سے یک طرفہ اعراض کرنا ہے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا باقی رہے۔ مسلمان اگر اس کام کو نہ کریں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

اس سلسلہ میں میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۲ میں چین نے آسام کی سرحد پر ہندستان کے علاقہ میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس وقت تیز پور (آسام) کا کمشنر اپنے دفتر سے بھاگ کر اپنے گھر آگیا۔ گھر پر اپنے بچوں کے ساتھ قیام کرنا عام لوگوں کے لئے کوئی جرم نہیں۔ مگر مذکورہ کمشنر کے لئے یہ چیز جرم بن گئی۔ کیوں کہ اس نے اپنی ڈیوٹی چھوڑ دی تھی۔ جب کسی آدمی کو کسی خاص ڈیوٹی پر مقرر کیا جائے تو اس کی ساری قیمت اس ڈیوٹی کے مقام پر ہوتی ہے۔ کسی اور مقام پر بظاہر وہ کوئی درست کام کر رہا ہو تب بھی اس کے کام کی کوئی قیمت نہیں۔

اس پر ایک عرب نوجوان نے کہا کہ آپ کی مثال سے قتال کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ تیزپور کے کمشنر کی غلطی یہی تھی کہ اس نے قتال کے محاذ کو چھوڑ دیا اور غیر قتال کے میدان میں واپس آگیا۔

میں نے کہا کہ مثال کا یہ مطلب نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مثال کی دو قسمیں ہیں، ایک مثال برائے استدلال۔ دوسری مثال برائے توضیح۔ آپ کا اعتراض اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جب کہ میں نے یہ مثال برائے استدلال دی ہو، حالاں کہ میں نے یہ مثال برائے توضیح دی ہے۔

جب آپ ایک نقطۂ نظر کو قرآن و حدیث سے ثابت کر دیں اور اس کے بعد ایک مثال بطور توضیح نقل کریں تو اس مثال کا صرف وہ جزء وہاں چسپاں ہوگا جو آپ کی بات سے متعلق (relevant) ہے۔ دوسرے پہلو جو غیر متعلق (irrelevent) ہیں وہ اپنے آپ حذف ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے نقطۂ نظر کو اولاً قرآن و حدیث سے ثابت کیا۔ اس کے بعد توضیح کے لئے تیزپید کے کشنر کی مثال دی۔ اس مثال میں صرف ڈیوٹی کا پہلو میری گفتگو سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا ڈیوٹی کا پہلو لیا جائے گا، اور رقتال کا پہلو اپنے آپ حذف ہو جائے گا۔ میری بات کی تردید کے لئے آپ کو قرآن و حدیث سے دلیل لانی ہوگی، کیونکہ میرا ابتدائی استدلال قرآن و حدیث ہے نہ کہ کشنر کی مثال۔

ایک عرب ملک کے کچھ عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملک وہ ہے جو عام طور پر بدنام ہے کہ وہاں جبر ہے۔ وہاں کے حکمراں بے دین ہیں۔ وہاں اسلامی کام کے مواقع نہیں ہیں۔ مگر ان نوجوانوں کا تجربہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کام کرنے والوں کے لئے ہر جگہ کام کے مواقع ہیں۔

ان عرب نوجوانوں نے راقم الحروف کی عربی مطبوعات پڑھیں اور انگریزی الرسالہ کا مطالعہ کیا۔ اس سے ان کے اندر دعوتی کام کا ذہن پیدا ہوا۔ ان کے ملک میں باہر کے ملکوں سے بہت سے غیر مسلم لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کارکن غیر مسلموں کے درمیان انھوں نے دعوتی کام کرنا شروع کیا۔ اب تک وہ بہت سے لوگوں کو اسلام میں داخل کر چکے ہیں۔

انھوں نے مجھے کچھ عربی کے فارم دکھائے۔ یہ فل اسکیپ سائز میں عمدہ کاغذ پر عمدہ چھپے ہوئے فارم تھے۔ ان میں ایک تصویر کا خانہ تھا جہاں نومسلم کی تصویر لگائی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ فارم میں مختلف خانے تھے جن کو نومسلم بھر کر اپنا دستخط کرتا تھا۔ یہ فارم اس ملک کی حکومت نے نومسلموں کے لئے چھپوا رکھے ہیں۔ مذکورہ نوجوانوں نے سرکاری دفتر سے ربط قائم کر کے یہ فارم حاصل کئے اور اسلام قبول کرنے والوں پر اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔

اس طرح ایک بدنام ملک میں آزادانہ طور پر ایک دینی کام انجام پا رہا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دینی کام وہ ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

ایک عرب نوجوان عمر الہادی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک عرب یونیورسٹی میں میڈیکل سائنس کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ انگریزی اور مرکز کی عربی مطبوعات کو پڑھ کر ان کے اندر دعوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اپنی یونیورسٹی کے غیر مسلم پروفیسروں سے انھوں نے ربط قائم کیا۔ اور ان کو انگریزی کتابیں، مثلاً قرآن کا انگریزی ترجمہ، گاڈ ارائزز، پرافٹ آف ریوولیوشن وغیرہ۔

پڑھنے کے لئے دیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے حوصلہ افزا تجربات بتائے۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ ان کی یونیورسٹی میں فزیالوجی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر "بی آر" ہیں۔ انھوں نے پروفیسر موصوف کو کتابیں پڑھائیں۔ پڑھنے کے بعد ایک ملاقات میں انھوں نے عمر الہادی سے کہا کہ میرے بیٹے، یقین کرو، اگر تم نے اس حقیقت کو دنیا کے سامنے پہنچا دیا، تو تم دیکھو گے کہ دنیا کے ۹۰ فیصد لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے:

My son, believe me, if you can introduce this truth to the world as you have done to me, you will see that 90% of the world will become Muslim.

نائجیریا کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام نمدی (Namdi) بتایا۔ ان کی تعلیم بیرونی ملکوں میں ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرا خاندان مسلمان ہے۔ مگر مجھے مسلمانوں کی اس بات سے سخت اختلاف ہے کہ وہ لڑائی (جہاد) کو بہت زیادہ گلوریفائی کرتے ہیں۔ میں کسی بھی قسم کی لڑائی کے سخت خلاف ہوں۔ اسلام اگر سچا مذہب ہو تو وہ لڑائی کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ اس معاملہ میں اپنے خاندان سے میرا اتنا اختلاف ہوا کہ میں نے خاندان کو چھوڑ دیا۔ اسلام اگر یہی ہے تو میں اس کو نہیں مانتا۔

میں نے سوچا کہ انسان کی فطرت ایسا دین چاہتی ہے جس میں امن ہو۔ مگر موجودہ مسلمانوں کے ماحول میں اس کو ایسا اسلام نہیں ملتا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اسلام جنگ کا مبلغ ہے۔ وہ اپنی فطرت کی آواز پر چلے تو اس کو اپنے مسلم خاندان کو چھوڑنا پڑتا ہے، وہ اگر خاندان پر چلے تو اپنی فطرت کو۔

عرب اخبارات میں آجکل روزانہ دعوت اسلام اور قبول اسلام کی خبریں ہوتی ہیں۔ مثلاً طرابلس کے اخبار الدعوۃ الاسلامیہ کے صرف ایک شمارہ (۲۱ مارچ ۱۹۹۰) میں اس قسم کی کئی خبریں موجود تھیں۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ پچھلے سات سال میں ہانگ کانگ کے سات ہزار باشندوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے (۷ آلاف مواطن فی هونج كونج يشهرون اسلامهم فی سبعة اعوام)

شوشہ نہ کہ حقیقت

ایک خبر پڑھی۔ یہ خبر انگریزی اخباروں میں مختصر طور پر اور قومی آواز (یکم فروری ۱۹۹۰) میں زیادہ تفصیل کے ساتھ چھپی ہے۔ جین مت کے مشہور پیشوا اچاریہ منی سوشیل کمار وشو ہندو پریشد کے سات بانیوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کے جھگڑے کو پُرامن طور پر طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے افراد شریک ہیں۔

"منی سوشیل کمار جی ۲۴ جنوری ۱۹۹۰ کو اپنی کمیٹی کے ۱۲ ممبروں کے ساتھ اجودھیا پہونچے۔ انھوں نے اجودھیا کی "متنازعہ عبادت گاہ" کا تقریباً ایک گھنٹہ تک تفصیلی معائنہ کیا۔ معائنہ کے دوران کمیٹی کے افراد نے اس پر خصوصی توجہ دی کہ عمارت کے دروازہ پر لگے ہوئے کتبہ میں لفظ "مسجد" موجود نہیں۔ جین منی اچاریہ سوشیل کمار اور ان کی ٹیم یہاں خیر سگالی کے لیے اور حقائق معلوم کرنے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے بابری مسجد کے بیرونی اور اندرونی حصہ کو دیکھا۔ متنازعہ عمارت کے دروازہ پر لگے ہوئے پتھر میں فارسی زبان کے کتبہ کا جین منی اور ان کی ٹیم نے خصوصی معائنہ کیا۔ مبینہ طور پر اس کتبہ میں لفظ "مسجد" کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ جین منی نے اپنے ساتھ آنے والے ماہرین سے سوال کیا کہ اس کتبہ میں مسجد کا لفظ نہیں ہے۔ اس کی کیا وضاحت کی جاسکتی ہے۔ ماہرین نے اس نکتہ کو اہمیت دی"

رائے قائم کرنے کا یہ انداز نہایت غلط ہے۔ یہ حقائق کو چھوڑ کر شوشہ کی بنیاد پر رائے قائم کرنا ہے۔ بدقسمتی سے یہ انداز موجودہ زمانہ میں بہت زیادہ عام ہے۔ وہ مسلمانوں میں بھی اتنا ہی زیادہ پایا جاتا ہے جتنا غیر مسلموں میں۔

اس ذہنیت کا سب سے زیادہ مظاہرہ اختلافی معاملات میں ہوتا ہے۔ زید کو اگر بکر کی ذات سے اختلاف وعناد پیدا ہو جائے تو اس کے بعد بکر کی زندگی کے تمام قابل ذکر پہلو اس کے لیے ناقابل ذکر اور غیر اہم بن جائیں گے۔ اب زید کی نظر میں ساری اہمیت صرف ایک فرضی شوشہ کو ہو جائے گی جو اتفاق سے وہ بکر کی زندگی میں پالے۔

یہ طریقہ جس طرح، بابری مسجد کے معاملہ میں غلط ہے اسی طرح وہ دوسرے معاملات میں بھی غلط ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے بھی اتنا ہی برا ہے جتنا ہندوؤں کے لیے۔

۱۔ صدر اسلامی مرکز نے مارچ ۱۹۹۰ میں کچھ بیرونی ملکوں کا سفر کیا۔ اس سفر کے ذیل میں بہت سے لوگوں سے گفتگو ہوئی اور خطابات کے مواقع ملے۔ سفر کی روداد ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲۔ انگلینڈ کی برمنگھم یونیورسٹی میں ایک شعبہ ساؤتھ ایشین ریسرچ اسٹڈیز کے نام سے قائم ہے۔ اس کے ایک انگریز پروفیسر سی ڈبلیو نارتھ (C.W. North) ۸ مارچ ۱۹۹۰ کو اسلامی مرکز میں آئے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ وہ کئی گھنٹہ مرکز میں رہے۔ جاتے ہوئے انھیں مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات دی گئیں۔

۳۔ غیر مسلم صاحبان کثرت سے اسلام کو سمجھنے کے لئے مرکز سے رجوع کر رہے ہیں۔ مثلاً ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ کو مسٹر پاریش ناتھ (ڈائرکٹر دہلی پریس پترا کا لمیٹڈ) صدر اسلامی مرکز سے ملے اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات کیں۔ ان کو الرسالہ انگریزی کے کئی شمارے برائے مطالعہ دئے گئے۔ مسٹر ڈبلیو دھمیکا (بودھ گیا، بہار) نے الرسالہ انگریزی کا ایک شمارہ پڑھا۔ اس کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ اس کو مستقل اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ وہ الرسالہ انگریزی کی بابت اپنے خط میں لکھتے ہیں:

I found indeed, it is very interesting and very helpfull for the present day world. (Wilbagedara Dhammika)

۴۔ جاپانی اخبار سیکائی نپو (Sekai Nippo) کے نمائندہ مسٹر کونیو نیشی (Kunio Nishi) ۳۰ مارچ ۱۹۹۰ کو دوسری بار مرکز میں آئے اور اپنے اخبار کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں تھے۔

۵۔ جناب اقبال احمد صاحب (مرادآباد) نے بتایا کہ انھوں نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ کو جامعہ ملیہ (دہلی) میں داخل کر دیا۔ وہاں ان کو ہاسٹل کا کمرہ بھی مل گیا۔ مگر صاحبزادہ کا دل نہیں لگا اور ایک مہینہ کے بعد وہ اپنا سامان لے کر اپنے گھر واپس چلے گئے۔ پوچھا گیا تو بتایا کہ میرا دل وہاں پڑھنے میں نہیں لگتا۔ اقبال احمد صاحب نے ان سے کچھ اور نہیں کہا۔

انھوں نے اپنی الماری سے الرسالہ کا ایک شمارہ (مئی ۱۹۸۲) نکالا اور کہا کہ اس کو پڑھ ڈالو اور کئی بار پڑھو۔ چند دن تک صاحبزادہ اس پرچہ کو پڑھتے رہے۔ اس کے بعد خود کہا کہ میں دہلی جا رہا ہوں۔ وہ دوبارہ آکر محنت سے پڑھنے لگے۔ اس طرح بہت سے لوگ الرسالہ کے ذریعہ اپنے بچوں کی تربیت کر رہے ہیں۔

۶۔ عرب ملکوں میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ غیر مسلم لوگ رہتے ہیں جو پٹرول اور دوسرے شعبوں میں کام کرتے ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان انگریزی الرسالہ اور مرکز کی دوسری انگریزی مطبوعات کے ذریعہ اسلام کی دعوت پہنچائی جا رہی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے بعد اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ لوگ مزید انگریزی لٹریچر کی مانگ کر رہے ہیں۔

۷۔ الرسالہ کے مضامین مسلم اخبارات و رسائل کے علاوہ غیر مسلم پریس میں بھی برابر چھپ رہے ہیں۔ مثلاً نئی دہلی کا انگریزی پرچہ لوکائن بلیٹن (مئی ۱۹۹۰) نے الرسالہ انگریزی کا ایک آرٹیکل دوبارہ پورے حوالہ کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس طرح الرسالہ کی آواز وسیع تر حلقہ میں پہنچ رہی ہے۔

۸۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ ان کے لڑکے یورپ اور امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا وہاں کام کرتے ہیں، وہ ہندستان میں انگریزی الرسالہ خریدتے ہیں اور اس کو پڑھنے کے بعد یورپ اور امریکہ میں اسے اپنے لڑکوں کو بھیج دیتے ہیں۔ ایسا بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام اپنے خریداروں کے ذریعہ بہت سے ملکوں میں پہنچ رہا ہے۔

۹۔ اپریل ۱۹۹۰ میں صدر اسلامی مرکز کی دو تقریریں آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئیں۔ ایک تقریر ۱۹ اپریل کو اور دوسری تقریر ۲۶ اپریل کو۔ دونوں تقریریں اخلاقی اور اصلاحی نوعیت کی تھیں۔ ان کو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ ان تقریروں کے عنوانات یہ تھے: انتقام نہیں، اور حقیقت پسندی۔

۱۰۔ بدر الدین احمد صاحب (مراد آباد) اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اکثر سفر کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ بیگ میں الرسالہ کے کچھ شمارے بھی ضرور ہوتے ہیں۔ وہ راستہ میں لوگوں کو

الرسالہ پڑھاتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی واقعے بتائے۔ مثلاً وہ مرادآباد سے دہلی آرہے تھے۔ راستہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی جو ایک ہائر سکنڈری اسکول میں استاد ہیں۔ انھوں نے ان کو الرسالہ جنوری ۱۹۹۰ دیا اور کہا کہ پہلے اس کا مضمون ایک نمونہ (صفحہ ۲۳) پڑھئے۔ انھوں نے پڑھنے کے بعد کہا "میں نے آج تک کسی عالم کو نہ پڑھا اور نہ دیکھا جو مسلمانوں کو اس طرح کی باتیں بتائے۔ یہ ایک منفرد رسالہ ہے۔ اب تک میں اس سے واقف نہ تھا۔ اب میں اس کو برابر پڑھوں گا۔ اس طرح وہ تقریباً دس سال سے کر رہے ہیں۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو الرسالہ کا قاری بنایا ہے۔ وہ ہندو مسافروں کو بھی پڑھاتے ہیں اور مسلم مسافروں کو بھی۔ غیر اردو دانوں کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

۱۱۔ ایک صاحب الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرے بچے انگریزی درس گاہوں میں پڑھتے ہیں۔ وہ اردو سمجھتے ہیں مگر وہ اردو پڑھ نہیں سکتے۔ انھوں نے بتایا کہ جب الرسالہ آتا ہے تو میں اپنے بچوں کو بٹھاتا ہوں اور ان کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ الرسالہ کے دوسرے بہت سے قاری بھی اپنے گھروں میں ایسا ہی کر رہے ہیں۔

۱۲۔ مولانا مقبول احمد مفتاحی (اجرا، مدھوبنی) جامع مسجد میں امام ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہر ہفتہ وہ جمعہ کے خطبہ سے پہلے آدھ گھنٹہ تقریر کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر الرسالہ سے اصلاحی باتیں لے کر لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ مختلف مقامات پر مسجدوں کے ذریعہ الرسالہ کا تعمیری پیغام پھیلا رہے ہیں۔

۱۳۔ ایک صاحب لکھتے ہیں، آپ کی کئی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ ان سے بہت متاثر ہوں۔ دین کامل جیسی ایمان افروز اور ولولہ انگیز کتاب آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ اسلام کا مطلب کیا ہے۔ اور وہ اپنے ماننے والے کو کیا بنا دیتا ہے۔ اس کو سمندر کا اضطراب اور ساحل کا سکوت عطا کرتا ہے۔ الرسالہ برابر مل رہا ہے۔ پڑھ کر عجیب روحانی کیف محسوس کرتا ہوں۔ فکر و تدبر کی نئی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ سچ ہے از دل خیزد بر دل ریزد۔ (بدر جمال اصلاحی، سرائمیر، اعظم گڈھ)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک کے لیے

ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۷ — اکتوبر ۱۹۹۰

فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATTIC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

کم پر راضی ہونا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ نے وہاں طواف اور سعی کیا۔ قربانی کی اور سر منڈایا۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب سے بیان کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ اللہ کی طرف سے عمرہ کی بشارت ہے۔ چنانچہ تقریباً پندرہ سو آدمی سفر کے لیے تیار ہو گیے۔ آپ ان کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

آپ اور آپ کے اصحاب مکہ سے ۹ میل کے فاصلہ پر حدیبیہ پہنچے تھے کہ قریش نے آگے بڑھ کر آپ کو روک دیا۔ اور کہا کہ ہم آپ لوگوں کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان بات چیت شروع ہوئی۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مع اصحاب مدینہ واپس چلے جائیں۔ البتہ اگلے سال وہ خاموشی کے ساتھ آکر عمرہ کر سکتے ہیں۔

اس معاہدہ کے مطابق آپ نے فیصلہ فرمایا کہ عمرہ نہ کریں اور حدیبیہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے جائیں تاہم قربانی کے جانور آپ کے ساتھ موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم طواف اور سعی نہیں کر سکے۔ تاہم قربانی اور حلق ہم کر سکتے ہیں۔ اٹھو، اپنے جانوروں کو ذبح کرو اور سر کے بال منڈالو (قوموا فانحروا ثم احلقوا)

یہ گویا کم پر راضی ہونا تھا۔ اگرچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بنا پر لوگوں کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مکہ میں داخل ہوں گے۔ طواف اور سعی کریں گے۔ اور پھر قربانی اور حلق کریں گے۔ مگر جب ایسے حالات سامنے آئے کہ طواف اور سعی بظاہر ناممکن ہو گیا، اور صرف قربانی اور حلق ممکن رہ گیا۔ تو انھوں نے مکہ میں داخلہ اور طواف اور سعی کا ارادہ چھوڑ دیا اور قربانی اور حلق پر راضی ہو گیے۔

یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو کم پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ زیادہ کو پاتا ہے۔ جو شخص پہلے مرحلہ میں کم پر راضی نہ ہو وہ نہ کم کو پاتا اور نہ زیادہ کو۔ اس کے حصہ میں جو چیز آتی ہے وہ صرف یہ کہ وہ نزاع چھیڑ کر غیر ضروری طور پر اپنے کو برباد کرتا رہے۔ اور جب برباد ہو کر نزاع کے قابل نہ رہے تو یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دینے کی کوشش کرے کہ میں تو کامیابی کے عین قریب پہنچ گیا تھا مگر دشمنوں کی سازش نے مجھے ناکام بنا دیا۔

کم پر راضی ہونا بھی رسول اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۰

عجیب فرق

نئی دہلی میں رانی جھانسی مارگ پر ہفت روزہ آرگنائزر اور پانچ جنیہ کے دفاتر قائم ہیں۔ ان کے ذمہ داروں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنے یہاں ایک میٹنگ کریں اور آپ وہاں آکر ہمیں اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔ آخر کار اس کے لیے ۷ جولائی ۱۹۹۰ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس روز وہاں جاکر میں نے اسلام کے بارہ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی اور سوالات کے جوابات دیے۔

مسلم اخبارات نے اپنی خود ساختہ رپورٹنگ میں اس تقریر کو کچھ کا کچھ بنا دیا۔ مثال کے طور پر ایک مسلم ہفت روزہ نے اس کی جو رپورٹ چھاپی اس کا عنوان سنسنی خیز طور پر یہ تھا:

مولانا وحید الدین خان : مسلم دشمن طاقتوں کے ہاتھ کا کھلونا۔

مسلم اخبار کے نزدیک میری تقریر اس بات کا ثبوت تھی کہ میں مسلم دشمن طاقتوں کے ہاتھ کا کھلونا ہوں مگر جن ہندو صاحبان کے درمیان میں نے وہ تقریر کی، ان کی نظر میں سارا معاملہ بالکل برعکس تھا۔

آرگنائزر کے ایڈیٹر مسٹر وی پی بھاٹیا نے اپنے اخبار کی دو قسطوں (۵ اگست، ۱۹ اگست ۱۹۹۰) میں اس کی بابت اپنے تاثرات شائع کیے ہیں۔ وہ خود اس میٹنگ میں شروع سے آخر تک موجود تھے۔ انھوں نے میری تقریر کا جو خلاصہ نکالا وہ یہ تھا کہ میرا مشن اسلام کی تبلیغ اور تبدیلی مذہب (proselytisation) ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی رپورٹ کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا ہے ـــــ ایک مبلغ مولانا:

A Missionary Maulana

ایک ہی مقرر اپنی ایک تقریر کے مطابق مسلم اخبار کی نظر میں "دشمن اسلام" ہے اور وہی مقرر اپنی اسی تقریر کے مطابق ہندو اخبار کی نظر میں "مبلغ اسلام" ـــــ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ایک اخبار اور دوسرے اخبار کے درمیان پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات موجودہ زمانہ میں زرد صحافت (yellow journalism) کا بدترین نمونہ ہیں۔ اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کی یہ غیر اسلامی صحافت بلاشبہ موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

قیمتی نصیحت

تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ نے تقریر کی۔ انھوں نے تبلیغ والوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ جہاں بھی رہیں، خاموشی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ وہاں کا جو نظام ہے، اس میں نہ داخل ہوں اور نہ اس میں دخل دیں۔

یہ نہایت عمدہ نصیحت ہے۔ یہ اسلامی حکمت کے عین مطابق ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک یونیورسٹی میں ہیں۔ وہاں آپ نہ یونین کی سیاست میں داخل ہوں اور نہ وائس چانسلر کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں حصہ لیں۔ آپ ایک حکومتی نظام میں ہیں۔ وہاں آپ نہ عہدہ کے طالب بنیں اور نہ حکومت اور ایڈمنسٹریشن کی مخالفت میں وہ سرگرمیاں دکھائیں جو اپوزیشن کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ان تمام چیزوں سے الگ رہ کر آپ اپنے لیے کام کا میدان تلاش کریں۔

اس طریق کار کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو ہر نظام میں کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آدمی اگر نظام میں داخل ہو تو اس کو رقابتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اگر وہ اس میں دخل دے تو نظام کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو کام ہو سکتا ہے وہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اور ساری طاقت بے فائدہ مشغولیتوں میں ضائع ہو کر رہ جاتی ہے۔

جو لوگ یہ طریقِ کار اختیار کریں وہ شکایت کی نفسیات سے بچے رہتے ہیں۔ ان کی نظر ان مواقع پر نہیں ہوتی جن پر دوسرے لوگ قبضہ کیے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر ہمیشہ ان مواقع پر ہوتی ہے جو دوسروں کے قبضہ کے باوجود ابھی تک خالی پڑا ہوا ہے۔ اس طرح وہ تضاد سے محفوظ رہ کر ہر جگہ اپنے لیے کام کا میدان پالیتے ہیں۔ وہ اس قیمتی دولت کے مالک بن جاتے ہیں جس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔

مفروضہ زیادتیوں کے خلاف "آواز بلند کرنا" کوئی کام نہیں ہے۔ بلکہ امکانی مواقع کو استعمال کرنا کام ہے۔ نظام کو توڑنے میں سرگرم ہونا کوئی کام نہیں، بلکہ ذہنوں کو بدلنے کے لیے محنت کرنا کام ہے۔ اخبار کے صفحات میں جگہ حاصل کرنا کوئی کام نہیں، بلکہ خاموش فکر میں لگنا اصل کام ہے۔ سڑکوں پر مظاہرہ کرنا کوئی کام نہیں۔ کام یہ ہے کہ آدمی اپنی تنہائیوں میں کام کے لیے تڑپے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑیں۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۰

آخری فیصلہ

مہاراشٹر ہائی کورٹ کے ایک جج نے ایک وکیل کے خلاف ایسی زبان استعمال کی جو وکیل کے نزدیک قابل اعتراض تھی۔ جلد ہی دوسرے وکیلوں نے اس کا ساتھ دیا۔ مہاراشٹر اور گوا کی بار کونسل کی ایک ہنگامی میٹنگ کی گئی۔ اس میں متفقہ طور پر ایک رزولیوشن پاس کیا گیا کہ جج نے جو کچھ کہا وہ اس کے دائرہ سے باہر تھا، اس بنا پر وہ اس قابل ہے کہ اس کی مذمت کی جائے۔

اس واقعہ پر ٹائمس آف انڈیا (۲۸ اپریل ۱۹۹۰) نے ایک نوٹ شائع کیا ہے۔ اس نوٹ کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے ——— فیصلہ کرنے والے کا فیصلہ کیا گیا:

Judge judged

میں نے اس کو پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ یہی واقعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت میں ہونے والا ہے۔ آخرت وہ دنیا ہے جہاں تولنے والے تولے جائیں، جہاں فیصلہ کرنے والوں کے اوپر دوبارہ فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ دنیا میں کسی شخص کو ایک عہدہ حاصل ہے۔ کسی کو شہرت اور مقبولیت مل گئی ہے۔ کوئی پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی شخص کسی اور قسم کی طاقت کا مالک ہے۔ ان حیثیتوں کا فائدہ اٹھا کر ایک شخص دوسرے شخص کو مجرم ثابت کر رہا ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو برا بتا کر اس کی حیثیت کو لوگوں کی نظر میں بگاڑے ہوئے ہے۔

اس قسم کے تمام فیصلے اور پروپیگنڈے وقتی ہیں۔ یہ صرف اس وقت تک باقی رہنے والے ہیں جب تک کہ خداوند ذوالجلال ظاہر نہ ہو جائے جو تمام ججوں کا جج اور تمام فیصلہ کرنے والوں کے اوپر فیصلہ کرنے والا ہے۔ جب خدا ظاہر ہوگا تو وہ مبنی عدل اور انصاف کی بنیاد پر ہر ایک کا فیصلہ فرما دے گا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ حق اور ناحق اور صحیح اور غلط کو صرف اعلان کے طور میں لوگوں کو بتا رہا ہے۔ پھر جب اللہ کا حکم آئے گا تو وہ حق کے مطابق ہر ایک کا فیصلہ کر دے گا۔ اس دن سچے لوگ سرخرو ہوں گے اور غلط کار لوگ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے (المومن ۷۸)

قدرت کا پیغام

جون ۱۹۹۰ میں ایک ہفتہ کے لیے میں کشمیر گیا ہوا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے۔ میں کچھ کشمیری بھائیوں کے ساتھ سری نگر کے باہر ایک ایسے مقام پر گیا جو بالکل کھلا ہوا تھا۔ سرسبز وادی اور برف پوش پہاڑوں کے درمیان ہمارے چاروں طرف پانی کے صاف شفاف چشمے بہتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے بہنے کی آواز قدرت کی دھیمی سرگوشی کی مانند ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

میں ایک چشمہ کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ یہ تقریباً ۲ فٹ کی چوڑائی میں بہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عین چشمہ کے بیچ میں ایک بڑا سا گول پتھر ابھرا ہوا ہے۔ صاف ستھرا پانی بہتا ہوا جب اِس پتھر تک پہنچتا ہے تو وہ ایسا نہیں کرتا کہ وہ پتھر کو توڑ کر اپنے لیے سیدھا راستہ بنانے کی کوشش کرے۔ اِس کے بجائے پانی ایسا کرتا ہے کہ وہ پتھر کے دائیں اور بائیں طرف سے مڑ کر نکل جاتا ہے۔ وہ پتھر سے ٹکراؤ کو اجتناب (avoid) کرتے ہوئے اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔

میں نے اپنے کشمیری دوستوں سے کہا کہ اِس کو دیکھئے۔ اِس قسم کے مناظر پورے جموں اور کشمیر میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ آپ کے نام گویا قدرت کا پیغام ہے، فطرت کا یہ مظہر خاموش زبان میں آپ کو بتا رہا ہے کہ چٹان سے نہ ٹکراؤ، بلکہ چٹان سے بچتے ہوئے اپنا راستہ نکالو۔

اِس قسم کے چشمے کشمیر کی وادیوں میں سال بھر جاری رہتے ہیں۔ اس طرح قدرت کا یہ تعمیری پیغام کشمیر میں لاکھوں مقامات پر ہر روز نشر کیا جا رہا ہے۔ مگر آپ لوگ عین اُسی کے درمیان رہتے ہوئے اُس کو نہیں سنتے، آپ اُس سے کوئی سبق نہیں لیتے۔

اِس دنیا میں کامیابی اُس کے لیے ہے جو اختلاف کے موقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ جو راستہ کی چٹانوں سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر جاری رکھے۔ ایسا ہی شخص اِس دنیا میں اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ کشمیر کے لوگوں کو فطرت کی اٹل زبان میں یہ سبق دے کر خدا نے انھیں اس مقام پر کھڑا کیا تھا کہ وہ اِس حکمت کو اختیار کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کریں اور پھر دنیا کو پیغام دے کر دنیا کے رہبر بنیں۔ مگر کشمیر کے لوگ، شاعر کے الفاظ میں، خود بے راہ ہو کر اپنے کو برباد کر رہے ہیں، وہ دوسروں کو کیا رہنمائی دیں گے؛ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۰

انسانی عظمت

اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) ۱۹۴۲ میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد وہ پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ کر رہا تھا کہ اس پر ایک خطرناک بیماری کا حملہ ہوا۔ اپنے حالات کے ذیل میں اس نے لکھا ہے کہ میں ریسرچ کا ایک طالب علم تھا۔ میں مایوسانہ طور پر ایک ایسے مسئلہ کے حل کا منتظر تھا جس کے ساتھ مجھے پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنا تھا۔ دو سال پہلے ڈاکٹروں نے تشخیص کیا تھا کہ مجھے ایک مہلک بیماری ہو چکی ہے۔ مجھے باور کرایا گیا تھا کہ میرے پاس اب زندہ رہنے کے لیے صرف ایک سال یا دو سال اور ہیں۔ ان حالات میں بظاہر میرے لیے پی ایچ ڈی پر کام کرنے کا زیادہ وقت نہیں تھا۔ کیوں کہ میں اتنی مدت تک زندہ رہنے کی امید نہیں کر سکتا۔ مگر دو سال گزرنے پر بھی میرا حال زیادہ خراب نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعات میرے لیے زیادہ بہتر ہوتے جا رہے تھے:

I was a research student desperately looking for a problem with which to complete my Ph.D. thesis. Two years before I had been diagonsed as suffering from ALS, commonly known as Lou Gehrig's disease, or motor neuron disease, and given to understand that I had only one or two more years to live. In these circumstances there had not seemed much point in working on my Ph.D. – I did not expect to survive that long. Yet two years had gone by and I was not that much worse. In fact, things were going rather well for me.

(Stephen W. Hawking, *A Brief History of Time*, p. 53.)

ڈاکٹروں کے اندازہ کے خلاف اسٹیفن ہاکنگ زندہ رہا۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس نے اپنی محنت سے اتنی لیاقت پیدا کی کہ کہا جاتا ہے کہ وہ آئن اسٹائن کے بعد سب سے بڑا نظریاتی طبیعیات داں ہے۔ آج وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کا پروفیسر ہے۔ یہ وہ کرسی ہے جو اب تک صرف ممتاز سائنس دانوں کو دی جاتی رہی ہے۔ اس کی صرف ایک کتاب (اے بریف ہسٹری آف ٹائم) ۱۹۸۸ میں چھپی تو وہ اتنی مقبول ہوئی کہ پہلے ہی سال اس کے چودہ اڈیشن شائع کیے گئے۔

انسان کی ذہنی صلاحیتیں اس کی ہر کمزوری کی تلافی ہیں۔ اس کا ارادہ ہر قسم کی رکاوٹوں پر غالب ہے۔ وہ ہر ناکامی کے بعد اپنے لیے کامیابی کا نیا راستہ نکال لیتا ہے۔

زندگی کا راز

بل کازبی (Bill Cosby) ایک سیاہ فام امریکی ہے۔ وہ ۱۹۳۷ میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ ابتداءً وہ بمشکل ایک ہزار ڈالر سالانہ کماتا تھا۔ آج اس کی سالانہ آمدنی کئی ملین ڈالر تک پہونچ چکی ہے۔ سفید فام امریکہ میں ایک سیاہ فام شخص کو یہ غیر معمولی کامیابی کیوں کر حاصل ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ تعلیم اور دانش مندانہ جدوجہد کے ذریعہ۔ بل کازبی فلاڈلفیا کے ایک اسکول میں پانچویں گریڈ میں تھا۔ وہ اسکول میں اکثر تماشے کیا کرتا تھا اور پڑھائی پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ اس کی خاتون ٹیچر مس نیجل (Miss Nagle) نے ایک روز اس سے کہا کہ اگر تم جوکر بننا چاہتے ہو تب بھی تمہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ تعلیم کے بغیر تم کسی بھی میدان میں ترقی نہیں کر سکتے (اسپان، جنوری ۱۹۸۷)

بل کازبی نے اس نصیحت کو پکڑ لیا۔ اس نے پڑھنے میں محنت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اس نے ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے تفریحی پروگراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ آخر کار اس کو ٹیلی ویژن پروگرام ملنے لگے۔ آج وہ امریکہ کا مشہور ترین کامیڈین (comedian) ہے۔ بل کازبی شو (Bill Cosby Show) امریکی ٹیلی وژن کا سب سے زیادہ مہنگا پروگرام ہوتا ہے۔ دوسرے بہت سے سیاہ فام امریکیوں کے برعکس، اس نے نسلی امتیاز کی باتیں کرنے سے پرہیز کیا۔ اس نے اپنی کہانیاں عالمی واقعات کی بنیاد پر بنائیں جو تمام لوگوں کے لیے قابل فہم ہو سکیں:

Unlike many other black comedians, he avoided racial nuances and drew his stories from the kind of universal occurrences that could be understood by all.

Span, January 1987

امریکی عام طور پر سیاہ فام لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ مگر وہ بل کازبی کے پروگرام کو نہایت شوق کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ بل کازبی نے سفید فام لوگوں کی رعایت کی تو سفید فام لوگوں نے بل کازبی کی رعایت کرنا شروع کر دیا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ میں دل چسپی لیں تو آپ بھی دوسروں میں دل چسپی لینا شروع کر دیجئے۔ اور اس کے بعد آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

سچی خوشی

الزبتھ ٹیلر (Elizabeth Taylor) جب ۲۸ سال کی عمر کو پہونچی تو وہ امریکہ میں گویا شہزادی بن
گئی۔ فوٹو گرافر ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ اور اس کے منھ سے نکلا ہوا ہر لفظ اخباروں میں نمایاں
طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اس نے چوتھی بار مئی ۱۹۵۹ میں ایڈی فشر (Eddie Fisher) سے شادی کی۔
مگر تب بھی اسے خوشی نہیں ملی۔ ایک ملین ڈالر سے اس نے اپنی مشہور ترین فلم کلیو پترا (Cleopatra)
کی ہیروئن کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ مگر عین شوٹنگ کے وقت وہ بے ہوش ہو گئی اور اس کو اسپتال
میں داخل ہونا پڑا۔

آج کل سب سے زیادہ شہرت ان لوگوں کو ملتی ہے جو سیاست کے اسٹیج پر یا فلم کے اسٹیج پر ظاہر
ہوتے ہیں۔ مگر سیاست اور فلم کے ان ہیروؤں کے اندرونی حالات نہایت ابتر ہوتے ہیں۔ اخبارات
کے صفحات میں یا ٹیلی ویژن کے اسکرین پر تو وہ ہنستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقی زندگی اتنی
کبیدہ ہوتی ہے کہ انھیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ان میں سے اکثر کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ گولیاں کھا کر سوتے
اور جب گولی سے بھی نیند نہیں آتی تو شراب اور منشیات کے ذریعہ غم غلط کرتے ہیں۔

کسی نے کہا کہ "سب سے زیادہ ہنسنے والے چہرے سب سے زیادہ غم گین چہرے ہوتے ہیں"۔
جو شخص اپنے دل کی کیفیت کے تحت ہنسے اس کا ہنسنا واقعی ہنسنا ہوتا ہے۔ مگر سیاسی لیڈر اور فلمی ہیرو
ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں، جو دوسروں کو دکھانے کے لیے بولتے ہیں، ان کا ہنسنا ہمیشہ
مصنوعی ہوتا ہے۔

سچی خوشی اس آدمی کے لیے ہے جو خود اپنی ذات میں جینا جانتا ہو۔ جو خود اپنے اندر زندگی
کا راز پالے۔ باہر کے لیے جینے والے کبھی سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔

مصنوعی خوشی اور حقیقی خوشی میں وہی فرق ہے جو پلاسٹک کے بچہ میں اور زندہ بچہ میں۔ مصنوعی
خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ اور سچی خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے اندر۔ آدمی
صرف اسی سے خوش ہو سکتا ہے جو اندر سے ملے۔ باہر سے ملنے والی چیز کبھی آدمی کو حقیقی خوشی
کی دولت نہیں دے سکتی۔

قول کے ساتھ عمل

۲۸ اپریل ۱۹۹۰ کو جناب کلدیپ سنگھ گجرال (پیدائش ۱۹۴۰) سے ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ سے بہت دل چسپی رکھتے ہیں اور اس کو ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

گجرال صاحب کے ساتھ جناب راحت ہاشمی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ ایک ہفتہ پہلے میں گجرال صاحب کے ساتھ دہلی میں کسی سڑک پر چل رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک سردار لڑکا بھیک مانگ رہا ہے۔ گجرال صاحب فوراً رک گیے۔ انھوں نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تم سردار ہو کر بھیک مانگتے ہو۔ اس کو سمجھایا اور پھر کہا کہ یہ میرا پتہ ہے، کل تم میرے یہاں آجاؤ۔ میں تم کو کسی آفس میں لے چلوں گا اور وہاں تم کو کام دلاؤں گا۔

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ سردار بھیک نہیں مانگتا۔ مگر سردار بھیک کیوں نہیں مانگتا۔ اس کا راز مجھے اس واقعہ کو سننے کے بعد سمجھ میں آیا۔

اس واقعہ پر غور کیجیے۔ اس واقعہ کے دو حصے ہیں۔ ایک ہے گجرال صاحب کا لڑکے سے کہنا کہ تم بھیک کیوں مانگتے ہو۔ دوسرا ہے، لڑکے سے یہ کہنا کہ تم میرے یہاں آجاؤ۔ میں تم کو کسی آفس میں کام دلا دوں گا۔

آپ کو ایسے بے شمار لوگ ملیں گے جو بھیک مانگنے والوں کی قطاریں دیکھ کر ان کو برا کہیں۔ ان کے خلاف تقریر کریں اور مضامین لکھیں۔ مگر صرف اس قسم کی تقریر و تحریر سے بھیک مانگنا ختم نہیں ہو سکتا۔ بھکاریوں کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صاحب استطاعت افراد ذاتی طور پر یہ ذمہ داری لیں کہ وہ بھیک کے پیشہ کو ختم کرنے کے لیے عملی طور پر اپنا حصہ ادا کریں گے۔

قوم کے اندر کوئی بھکاری نہ رہے، یہ بڑی اچھی سوچ ہے۔ مگر ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ کہنے والے اپنے قول کے ساتھ اپنے عمل کو بھی شامل کریں۔ عمل کے بغیر قول کا فائدہ صرف قائل کو ملتا ہے۔ مگر قول کے ساتھ عمل کا فائدہ ان لوگوں تک پہنچ جاتا ہے جن کے لیے قائل نے اپنی بات کہی تھی۔

اصلاح کا کریڈٹ صرف اس کو ملتا ہے جو کہنے کے ساتھ کرنے کے لیے بھی تیار ہو۔

بلند پروازی

جاپان ایرلائنز کا ایک جہاز (بوئنگ ۷۴۷) ۱۲ اگست ۱۹۸۵ کو ٹوکیو سے اڑا۔ اسے ایک گھنٹہ میں اوساکا پہونچنا تھا۔ مگر اڑان کے صرف ۱۰ منٹ بعد پائلٹ نے محسوس کیا کہ اس نے جہاز پر اپنا کنٹرول کھو دیا ہے۔ جہاز کو ۲۴ ہزار فیٹ کی بلندی پر اڑنا تھا۔ مگر وہ اترتے اترتے ۹۸۰۰ فٹ کی بلندی پر آگیا۔ اور بالآخر وہ پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔

اس جہاز کے ۵۲۰ مسافر مر گیے۔ ان مرنے والوں میں ہندستان کے ایک انجینیر مسٹر کلیان مکرجی اور ان کی بیوی بھی تھے۔ مسٹر مکرجی کی عمر بوقت حادثہ ۴۱ سال تھی۔ وہ ایک تجارتی مہم پر حال میں جاپان گیے تھے۔ جاپان سے انھوں نے اپنے لڑکے نرنجن مکرجی (۱۳ سال) کے نام خط لکھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ۱۲ اگست کو ایک تفریحی سفر (pleasure trip) پر ٹوکیو سے اوساکا جا رہے ہیں۔ (ہندستان ٹائمس ۱۴ اگست ۱۹۸۵)

جہاز کو بلندی پر اڑانے کا ایک مقصد یہ ہے کہ وہ پہاڑوں یا اونچی عمارتوں سے نہ ٹکرائے۔ مذکورہ جہاز کے لیے "۲۴ ہزار فٹ" کی بلندی ایک محفوظ بلندی تھی۔ مگر جب اس کے انجن میں خرابی آگئی تو وہ اس محفوظ بلندی پر قائم نہ رہ سکا۔ وہ اترتے اترتے "۹۸۰۰" فٹ کی بلندی پر آگیا۔ اب وہ محفوظ بلندی کی سطح پر نہ رہا۔ چنانچہ وہ پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ ہماری زندگی کا سفر بے شمار انسانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے فکر وخیال کے اعتبار سے نچلی سطح پر سفر کریں تو بار بار دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا رہے گا۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ آدمی فکر وخیال کے اعتبار سے اپنے آپ کو اتنی بلندی پر پہونچا دے کہ دوسروں سے ٹکراؤ کا امکان ہی اس کے لیے ختم ہو جائے۔

اعراض کا اسلامی اصول آدمی کو یہی بلندی عطا کرتا ہے۔ اعراض اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو بعض مفکرین نے زندگی کے مسئلہ کا برتر حل (superior solution) کہا ہے۔ برابر کی سطح پر سفر کرنے میں دوسروں سے ٹکراؤ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے دانش مند آدمی اپنے سفر کی سطح کو بلند کر لیتا ہے۔ تاکہ دوسروں کے ساتھ اس کا ٹکراؤ نہ پیش آئے۔ اسی برتر حکمت کو اختیار کرنے کا نام اعراض ہے

ایک خودکشی

مسز پدما ڈیسائی مشہور صنعت کار راجہ رام کروسکر کی صاجزادی تھیں۔ ان کی شادی سابق وزیراعظم ہند مرارجی ڈیسائی کے صاجزادے مسٹر کانتی لال ڈیسائی سے ہوئی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی معاشی حیثیت کیا تھی۔ مگر ۱۶ نومبر ۱۹۸۴ کو انھوں نے اپنے پانچویں منزل کے فلیٹ سے کود کر خودکشی کرلی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۱ سال تھی۔ نیچے گرنے کے فوراً بعد وہ اسپتال لے جائی گئیں۔ مگر ڈاکٹروں نے دیکھ کر بتایا کہ وہ اسپتال پہونچنے سے پہلے مرچکی ہیں۔

انھوں نے خودکشی کیوں کی، اس کی وجہ خبر میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے:

Padma committed suicide after hearing that the family has lost a case in the Supreme Court to retain their flat.

پدما نے یہ خبر سننے کے بعد خودکشی کرلی کہ ان کا خاندان اپنے فلیٹ کو قبضہ میں رکھنے کا کیس سپریم کورٹ میں ہار گیا ہے (ہندستان ٹائمس، ٹائمس آف انڈیا ۱۷ نومبر ۱۹۸۴)

۱۹۷۷ میں جنتا پارٹی کی کامیابی کے بعد مرارجی ڈیسائی وزیراعظم ہوئے۔ وزارت عظمیٰ کی ڈھائی سالہ مدت میں ان کے صاجزادے کانتی لال ڈیسائی نے کئی معاملات کیے۔ ان میں سے ایک مذکورہ فلیٹ بھی تھا۔ میرین ڈرائیو (بمبئی) میں ایک بڑی بلڈنگ ہے جس کا نام اوشیانا (Oceana) ہے۔ اس کی پانچویں منزل پر یہ فلیٹ تھا۔ جنتا حکومت کے خاتمہ کے بعد عدالت میں یہ کیس چلا کہ مسٹر کانتی لال ڈیسائی نے یہ فلیٹ غیرقانونی طور پر حاصل کیا تھا۔ عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیا، مسز پدما ڈیسائی کو اس فیصلہ کی خبر بذریعہ ٹیلی فون ملی۔ اس کے بعد انھوں نے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔

خاتون نے سمجھا کہ وہ خودکشی کرکے ہمیشہ کے لیے عدالت کے فیصلہ سے نجات حاصل کررہی ہیں۔ لیکن اگر انھیں معلوم ہوتا کہ وہ خودکشی کرکے اپنے آپ کو زیادہ بڑی عدالت میں پہونچا رہی ہیں جہاں اس قسم کے کسی اقدام کا موقع ان کے لیے باقی نہیں رہے گا۔ تو ان کا فیصلہ بالکل مختلف ہوتا۔

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری عجلت پسندی ہے۔ وہ فوری طور پر ایک سخت اقدام کر بیٹھتا ہے حالاں کہ اگر وہ سوچے تو کبھی ایسا نہ کرے۔

بے فائدہ

تحریک نسواں (feminism) کے مغربی علم برداروں کا کہنا تھا کہ عورت اور مرد ہر اعتبار سے بالکل یکساں ہیں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ انھیں مسز (Mrs) کے لفظ پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے کہا کہ عورت کو اس کے شوہر کے نام کے ساتھ مسز لگا کر کہنا عورت کی توہین ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کی کوئی علیحدہ شخصیت نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح مرد کے لیے ایک مستقل لفظ مسٹر (Mr) ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے بھی ایک مستقل لفظ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مز (Ms) کا لفظ تجویز کیا جو محدود طور پر رائج ہوا۔

تاہم تحریک نسواں کے وکیل اس سے مطمئن نہ ہو سکے۔ اس کے بعد انھوں نے کہنا شروع کیا کہ جنس (تذکیر و تانیث) کو ظاہر کرنے والے الفاظ ہی سرے سے ڈکشنری سے نکال دیے جائیں۔ اس تحریک نے امریکی حکومت کو اس حد تک متاثر کیا کہ ۱۹۷۹ میں امریکہ کے صحت، تعلیم اور فلاح عامہ کے محکموں نے ہدایت جاری کر دی کہ ایسے انگریزی الفاظ استعمال نہ کیے جائیں جن سے جنس کا اظہار ہوتا ہو۔ ایسے کاغذات اور فارم جن میں جنس کو ظاہر کرنے والے الفاظ استعمال کیے گیے ہوں۔ ان حکومتی شعبوں میں قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ممنوعہ الفاظ کی لمبی فہرست میں سے چند الفاظ یہ ہیں :

he, she, mother, father, chairman, housewife, policeman, mankind

اس کے مطابق، مثال کے طور پر، یہ حکم دیا گیا کہ آئندہ ملک مین (milkman) کو ڈیری پروڈکٹس ڈیلورر (dairy products deliverer) کہا جائے، وغیرہ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹائمس آف انڈیا (یکم نومبر ۱۹۷۹) نے لکھا تھا کہ تذکیر و تانیث کو ختم کرنے کے بجائے وہ کیوں اس میں مشغول نہیں ہوتے کہ بھوک، بے روزگاری اور بے امنی کو ختم کریں :

Rather than abolish gender, why don't they get busy
with the abolition of hunger, unemployment and insecurity.

جو کام ضروری ہے، اس میں کوئی اپنے آپ کو مشغول نہیں کرتا۔ البتہ جو کام غیر ضروری ہے اس میں ہر آدمی مصروف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح کے نام پر ہونے والی بے شمار سرگرمیوں کے باوجود حقیقی اصلاحی نتیجہ کہیں نظر نہیں آتا۔

نفسیاتی کمزوری

پٹرونیس آربٹر (Petronius Arbiter) رومی بادشاہ نیرو (Nero) کا ایک قریبی دوست تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر اس کو روم کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ اس نے ۶۶ء میں وفات پائی۔ اس کا ایک قول انگریزی میں اس طرح نقل کیا گیا ہے —— انسانی دماغ ہمیشہ اس چیز کی تمنا میں رہتا ہے جس کو اس نے کھو دیا ہے :

The mind longs for what it has missed.

یہ بات حال کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی وہ ماضی کے لیے صحیح تھی۔ نیز یہ کہ یہ نفسیاتی کمزوری اتنی عام ہے کہ افراد اور اقوام دونوں اس میں یکساں طور پر مبتلا رہتے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کھوئی ہوئی چیز اگرچہ ماضی میں لامعلوم تھی مگر حال میں وہ پوری طرح معلوم چیز بن چکی ہوتی ہے۔ ماضی میں وہ پوری طرح معلوم اور واضح نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ مگر بعد کو وہ مکمل طور پر علم کے دائرہ میں آجاتی ہے۔ اس لیے انسان اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔ مگر یہ نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسی انسانی کمزوری کی بنا پر قوموں کے اندر سطحی قیادتیں جنم لیتی ہیں۔ سطحی قیادت ہمیشہ "معلوم محرومیوں" پر اٹھتی ہے۔ کیوں کہ معلوم محرومیوں پر قوموں کو ابھارنا بے حد آسان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں اگر ایک لیڈر یہ نعرہ لگائے کہ "لینا ہے کشمیر" تو اس کو فوراً عوام کے درمیان مقبولیت حاصل ہوجائے گی۔ کروروں روپیہ کا چندہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ جمع کرلے گا۔ کیوں کہ کشمیر کا کھویا جانا پاکستانیوں کے لیے ایک معلوم واقعہ بن چکا ہے۔

اس کے برعکس اگر پاکستان کا ایک مسلم رہنما کہے کہ ہم کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھنا ہے تو ایسی پکار پر کبھی عوام کی بھیڑ جمع نہیں ہوگی۔ کیوں کہ داعیانہ حیثیت کا کھونا عوام کے لیے کوئی معلوم واقعہ نہیں۔ جھوٹی قیادت ہمیشہ معلوم محرومیوں کی بنیاد پر اٹھتی ہے اور سچی قیادت ہمیشہ نامعلوم محرومی کی بنیا پر۔ یعلمون ظاهرا من الحیاۃ الدنیا وهم عن الآخرة هم غافلون

(الروم ۷)

کون سا مذہب

ڈاکٹر رادھاکرشنن (۱۹۷۵-۱۸۸۸) ہندستان کے مشہور مصنف اور فلسفی تھے۔ ان کی ایک کتاب وہ ہے جس کا نام مذہب اور کلچر (Religion and Culture) ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ مذہب انسان کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ مذہب کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ سوال مذہب یا بے مذہب کا نہیں بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کس قسم کا مذہب:

There is no question of religion or no religion, but what kind of religion.

ڈاکٹر رادھاکرشنن نے جس قسم کے مذہب کی وکالت کی ہے، وہ مذہب وہ ہے جو وحدتِ ادیان پر عقیدہ رکھتا ہو۔ یعنی یہ تصور کہ ایک ہی آفاقی حقیقت ہے جو ہر مذہب میں ظاہری فرق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

یہ نظریہ دراصل جزء پر کل کو قیاس کر کے وضع کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دو مختلف سچائیوں میں جزئی فرق ہو سکتے ہیں، تاہم اس جزئی فرق کے باوجود دونوں سچائیاں ایک مانی جائیں گی۔ مگر جب فرق کلی نوعیت کا ہو، مثلاً ایک مذہب کہے کہ خدا ہے، اور دوسرا مذہب کہے کہ مستقل بالذات حیثیت سے خدا کا کوئی وجود نہیں۔ اس طرح کے فرق جہاں پائے جائیں وہاں کوئی ایک ہی مذہب سچا ہوگا نہ کہ دونوں مذہب۔

مذہب کی ایک قسم وہ ہے جو ذاتی تجربات کو مذہب کی بنیاد بتاتی ہے۔ اس قسم کا مذہب سراسر ناقابل قبول ہے۔ کیوں کہ اصل سوال استناد کا ہے۔ ذاتی تجربہ کی بنیاد پر جو مذہب بنے، اس کو مستند نہیں کہا جا سکتا، اس لیے وہ قابل قبول بھی نہیں ہو سکتا۔

وہ کون سا مذہب ہے جس کو اختیار کیا جائے۔ خالص علمی اعتبار سے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مذہب جو ثابت شدہ ہو۔ یعنی وہ مذہب جو تاریخ کے معیار پر مستند ثابت ہو۔ وہ مذہب جس کا پیغمبر تاریخی پیغمبر ہو۔ جس کی دی ہوئی کتاب اپنی اصل صورت میں محفوظ ہو۔ جو تاریخ کی کسوٹی پر پوری طرح معتبر قرار پاتا ہو۔

دس سال خاموش

خلافت تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں اٹھی اور ۱۹۲۴ میں آخری طور پر ختم ہو گئی۔ تقریباً دس سال تک ہندستانی مسلمانوں میں اس کا ہنگامہ جاری رہا۔ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳-۱۹۴۳) غالباً واحد نمایاں شخص تھے جو اس کے مخالف تھے اور اس پر سخت تنقید کرتے تھے۔

مولانا تھانوی کے ملفوظات میں ہے کہ "جس زمانہ میں تحریک خلافت کا شباب تھا، شورش اپنا طبیعتیں جوش میں بھڑک رہی تھیں۔ چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ علاوہ بر بھلا کہنے اور لعن طعن اور ہر قسم کے بہتان و الزامات لگانے کی دھمکی کے خطوط میرے پاس آئے کہ یا تو شریک ہو جاؤ ورنہ قتل کر دئے جاؤ گے۔"

مولانا تھانوی اس سلسلہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں تحریک خلافت کے ایک ممتاز حامی میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس تحریک میں شریک کیوں نہیں ہوتے میں نے کہا کہ اس کام کو کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی امیر المومنین ہو۔ اس شرط کی تکمیل کے بغیر یہ ساری تحریک غلط ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم آپ ہی کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں امیر المومنین بننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس میں کچھ شرائط ہیں۔

مولانا تھانوی کی پیش کردہ پہلی شرط کا خلاصہ یہ تھا کہ تمام ہندستان کے مسلمان اپنا تمام مال اور جائداد میرے نام ہبہ کر دیں۔ کیوں کہ مال کے بغیر کوئی امیر المومنین کچھ نہیں کر سکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ہندستان کے تمام مشاہیر علماء اور لیڈروں کے دستخط کراؤ کہ وہ مجھ کو امیر المومنین تسلیم کریں۔ اگر بلا اختلاف سب نے تسلیم کر لیا تو میں امیر المومنین ہوں گا۔ اگر ایک نے بھی اختلاف کیا تو میں امیر المومنین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اختلاف کی صورت میں امیر امیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تسلیم کے بعد پھر کوئی اختلاف یا خلاف کرے تو امیر کو حق ہے کہ وہ اپنی قوت سے ایسے لوگوں کو دبائے اور ٹھیک کرے۔ قبل از تسلیم حق نہیں کہ اس کو دبایا جائے۔"

اس کے بعد مولانا تھانوی نے کہا: "اب سنئے کہ امیر المومنین ہونے کے بعد سب سے اول جو حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ دس سال تک کے لئے سب خاموش۔ ہر قسم کی تحریک اور ہر قسم کا شور و غل

بند۔ اس دس سال میں انتظام کروں گا مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے اور ان کی اصلاح کے لئے باقاعدہ انتظام ہوگا۔ غرض کہ مکمل انتظام کے بعد جو مناسب ہوگا حکم دوں گا۔ عمل صورت یہ ہے کام کرنے کی۔ اور اگر محض کاغذی امیرالمومنین بننا چاہتے ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج امیرالمومنین ہوں گا کل کو اسیرالکافرین ہوں گا۔ آج سردار بنوں گا، کل سر دار ہوں گا"

مولانا تھانوی اس کے بعد کہتے ہیں: "خلاصہ یہ ہے کہ ہر کام اصول سے ہو سکتا ہے۔ بے اصول تو گھر کا انتظام بھی نہیں ہو سکتا۔ ملک کا تو کیا خاک انتظام ہوگا۔ یہ ہیں وہ اصولی باتیں جن پر مجھ کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور قسم قسم کے الزامات و بہتان میرے سر تھوپے جاتے ہیں اور لوگ مجھ سے خفا ہیں۔ اور وجہ خفا ہونے کی صرف یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اصول کے ماتحت کام کرو۔ جوش سے کام مت لو۔ ہوش سے کام لو۔ جوش کا انجام خراب نکلے گا۔ حدود شرعیہ کی حفاظت رکھو۔ وہ ان باتوں کو اپنے مقاصد میں روڑا اٹکانا سمجھتے ہیں" (الافاضات الیومیہ، جلد اول، صفحہ ۱۰۰-۱۰۱)

مولانا تھانوی کی ان انتہائی معقول باتوں کو کسی نے نہیں سنا۔ تمام مسلمان پر جوش خطیبوں کی آواز پر بے معنی دوڑ لگاتے رہے۔ اپنے زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے مولانا تھانوی کہتے ہیں: مسلم عوام کی حالت یہ ہے کہ جس نے مرضی کے موافق فتویٰ دے دیا، یا کوئی عالم یا لیڈر ان کے ساتھ ہو لیا، اس میں سب کمالات ہیں۔ اس کو عرش پر پہنچا دیں گے۔ اگر کسی نے مرضی کے خلاف کوئی بات کی تو تحت الثریٰ میں اس کو جگہ ملنا مشکل۔ غرض کہ ایک گڑبڑ ہے۔ اور یہ طریقہ کار جو موجود ہے، یہ سراسر اسلام اور شریعت سب کے خلاف ہے۔ اس کو اسلام اور مسلمانوں سے کیا تعلق (صفحہ ۱۱۱)

اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی صحیح لیڈر نہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر کسی صحیح آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ وہ جھوٹے الفاظ بولنے والوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، اور جو آدمی سچے الفاظ بولے اس سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ آج مسلمانوں کا حال، قرآن کے مطابق، یہ ہو رہا ہے کہ اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں گے (الاعراف ۱۴۶)

تعمیر یا تخریب

"وفاق" پاکستان کا ایک روزانہ اخبار ہے جو لاہور، راولپنڈی، سرگودھا اور رحیم یار خاں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱ مئی ۱۹۹۰ کے صفحہ اول پر ایک تصویر ہے جس میں مسلمانوں کا ایک ہجوم قہقہہ لگا رہا ہے اور پتھر اور لکڑی سے کسی چیز کو مار رہا ہے۔ اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: جماعت اسلامی کے زیر اہتمام عریانی اور فحاشی کے خلاف مظاہرے، مظاہرین ٹی وی سیٹ کو توڑ رہے ہیں۔

اس کے ساتھ خبر میں بتایا گیا ہے کہ "جماعت اسلامی کی انسداد منکرات مہم کے آخری روز حسن اسکوائر، گلشن اقبال (کراچی) کے نزدیک علامتی طور پر ٹی وی کو سنگسار کر کے بے راہ روی عریانی اور فحاشی کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا۔ ٹی وی سیٹ پر جب ایک ساتھ ہزاروں پتھر برسے تو ٹی وی ایک لمحہ میں چکنا چور ہو گیا۔ جماعت اسلامی کا یہ مظاہرہ اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد مظاہرہ تھا جس میں ہزاروں افراد شریک ہوئے۔ مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے نائب امیر اور اسلامی جمہوری اتحاد کے سکریٹری جنرل پروفیسر غفور احمد نے کہا کہ آج ٹی وی سیٹ تباہ کیا گیا ہے، لیکن اگر ٹی وی نے اپنی روش نہ بدلی تو کل عوام کے ہاتھ ٹی وی اسٹیشن کے در و دیوار تک پہنچ جائیں گے۔ اگر ٹی وی نے اپنا رویہ نہ بدلا اور شیطانی کام کرتا رہا تو شیطان کے ایجنٹوں کے ہاتھ توڑ دئے جائیں گے۔"

تقریباً یقینی ہے کہ جن لوگوں نے ٹی وی سیٹ پر سنگ باری کر کے ٹی وی سیٹ کو توڑا، ان میں سے اکثر کے گھروں میں ٹی وی سیٹ موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں یہ خود ایک شیطانی فعل ہے کہ چوک پر ایک ناکارہ ٹی وی سیٹ رکھ کر اس پر پتھر مارے جائیں اور یہ امید کی جائے کہ ملک سے ٹی وی کی برائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹی وی کی برائی لوگوں کے اپنے اندر ہے نہ کہ ٹی وی اسٹیشن یا حکومتی ایوان کے اندر۔

اگر ٹی وی کی برائی کو ختم کرنا ہے تو لوگوں کے دلوں کو بدلئے، حکومت کے خلاف نعرہ لگانے سے ٹی وی کی برائی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ حتی کہ اگر حکومت پاکستان ٹی وی کے وجود کو ختم

پروگراموں کو بند کرکے صبح وشام ٹی وی کے اوپر صرف تلاوت قرآن کے پروگرام نشر کرنے لگے تب بھی موجودہ حالت میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے طویل زمانۂ حکومت میں اس کا ایک تجربہ کیا گیا اور مکمل طور پر ناکام رہا۔ مثلاً ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ ہندستانی فلموں میں عریانی اور فحاشی ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان میں ہندستانی فلموں پر مکمل پابندی لگادی۔ مگر اس کے بعد جو فرق ہوا وہ صرف یہ تھا کہ جس ہندستانی فلم کو اس سے پہلے لوگ پکچر ہاؤس میں یا ٹیلی وژن سیٹ پر دیکھتے تھے، اس کو اب وہ ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ خود اپنے گھر کے اندر وی سی آر پر دیکھنے لگے۔

جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں ساڑھے گیارہ سال تک مکمل اقتدار حاصل رہا۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر ہندستان کے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تک تمام لوگوں کے نزدیک وہ مرد حق اور مرد مومن تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے ٹیلی ویژن کی وزارت (وزارت اطلاعات) پوری طرح جماعت اسلامی کو دے دی۔ جماعت اسلامی کا وزیر اطلاعات اور جنرل ضیاء الحق کا فوجی ڈنڈا دونوں مل کر پاکستان میں ٹیلی ویژن کی برائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے باوجود ٹیلی ویژن کی برائی میں ایک فیصد بھی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک اندازے کے مطابق اس میں مزید اضافہ ہوگیا۔

اس تجربہ نے واضح طور پر ثابت کیا کہ جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ نظریہ غلط ہے کہ ٹیلی ویژن (اور اس طرح کی دوسری سماجی برائیوں) کی اصلاح حکومت کی طاقت سے ہوتی ہے۔ اگر یہ اصلاح حکومت کی طاقت کے ذریعہ ہونے والی ہوتی تو وہ اس سے پہلے اس وقت ہو چکی ہوتی جب کہ جماعت اسلامی کے وزیر اطلاعات اور "مرد حق ضیاء الحق" کو حکومت کی طاقت حاصل تھی اور وہ اس کے ذریعہ ٹیلی ویژن (اور دوسری سماجی برائیوں) کو ختم کرنے کی مہم چلا رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے لوگوں نے جو پتھر ٹیلی ویژن سیٹ پر مارے، وہ پتھر انھیں خود اپنے آپ پر مارنا چاہئے۔ انھیں چاہیے کہ جماعت اسلامی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بے بنیاد سیاسی نظریات کا ایک پتلا بنائیں اور پاکستان کے ہر چوک پر رکھ کر اس کو سنگسار کریں۔ یہی بے بنیاد نظریہ پاکستان میں "ٹی وی" جیسی برائیوں کو ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

[illegible] جماعت اسلامی کے لوگ اگر اس بے بنیاد نظریہ میں گم نہ ہوتے تو وہ اپنی کوششوں کو سیاست کی چٹان پر ضائع نہ کرتے بلکہ اس کو افراد کی اصلاح میں لگاتے۔ اور پھر وہ مقصد اب تک حل ہو چکا ہوتا جو غلط مقام پر محنت کرنے کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے انتہائی بے بنیاد طور پر یہ نظریہ بنایا کہ سماج کی یا سماجی شعبوں کی اصلاح حکومت کی طاقت سے ہوتی ہے، اس لئے حکومت کی طاقت پر قبضہ کرو۔ جماعت اسلامی کے افراد اسی بے بنیاد نظریہ سے متاثر ہو کر پچھلے پچاس برس سے حکومت پر قبضہ کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔

دلیل کے اعتبار سے یہ نظریہ پہلے ہی رد کیا جا چکا تھا۔ مگر تجربہ کے اعتبار سے وہ جنرل ضیاء الحق کے زمانۂ حکومت (۱۹۸۸ - ۱۹۷۷) میں رد ہو گیا۔ اب اگر جماعت کے لوگ اپنی کوششوں کو مفید بنانا چاہتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ وہ اپنے سابقہ سیاسی نظریہ کی غلطی کا اعلان کریں۔ اور اس کے بعد موجودہ تخریبی طریقوں کو چھوڑ کر خالص اصلاحی انداز میں افراد کی ذہنی تعمیر میں لگ جائیں۔ یہ اگرچہ ایک دیر طلب کام ہے، اور اس میں عوامی لیڈری بھی نہیں ملتی۔ تاہم کسی معاشرہ میں کوئی حقیقی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں۔

حکومت کی طاقت سے سماجی برائیوں کو دور کرنا، بظاہر ایک خوب صورت نظریہ ہے۔ مگر وہ عملاً ناممکن ہے۔ اگر آپ انسان کو بدلے بغیر حکومتی سطح پر برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ برائی ایک نئی صورت میں قائم ہو جائے گی، وہ لوگوں کی زندگیوں سے ختم نہیں ہو سکتی۔

برائی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں پہلا کام افراد کے اندر برائیوں کو چھوڑنے کی آمادگی پیدا کرنا ہے۔ اس آمادگی کو پیدا کرنے سے پہلے "انسداد منکرات" کے نام پر حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے سے منکرات کا انسداد تو نہیں ہوگا البتہ پورا سماج تخریبی سماج بن جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام کی بھیڑ کو جمع کر کے چوراہہ پر ٹی وی سٹ کے اوپر پتھر مارنا صرف جھوٹی لیڈری ہے۔ سچا لیڈر وہ ہے جو عوام کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے گھروں میں جا کر اپنا اپنا ٹی وی سٹ توڑ ڈالیں۔ اور ایسا لیڈر سارے عالم اسلام میں کوئی ایک بھی نہیں۔ ■

تربیتی ضمیمہ

ہندستان میں مالی بدعنوانی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے۔ چنانچہ ملک کے سیاسی ذمہ دار، مذہبی پیشوا اور دانشور طبقہ مسلسل اس کے خلاف لکھتا اور بولتا رہتا ہے۔ مگر یہاں کی مالی بدعنوانیوں میں ایک فی صد بھی کمی نہ ہو سکی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ نرادچودھری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس کی وجہ ہندو قوم کی دولت پرستی ہے۔ ہندو عقیدہ کے مطابق، دولت ایک معبود ہے اور لکشمی دیوی کی صورت میں ہر ہندو اس کی پرستش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ محض دولت کے خلاف اپدیش دینے سے دولت پرستی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ ذہن بدلنے کا معاملہ ہے نہ کہ محض اخلاقی نصیحت کرنے کا۔

عجیب بات ہے کہ یہی خرابی موجودہ زمانہ کے اسلام پسندوں میں ایک اور شکل میں پائی جا رہی ہے۔ اس کی ایک مثال جماعت اسلامی کا معاملہ ہے۔ جماعت اسلامی کے سنجیدہ حلقہ میں پچھلے پچاس برس سے یہ احساس پایا جاتا رہا ہے کہ جماعت کے افراد میں سیاسی ذوق تو خوب ابھرتا ہے مگر روحانی ذوق ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

جماعت کے ذمہ داروں نے اس مسئلہ کا حل "تربیت" میں تلاش کیا ہے۔ غالباً ۱۹۵۴ میں جماعت اسلامی کے مرکز (رامپور) کے تحت پہلا تربیتی کیمپ قائم کیا گیا۔ اس کے انچارج مولانا سید حامد علی تھے۔ اس کے تحت "بیچ" کی صورت میں کچھ افراد کو پندرہ پندرہ دن کے لئے بلایا جاتا تھا اور ان کو تربیتی کورس سے گزارا جاتا تھا۔ مگر چند ہی بیچ کے بعد محسوس ہوا کہ یہ بے فائدہ ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کو ختم کر دیا گیا۔

اب جماعت اسلامی کی نئی قیادت کے تحت اس کو دوبارہ اس طرح زندہ کیا گیا ہے کہ جماعت کے مرکز (دہلی) میں جماعت کے ایک بزرگ کو "نائب امیر برائے تربیت" مقرر کیا گیا ہے مگر میرے نزدیک یہ صرف سادہ لوحی ہے۔ یہ ماضی کی غلطی کو حال میں دہرانا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اور حقیقت نہیں (دعوت ۲۸ مئی ۱۹۹۰)

جماعت اسلامی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بانی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اسلام

کی تعبیر خالص سیاسی انداز میں کی۔ حتی کہ انھوں نے اذان اور نماز اور روزہ جیسے روحانی عمل کو بھی سیاسی عمل بنا کر دکھایا۔ جماعت اسلامی کے افراد کا ذہن اسی قسم کے سیاسی لٹریچر کو پڑھ کر بنا ہے۔ وہ اسلام کے پورے معاملہ کو سیاسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں عین فطری بات ہے کہ جماعت کے افراد میں سیاسی مزاج ہو، ان کے اندر روحانی مزاج نہ ہو۔ اگر آپ ببول کا بیج بوئیں تو اس سے آم کے پھل کی امید کرنا احمقانہ خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

تربیت بذات خود ایک اسلامی عمل ہے اور اس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے (ویزکیہم) مگر تربیت (یا تزکیہ) اس وقت مفید ہوتا ہے جب کہ وہ فکری یاددہانی کے لئے ہو۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ آدمی کو اس کا ایک بھولا ہوا سبق از سر نو یاد دلایا جائے۔

مگر جماعت اسلامی کے معاملہ میں اصل مسئلہ فکری یاددہانی کا نہیں بلکہ فکری تبدیلی کا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر نے جماعت کے افراد کے فکری ڈھانچہ کو سیاسی ڈھانچہ بنا دیا ہے جو روحانی ڈھانچہ کی عین ضد ہے۔ جب تک اس سیاسی ڈھانچہ کو توڑا نہ جائے، روحانی سبق کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے آدمی کے ذہن پر سیاست کا ڈاٹ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس ڈاٹ کو توڑنے کے بعد ہی ذہن کے اندر کوئی نئی چیز داخل ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔

اگر آپ کہیں کہ "دین سے مراد اسٹیٹ ہے" تو یہ نظریہ آدمی کے اندر صرف سیاسی انداز فکر پیدا کرے گا۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ "اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے صالح افراد درکار ہوتے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں تاکہ اچھی اسٹیٹ قائم کر سکیں" تو یہ سیاسی ہاتھی کے دم میں روحانیت کا پتنگ باندھنا ہوگا۔ اس قسم کے تربیتی پیوند کے ذریعہ کبھی کسی کے اندر روحانیت کا طوفان برپا نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس اگر آپ یہ کہیں کہ "دین یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے" تو یہ عقیدہ آدمی کے اندر روحانی ہلچل پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوں گے، وہ اپنے ابتدائی تاثر ہی کے اعتبار سے روحانی انسان بن جائیں گے۔ آدمی کی ذہنی تربیت ہمیشہ وہ فکر کرتا ہے جس نے اس کے ذہن کو بیدار کیا ہے۔ نہ کہ کسی قسم کا تربیتی ضمیمہ۔

جماعت اسلامی کے افراد کی تربیت حقیقۃً یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ یہ اعلان کیا جائے

کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کی جو سیاسی تعبیر کی وہ سراسر غلط تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کے افراد کو ہدایت کی جائے کہ وہ قرآن کو قرآن کے ذریعہ پڑھیں نہ کہ تفہیم القرآن کے ذریعہ۔ اس طرح کی انقلابی کوششوں سے تو یقیناً جماعت کے افراد کی تربیت ہو سکتی ہے۔ مگر موجودہ فکری حالت کو باقی رکھتے ہوئے "محکمۂ تربیت" قائم کرنے کا کسی بھی درجہ میں کوئی فائدہ نہیں۔ جماعت اسلامی کا سیاسی نظریہ محرک روحانیت کو ختم کر دیتا ہے۔ اور محرک روحانیت کو ختم کرنے کے بعد کسی تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ آدمی کے اندر روحانیت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

آدمی کا کردار آدمی کے فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی آدمی کے اندر جس ڈھنگ کی فکری اٹھان ہوگی اسی ڈھنگ کا کردار اس کے اندر پیدا ہوگا۔ سیاسی تحریکوں سے وابستہ افراد کی فکری اٹھان سیاسی انداز پر ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے اندر جو اخلاق و کردار پیدا ہوتا ہے وہ بھی سیاسی انداز کا ہوتا ہے۔ ایک گروہ جس کے افراد کی فکری اٹھان سیاسی نظریات پر ہوئی ہو، ان کے اندر کسی تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ غیر سیاسی کردار لایا نہیں جا سکتا۔

جماعت اسلامی سے وابستہ افراد کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کی فکری اٹھان اسلام کی سیاسی تعبیر پر ہوئی ہے۔ وہ جماعت اسلامی کی طرف اسی لئے راغب ہوئے کہ وہ اسلام کو سیاسی نظام کے روپ میں پیش کر رہی تھی۔ اس تحریکی عمل کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اندر سیاسی مزاج اور سیاسی کردار ابھرے، جیسا کہ واقعۃً ہوا۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کسی قسم کے تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ ان لوگوں کے اندر روحانی یا غیر سیاسی کردار پیدا کیا جائے۔ جماعت اسلامی کے افراد کے موجودہ فکری ڈھانچہ کو باقی رکھتے ہوئے "تربیتی ضمیمہ" کے ذریعہ ان کے اندر روحانیت لانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ببول کا درخت بوئے اور جب وہ بڑا ہو کر ببول کا پھل دینے لگے تو وہ چاہے کہ اس کی شاخوں میں آم کا پھل لٹکا کر اس کو آم کا درخت بنا دیا جائے۔

ایک تقابل

لارڈ میکالے (T.B. Macaulay) ۱۸۳۴ میں ہندستان آیا۔ سپریم کونسل آف انڈیا کے ایک اہم ممبر کی حیثیت سے اس نے وہ تعلیمی نظام شروع کیا جو بالآخر "انگریزی نظام تعلیم" کے نام سے پورے ملک میں رائج ہوگیا۔ اس نظام تعلیم کا مقصد، میکالے کے الفاظ میں یہ تھا کہ: اس کے ذریعہ سے ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی مگر خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو:

So that a generation may arise which will be Indian in birth and English in thought.

مسلمانوں کے تمام بے ریش اور باریش لیڈر (سرسید کے واحد استثنار کو چھوڑ کر) اس نظام تعلیم کے خلاف ہوگیے۔ وہ اس کی مخالفت میں تقریر کرنے لگے۔ کسی نے اس کو "قتل گاہ" کہا۔ کسی نے اس کے اوپر یہ شعر چسپاں کیا:

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بیشتر لوگوں نے اس تعلیمی نظام میں شرکت نہیں کی۔ جو لوگ اس میں داخل ہوگیے تھے وہ درمیان ہی میں اس کو چھوڑ کر اس سے الگ ہوگیے۔ اس مخالفانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے کم از کم دو سو سال پیچھے ہوگیے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی یہی پسماندگی ہے۔ کیوں کہ تعلیم سے محرومی آدمی کو بے شعور بناتی ہے۔ اور جو لوگ بے شعور ہوں، اس دنیا میں ان کے لیے بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

اب ایک اور تصویر دیکھیے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں جاپان کو امریکہ کے مقابلہ میں شکست ہوگئی۔ اس کے بعد امریکہ سیاسی، فوجی، انتظامی، ہر اعتبار سے جاپان پر قابض ہوگیا۔ اس شکست کے بعد جاپان نے اپنے آپ کو مکمل طور پر امریکہ کی ماتحتی میں پایا۔ امریکہ نے اس کے بعد جبری طور پر جاپان کو غیر مسلح کردیا۔ جاپان کے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں۔ دسمبر ۱۹۴۵ میں امریکی جنرل میکارتھر نے تعلیمی انتظام کے متعلق وہ بنیادی ہدایات

اری کیں جن کا خاص مقصد جاپان میں عسکریت کو اور جاپانی عوام کے قوم پرستانہ مزاج کو تم کرنا تھا۔

جنگ کے زمانہ کے بہت سے ٹیچر ملازمت سے سبک دوش کر دیئے گیے۔ مذہب اور یاست کو مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ شنٹو تعلیمات کو نصاب سے خارج قرار دیا یا۔ ان تبدیلیوں کا مقصد یہ تھا کہ جاپان کی جدید نسل کو امریکہ کی پسند کے مطابق بنایا جائے۔ ۱۹۴۶ ں امریکہ کے تعلیمی ماہرین کی ایک ٹیم باقاعدہ منصوبہ کے تحت جاپان پہونچی۔ اس امریکی ٹیم نے ک رپورٹ تیار کی جس کا نام حسب ذیل تھا:

Report of the United States Education Mission to Japan

یہ رپورٹ گویا ان ہدایات کی عملی تفصیل تھی جن کو جنرل میکارتھر نے جاپان کی وزارت تعلیم کے نام جاپان کے مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۷ میں جاپان کا بنیادی تعلیمی انون اور اسکولی تعلیم کا قانون اسی کی مطابقت میں وضع کیا گیا۔ ۱۹۴۸ میں جاپان کا تعلیمی بورڈ یا گیا جس کا کام گویا اس بات کی نگرانی کرنا تھا کہ جاپان کا تعلیمی نظام امریکہ کی پسند کے مطابق اری رہے۔ اس طرح جاپان میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطحوں پر جو تعلیمی نظام ائج ہوا وہ مکمل طور پر اس نظام کی نقل تھی جو امریکہ میں پہلے سے چل رہا تھا۔ (EB-6/392)

جاپانیوں نے، ہندستان کے مسلم رہنماؤں کے برعکس، امریکہ کے اس منصوبہ کو "تعلیمی نعار" بتا کر اس کے خلاف احتجاج اور بائیکاٹ کی تحریک نہیں چلائی۔ انھوں نے ایک دن ائع کیے بغیر اپنی پوری نسل کو اس "امریکی تعلیمی نظام" میں داخل کر دیا۔

اب اس واقعہ پر تقریباً نصف صدی پوری ہو رہی ہے۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ساری نیا کے سامنے ہے۔ امریکہ کے اس تعلیمی نظام میں پڑھ کر جو لوگ نکلے، وہ پورے معنوں میں پانی تھے۔ وہ کسی بھی اعتبار سے "امریکی" نہ بن سکے۔ جیسا کہ امریکہ انھیں بنانا چاہتا تھا۔ حتی کہ وں نے امریکہ کی تمام امیدوں کے خلاف، جاپان میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں ہ جاپان کی ایک نئی تاریخ پیدا کر دی۔ انھوں نے ترقی کا ایک ایسا سیلاب جاری کیا س کے بہاؤ میں خود امریکہ بھی ٹھہر نہ سکا۔ انھوں نے جاپان کو دنیا کی قوموں کے درمیان

اعلیٰ ترین صف میں کھڑا کر دیا۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہاں کامیابی اور ترقی اس کے لیے ہے جو ناموافق صورت حال کو موافق صورت حال میں تبدیل کر سکے۔ جو دشمن کے مخالفانہ منصوبوں کو اپنے لیے مفید خوراک بنا لے۔ جو اپنے "نہیں" کو اپنے "ہے" میں تبدیل کرنے کی اہلیت کا ثبوت دے۔ جو لوگ اس برتر صلاحیت کے حامل ہوں وہی مقابلہ کی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس امتحان میں ناکام ہو جائیں۔ ان کے لیے اس کے سوا اور کچھ مقدر نہیں کہ تاریخ کے کوڑا خانہ میں پڑے ہوئے دوسروں کے خلاف احتجاج کرتے رہیں، ایسا احتجاج جس کو سننے کے لیے کوئی دوسرا وہاں موجود بھی نہ ہو۔

اس معاملہ میں جس طرح ہمارے ملک کا سیکولر طبقہ ناکام ثابت ہوا ہے، اسی طرح اسلام پسند طبقہ بھی ناکام ثابت ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اکبر الٰہ آبادی اور ابو الاعلیٰ مودودی جیسے لوگوں نے انگریزی دور کی تعلیم گاہوں کو قتل گاہ بتایا اور ایک پوری نسل کو اس سے روکنے کی کوشش کی۔

یہ احمقانہ حد تک بے معنی بات تھی۔ اسلام پسند رہنماؤں کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلم نوجوانوں میں یہ شعور پیدا کریں کہ وہ انگریزی تعلیم گاہوں سے تعلیم کو لیں اور اس کی انگریزیت کو چھوڑ دیں۔ مگر اپنے سطحی فکر کی بنا پر انھوں نے منفی انداز اختیار کیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک پوری نسل تعلیمی اعتبار سے برباد ہو کر رہ گئی۔ اس معاملہ میں جاپان کے اہل کفر ہندستان کے اہل ایمان سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئے۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا کہ ڈکار میں دو ہزار مسجدیں ہیں۔ میں نے پوچھا
ہ کیا تمام مسجدیں آباد ہیں۔ انھوں نے پرمسرت لہجہ میں کہا: سنغاليون متدينون وهم
تمسون لدينهم الحنيف (سینیگال کے لوگ دین دار ہیں اور وہ اپنے دین میں پختہ ہیں)

ایک مرتبہ میں نے ڈکار کی ایک سڑک پر دیکھا کہ ایک فرانسیسی خاتون سڑک پر پیدل چل رہی
ہے اور اس کی گود میں کتے کا ایک بچہ ہے جس کو وہ عین اسی طرح لئے ہوئے ہے جس طرح کوئی ماں اپنے بچہ
و اپنے سینہ سے چمٹائے ہوئے رہتی ہے۔ مغرب کی عورت نے انسانی بچہ کو گود میں لینا فیشن کے
لاف سمجھا۔ مگر اس کے بعد جو ہوا وہ صرف یہ کہ اس نے کتے کے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ یہ
راصل فطرت کا تقاضا ہے جو عورت کو ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس نے انسانی بچہ کو چھوڑا تھا
ر اس کے بعد فطرت نے اس کو حیوانی بچہ سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔

روانگی سے پہلے دہلی میں میں نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ڈکار (Dakar) کا صفحہ
یکھا۔ اس میں ایک نہایت خوب صورت عمارت کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ یہ صدارتی
ل ہے جو سمندر کے کنارے بنا ہوا ہے۔ ۶ مئی کو شہر کے مختلف مقامات دیکھنے کے دوران مذکورہ
صدارتی محل" دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ جب میں اس عمارت کے سامنے کھڑا تھا تو مجھے یقین نہیں
رہا تھا کہ یہ وہی محل ہے جس کی تصویر میں نے دہلی میں کتاب میں دیکھی تھی۔ تصویر میں جو عمارت
ہایت عظیم نظر آئی تھی، وہ حقیقی طور پر دیکھنے میں مقابلۃً معمولی نظر آنے لگی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ حقیقت کے مقابلہ میں تصویر ہمیشہ زیادہ عظیم دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر لوگ
ں فرق کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ تصویر کو حقیقت سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر جب وہ اس کو پا لیتے ہیں
وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جو حقیقت انھوں نے پائی ہے وہ
ں سے بہت کم ہے جو "تصویر" کی صورت میں انھوں نے پہلے دیکھی تھی۔

ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ یہاں وہ بدعت نہیں ہے جو ہندستان اور پاکستان میں عام طور پر
ی جاتی ہے۔ یعنی مسلم ملکوں کی سیاسی رقابتوں کا اثر دینی حلقوں پر۔ وہاں ہر دینی حلقہ کسی ایک کا
میدہ خواں بن کر دوسرے کے اوپر "لوم وشتوم" کی لفظی بارش برسا رہا ہے۔ یہاں کے دینی لوگ
باست سے قطع نظر کرتے ہوئے، ہر مسلم ملک سے یکساں تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ڈکار

میں ایک اسلامی مرکز عراق کے تعاون سے بنا ہے، اگرچہ ابھی وہ ناتمام ہے۔ شیخ عبد العزیز بی
یہاں مجھے ایک مسجد دکھائی جو پہلے خستہ تھی، اب وہ شاندار طور پر بنی ہوئی کھڑی ہے۔ انھوں نے
بتایا کہ اس مسجد کی تعمیر نو کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں سعودی عرب گیا، وہاں مجھے کافی مدد ملی۔ اس سے
میں نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔ اسی طرح ایک اور اسلامی ادارہ ہے جو لیبیا کے تعاون سے بنایا گیا
ہے۔ دینی حلقوں کے لئے یہی انداز زیادہ مناسب ہے۔

یہ ہوٹل دس منزلہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کی لفٹ میں ایک سے لے کر دس تک نمبر لگے ہوئے
ہیں۔ ہر آدمی اپنا مطلوبہ نمبر دبا کر اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک روز لفٹ میں جاتے ہوئے مجھ پر ایک تجربہ گزرا۔ میں لفٹ کے اندر داخل ہوا تو میرے
ساتھ تین آدمی اور بھی آگئے۔ کسی کو نویں منزل پر جانا تھا، کسی کو دسویں منزل پر۔ ان لوگوں نے سبقت
کرکے اپنا اپنا نمبر دبا دیا۔ بورڈ پر نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ کی گھنٹیاں روشن ہوگئیں۔ مجھے نمبر ۲ پر جانا تھا۔
نے بعد کو اپنا بٹن دبا دیا۔ بٹن دبانے کی ترتیب کے لحاظ سے بظاہر لفٹ کو پہلے نویں اور دسویں
پر جانا چاہئے تھا۔ مگر لفٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے پہلے مجھ کو دوسری منزل پر اتارا۔ اس کے
وہ نویں اور دسویں منزل کے مسافروں کو اتارنے کے لئے اوپر گئی۔

اونچی بلڈنگوں کے لئے یہ روزمرہ کا عام واقعہ ہے۔ لوگ اس کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس
غور کریں۔ مگر میرا ذہن فوراً ٹھٹک گیا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ لفٹ نے ایسا کیوں کیا کہ اس نے بٹن
دبانے کی بے ترتیبی کو بطور خود درست کیا اور صحیح ترتیب کے ساتھ مسافروں کو ان کی منزل پر پہنچایا۔
ذہن نے جواب دیا کہ اس کا سبب کمپیوٹر ہے۔ موجودہ زمانہ کی آٹومیٹک لفٹ کے ساتھ کمپیوٹر لگا
ہوتا ہے۔ وہ اپنے "مشینی دماغ" کے ذریعہ بے ترتیبی کو ترتیب میں بدلتا ہے۔ وہ لفٹ کو "
دیتا ہے کہ بے ترتیب طور پر بٹن دبائے جانے کے باوجود وہ اپنے مسافروں کو حقیقی ترتیب کے
ان کی منزل پر اتارے۔

اس دنیوی منظر کو دیکھ کر اچانک میرا ذہن آخرت کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہا کہ یہی وا
مخلوق کی سطح پر ابتدائی درجہ میں پیش آرہا ہے، یہی آئندہ خالق کی سطح پر کامل درجہ میں پیش
آئے گا۔

موجودہ دنیا میں بظاہر حقیقی ترتیب بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں اول درجہ کا آدمی پیچھے ہے
رتیسرے درجہ کا آدمی آگے۔ اہل شخص بے زبان بنا ہوا ہے اور نا اہل لوگ اخبار اور اسٹیج پر
مایاں ہو رہے ہیں۔ مستحق لوگ ناداری میں پڑے ہوئے ہیں اور غیر مستحق افراد ہر قسم کے وسائل پر
ابض ہیں۔ یہ گویا مصنوعی ترتیب ہے جو موجودہ دنیا میں قائم ہوگئی ہے۔ آخرت میں خدا اظاہر
کر اس ترتیب کو ختم کر دے گا۔ وہ نمبر ایک کو نمبر ایک پر کر دے گا اور بقیہ نمبر والوں کو ان کے حقیقی
بر کی طرف جانے پر مجبور کر دے گا۔

کھانے کے وقت ایک بار سینیگال کے ایک صاحب میری میز کی دوسری طرف تھے۔ انھوں
ے اپنے ملک کے بارہ میں بہت سی باتیں بتائیں۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں ایک درخت
یا جاتا ہے۔ اس کی پتی کو چائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک مشروب ہے بلکہ
ہ نہایت مفید ہے (اوراق تغلی وتشرب کالشای وھی مفیدۃ جدا)

مشہور ہے کہ ایک شخص نازک بیماری میں مبتلا تھا۔ علاج سے وہ اچھا نہیں ہوا۔ ایک روز
، گھبرا کر بستی کے باہر چلا گیا اور اس نے مذکورہ درخت کی بہت سی پتی کھالی۔ اگلے دن اسے اپنے
ن میں افاقہ محسوس ہوا۔ اس کے بعد وہ مزید کچھ دنوں تک اس کی پتی کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل
درست ہوگیا۔ یہ قصہ مشہور ہوا تو لوگ اس درخت کی پتی کو مختلف صورتوں میں استعمال کرنے لگے۔
ب اس کی مقبولیت کی بنا پر ایسے کارخانے بن گئے ہیں جہاں اس کی پتی کو پروسس کیا جاتا ہے اور
سے کو پیک کر کے چائے کی طرح سپلائی کیا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد میرے ساتھی نے کافی منگائی۔ مگر
، نے اس مقامی مشروب کا آڈر دیا۔ یہ کافی لطیف اور مفید تھا۔ میں جب تک یہاں رہا میں اس کو
ار ہا۔ اس کا نام کِن کلی با (Kinkelibah) ہے۔ اس کے پیکٹ پر حسب ذیل پتہ لکھا ہوا تھا:

Enterprise Senegalaise de. B.P. 10.101.
Ouagou Niayes. Dakar. Senegal. West Africa.

محمد مصطفیٰ سی (مفتش فی تعلیم اللغۃ العربیۃ) نے بتایا کہ سینیگال میں عیسائی اگرچہ بہت کم ہیں۔
نچ فیصد سے بھی کم۔ مگر یہاں چرچ بہت منظم ہے۔ یہاں کے بہترین اسکول اور اسپتال انھیں لوگوں نے
کر رکھے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی بہت کوششیں کرتے ہیں۔ مگر اس میں وہ کامیاب نہیں۔

دوسری طرف یہ کہ (ان کے غریب طبقہ کے لوگ) برابر مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں نے آج ہی ایک مسیحی کو مسلمان بنایا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق، یہ مسیحی کسی تبلیغ کے بغیر اپنے آپ مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔

ہوٹلوں میں طرح طرح کی چیزیں کھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ مگر میں صبح کو اکثر میں ہنی پاپ (honey pops) لیا کرتا تھا۔ ۷ مئی کی صبح کو ناشتہ کے لئے ہوٹل کے طعام خانہ میں گیا تو وہاں ہنی پاپ کا ڈبہ دکھائی نہیں دیا۔ وہاں جو ڈبے رکھے ہوئے تھے ان پر ہنی پاپ کے بجائے میل پاپ (miel pops) لکھا ہوا تھا۔ میرے تجسس کو دیکھ کر ہوٹل کا آدمی قریب آیا۔ اس نے کہا آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج یہاں ہنی پاپ کے ڈبے نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ میل پاپ وہی چیز ہے۔ میل (miel) فرانسیسی زبان میں شہد (honey) کو کہتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح اکثر آدمی لفظوں سے دھوکہ کھاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی "مذہب امن" کی تلاش میں ہے۔ اب آپ اس کے سامنے "اسلام" پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کو اپنے ذہنی تصور کے مطابق کوئی دوسری چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ حقیقت حال سے واقف ہو تو اس کو معلوم ہوگا کہ مذہبِ امن کے نام سے وہ جس چیز کی تلاش میں ہے وہ عین وہی چیز ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اپنا قومی لیبل لگا کر اس کی ظاہری صورت مشتبہ بنادی ہے۔

سینیگال کے ایک صاحب نے بتایا کہ اس ملک میں اسلام گیارہویں صدی عیسوی میں آیا ہے یعنی صحابہ کے دور کے بعد۔ یہاں کے مسلمان عام طور پر نہایت سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر فطری اوصاف زندہ ہیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ کوئی سینیگالی اپنے وطن سے باہر ملک کی کسی دوسری بستی میں جائے تو وہاں وہ کبھی ہوٹل میں نہیں ٹھہرتا۔ کیوں کہ مقامی لوگ اس کو اپنا مہمان بنانا پسند کرتے ہیں۔ ہوٹلوں میں زیادہ تر باہر کے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ ایک سینیگالی کھانا کھا رہا ہو تو اس وقت اس کو جو شخص بھی ملے وہ بے تکلف اس کو کھانے میں شریک کرے گا۔

میں نے اپنے کمرہ میں کھڑے ہو کر سمندر کی طرف دیکھا۔ حد نظر تک سمندر کا پانی موجیں مار رہا تھا اور اس سے ایک قدرتی موسیقی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ آج کا زمانہ معلومات کے اعتبار سے، قدیم زمانہ سے کتنا مختلف ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ زمین کا آدھا حصہ خشکی۔

ر آدھا حصہ پانی۔ یہ اس خیال کا اعادہ ہے جو قدیم یونان کے زمانہ سے ابن خلدون تک چلا آیا تھا۔ مگر آج اسکول کا ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ نصف نصف کا یہ نظریہ درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہماری زمین کی سطح کے ۷۱ فی صد حصہ پر سمندر کا پانی پھیلا ہوا ہے اور بقیہ ۲۹ فی صد حصہ خشکی ہے۔

اس معلوماتی فرق کی بنا پر کچھ ترقی پسند لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب انسان کو نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک لغو بات ہے۔ کیوں کہ مذہب کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں ہے کہ زمین پر خشکی اور تری کا تناسب ۵۰-۵۰ فیصد ہے یا ۷۱-۲۹ فی صد۔ اس قسم کی معلومات کی کوئی حد نہیں۔ انسان نے جتنا آج جانا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جس کو وہ ابھی تک جان نہ سکا۔ مثلاً بلیک ہول کا نظریہ بتاتا ہے کہ کائنات کا صرف تین فیصد انسان کے لئے قابل مشاہدہ ہے، بقیہ ۹۷ فیصد حصہ انسان کے لئے قابل مشاہدہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا انحصار اس قسم کی معلومات پر نہیں ہے۔ مذہب کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی خدا کی خالقیت اور مالکیت کو تسلیم کرکے اس کے آگے جھک جائے۔ اس اعتبار سے ہر دور کا مذہب صرف ایک ہے، اس میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

سینیگال کے عام لوگ مقامی بولی (اُلف) میں بات کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ یا فرنچ بولتے ہیں یا عربی زبان۔ یہ زبانوں کا فرق بھی بڑا عجیب ہے۔ مثلاً ہوٹل کے آدمی کو کلمہ ترحیب اگر اردو میں کہنا ہو تو وہ کہے گا کہ ہم نوووٹل میں آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ اس بات کو انگریزی اور فرنچ میں اس طرح کہا جائے گا:

We welcome you in Novotel. (English)
Nous vous souhaitons la bienvenve Novotel (French)

ایک مرتبہ میں سوچنے لگا کہ اگر ساری دنیا کی زبان ایک ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ کئی زبان ہونا ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ اس سے مسابقت کی تحریک ہوتی ہے اور ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب کسی آدمی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرتا ہے تو وہ صرف ایک معاملہ میں محدود نہیں رہتا۔ وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی اپنے آپ اپنا اثر ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً

ابتدائی دور کے مسلمانوں میں اولاً کتابت قرآن اور تدوین حدیث کے لئے علم کا جذبہ ابھرا۔ مگر جب علم کا جذبہ ابھر آیا تو پھر اس نے دوسرے تمام علوم میں بھی مسلمانوں کو آگے بڑھا دیا۔

انیسویں صدی کے کچھ مغربی مفکرین نے ایک معاشی یوٹوپیا بنانا چاہا جہاں ہر ایک کو برابر برابر رزق مل رہا ہو۔ یہ فرضی سوسائٹی موجودہ دنیا میں محال ہے کیونکہ وہ تخلیق کے نظام سے ٹکراتی ہے۔ تاہم اگر بالفرض ایسا سماج بن جائے تو تمام ترقیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں گی۔ کیونکہ ترقی کا جذبہ ہمیشہ "فرق" کو دیکھ کر ابھرتا ہے اور جب فرق ہی باقی نہ رہے تو ترقی کا جذبہ کیوں کر پیدا ہوگا۔

ایک بار ہوٹل کے لاونج میں کچھ افریقی مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہوٹل کے باہر نکلا تو جھاڑی میں ایک بلی تھی۔ اس نے "میاؤں میاؤں" کی آواز نکالی۔ اچانک خیال آیا کہ جانور تمام دنیا میں ایک ہی انداز پر بولتے ہیں۔ کوئی جانور جس طرح ہندستان میں بولتا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ یورپ اور افریقہ میں بھی بولتا ہے۔ مگر انسان کی بولیاں الگ الگ ہیں۔ حتی کہ دنیا بھر میں ان کی کئی ہزار بولیاں ہو گئی ہیں۔

پھر خیال آیا کہ یہ انسان کے حالتِ امتحان میں ہونے کا ایک پہلو ہے۔ جانوروں کا کوئی امتحان نہیں۔ اس بنا پر ان کی ہر نوع کے لئے ایک ہی بولی مقرر کر دی گئی۔ مگر انسان اس امتحانی میزان پر کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ خود اپنے ارادے سے متحد ہو۔ وہ اختلاف کے باوجود اتحاد کا ثبوت دے۔ جانوروں سے امتحان مطلوب نہ تھا، اس لئے انھیں ازاول تا آخر حالتِ اتحاد میں رکھا گیا۔ اس کے برعکس انسان سے امتحان مطلوب تھا۔ اس لئے انھیں حالت اختلاف میں ڈال دیا گیا۔ اور پھر کہا گیا کہ تم اپنے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کا ثبوت دو۔

الشیخ عبد العزیز سی (عمر ۶۳ سال) یہاں کی ممتاز دینی شخصیت ہیں۔ ان کی مادری زبان اگرچہ وُلف ہے۔ مگر وہ روانی کے ساتھ عربی بولتے ہیں۔ انھوں نے "تجول" کی پیش کش کی۔ چنانچہ ان کے ساتھ شہر گھومنے کے لئے نکلا۔

ڈکار کی سڑکیں نہایت عمدہ ہیں۔ ان کے دونوں طرف عمارتیں زیادہ تر فرانسیسی طرز کی نظر آتی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سڑکیں غالباً فرانسیسیوں نے اپنے دور اقتدار میں بنائی تھیں۔ انھوں نے

فوراً کہا: نعم ولکن بعد الاستقلال قمنا بالتجدید (ہاں، مگر آزادی کے بعد ہم نے اس کی تجدید کی ہے)

چلتے ہوئے ہم ڈکار کی سب سے بڑی مسجد جامع میں پہنچے۔ مگر وہ مکمل طور پر بند تھی۔ دروازہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں عام مسجدوں میں پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے اور وہ کھلی رہتی ہے۔ مگر "جوامع" صرف نماز جمعہ کے لئے ہوتی ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ بند کر دی جاتی ہیں اور پھر اگلے جمعہ کو کھلتی ہیں (یغلق بعد صلاۃ الجمعۃ الی جمعۃ الآخر) اسی طرح ایک اور بڑی مسجد پر پہنچے تو وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی جامع مسجد ہے اور وہ ہفتہ میں ایک بار صرف جمعہ کی نماز کے لئے کھولی جاتی ہے۔ یہ بات پہلی بار صرف یہاں دیکھی۔

کئی عام مسجدیں دیکھیں۔ ایک کا نام مسجد السید الحاج مالک سی تھا۔ یہ مسجد پہلی عالمی جنگ سے پہلے ۱۹۰۹ میں بنائی گئی تھی۔ پوری مسجد ایک بڑے ہال کی مانند تھی۔ سامنے خوبصورت انداز میں امام کے لئے کھڑے ہونے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ مسجد کا یہ انداز مجھے بہت پسند ہے۔

ایک بڑی دینی درس گاہ دیکھی۔ اس کا نام المعہد الاسلامی (دکار) تھا۔ اس وقت وہاں تعطیل تھی۔ تاہم عمارت کھلی ہوئی تھی۔ اس لئے اندر تک پورا حصہ دیکھا۔ اس کا طرز تعمیر بالکل مسلم اسپین کے انداز کا ہے۔

راستہ میں ایک مقام پر بہت بڑی عمارت نظر پڑی جو نامکمل تھی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ مرکز عراق کے تعاون سے بن رہا تھا اور خود صدر صدام حسین نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ مگر اس کے بعد ایران عراق جنگ چھڑ گئی۔ اس بنا پر اس کی عمارت مکمل نہ ہو سکی۔ یہ مرکز میری نظر میں اس اصول کی ایک مثال تھا کہ: ایک کام کرنے کے لئے آدمی کو دوسرا کام چھوڑنا پڑتا ہے۔ آدمی کے وسائل ہمیشہ محدود ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ تعمیر اور تخریب دونوں کام ساتھ ساتھ کر سکے۔ ایران اور عراق دونوں اس اصول کے زندہ نمونے ہیں۔

الشیخ عبد العزیز سی ڈکار شہر دکھاتے ہوئے آخر میں مجھ کو سمندر کے کنارے کی سڑک سے واپس لائے۔ ایک طرف سمندر کی موجیں تھیں۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے دور تک سفیروں کے خوبصورت مکانات تھے۔ چکنی سڑک پر آٹومیٹک کار نہایت ہموار انداز سے چلی جا رہی تھی۔ مگر اتنی دیر میں میرے

سر میں درد شروع ہو چکا تھا۔ میرا یہ حال نہایت عجیب ہے۔ میرے وجود میں غم اتنا سرایت کئے ہوئے ہے کہ میں کسی بھی چیز سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔ اپنی کمزوریوں اور نااہلیوں کے بارہ میں سوچتا ہوں تو اکثر میری زبان پر فارسی کا یہ مصرعہ آجاتا ہے:

درحیرتم کہ دہقاں بہ چہ کار کشت مارا

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ افغانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب یورپ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل اکثر تعلیم یافتہ افغانی بیرونی ملکوں میں چلے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ افغانستان کا اصل مسئلہ روسیوں کا افغانستان میں آنا نہیں ہے، بلکہ تعلیم یافتہ افغانیوں کا افغانستان سے چلا جانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روسی جارحیت کی بنا پر ایسا ہوا۔ میں نے کہا کہ ایسا کہنا درست نہیں۔ کیوں کہ اسی قسم کا واقعہ پاکستان میں بھی ہوا ہے، جب کہ پاکستان میں کوئی بیرونی جارحیت نہیں ہوئی۔ پاکستان مسلم ہوم لینڈ کے طور پر بنا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو وہاں کے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بیرونی ملکوں میں چلے گئے۔

میں نے کہا کہ اس ترک وطن کی اصل وجہ سیاسی نہیں بلکہ اقتصادی ہے۔ افغانستان یا پاکستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس لئے باہر کے ملکوں میں چلے گئے کہ ان کے لئے اپنے ملک کے مقابلہ میں غیر ملک میں اقتصادی مواقع زیادہ تھے۔ ہمارے تمام رہنما سو برس سے بھی زیادہ عرصہ سے سیاسی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ اقتصادی ترقی کے لئے جدوجہد کرتے۔ کیوں کہ اقتصادی ترقی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔

جنوبی افریقہ کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ایک پادری سے میری بحث ہوئی۔ پادری نے ایسا سوال کیا جس کا میں جواب نہ دے سکا۔ پادری نے مجھ سے پوچھا کہ آپ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر غلطی نہیں کرتا۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ آپ آدم کو پیغمبر مانتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ خود آپ کے قرآن کے بیان کے مطابق، آدم نے جنت میں ممنوعہ پھل کھایا اور غلطی۔ میں کنفیوزن میں پڑ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ جواب نہیں آیا۔

میں نے کہا کہ ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبر غلطی نہیں کرتا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر غلطی پر قائم نہیں رہتا۔ اگر آپ پادری کے سوال پر پہلے ہی اس کی وضاحت کر دیتے تو اس کا اعتراض اپنے

آپ ختم ہو جاتا۔

ڈکتور اسماعیل عبد الحلیم (عمر ۵۰ سال) لندن میں رہتے ہیں۔ لندن کے مسلمانوں کے حالات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہاں مسلمانوں میں سب سے زیادہ برصغیر ہند کے لوگ رہتے ہیں۔ ساؤتھ ہال میں ہندستانی ، بریڈ فورڈ میں پاکستانی اور ایسٹ اینڈ میں بنگلہ دیشی۔ یہ لوگ یہاں اپنے انھیں رواجوں اور انھیں عادتوں کے ساتھ رہتے ہیں جو وہ اپنے ملک سے لے آئے ہیں۔

میں نے کہا کہ پھر انگریز انھیں ناپسند نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزوں میں ٹالرنس غیر معمولی حد تک پایا جاتا ہے۔ عرب ان کے اس مزاج کو البرودۃ الانجلیزیہ کہتے ہیں۔ انگریز کبھی آپ سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ آپ کو پسند نہیں کرتا۔ یا یہ کہ تم اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ ، خواہ وہ آپ کے اوپر کتنا ہی زیادہ غصہ کیوں نہ ہو (لا یقول الانجلیزی انہ لا یحبك او علیك ان ترجع الی بلدك مہما کان ہو غاضباً علیك)

یہی تحمل قوموں کی ترقی کا راز ہے۔ جو قوم تحمل اور برداشت کی صفت کھو دے، وہ موجودہ دنیا میں کبھی اعلیٰ ترقی نہیں کر سکتی۔

طارق الکردی ایک عرب نوجوان ہیں۔ وہ ڈبلن (یورپ) میں رہتے ہیں۔ ان کے ایک واقف کار نے بتایا کہ وہ وہاں اسلامی مرکز کے طرز پر باقاعدہ دعوت کا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے دو چھپے ہوئے انگریزی پمفلٹ مجھے دئے۔ یہ میرے دو مضامین کے انگریزی ترجمے تھے۔ ان کو چھاپ کر وہ وہاں تقسیم کر رہے ہیں۔ ان کے عنوانات یہ ہیں :

1. What is Islam
2. Islam in the 21st Century

ایک اور صاحب جو بحرین سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے بحرین کا عربی مجلہ الہدایۃ (جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ ھ ، دسمبر ۱۹۸۹) دیا۔ یہ مجلہ بحرین کی وزارۃ العدل والشئون الاسلامیۃ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ شمارہ میں راقم الحروف کی کتاب "تجدید دین" کے عربی اڈیشن کا مفصل تعارف "تجدید علوم الدین" کے عنوان سے چھپا ہے۔ تبصرہ نگار دکتور کارم السید غنیم ہیں۔ آٹھ صفحہ کے مفصل تعارف کے بعد آخر میں لکھتے ہیں : ختاماً فاننا نری الکتاب الماثل ہــو

الأهمية بمكان عظيم ويتوجب على كل مسلم غيور ان يتعرف على ما جاء فيه (صفحہ ۱۷)

الرسالہ مشن کی جتنی مخالفت کی گئی، اتنی شاید موجودہ زمانہ میں کسی بھی تحریک کی مخالفت نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود یہ اللہ کا فضل ہے کہ یہ مشن ہندستان، پاکستان، عرب ممالک اور مغربی ممالک میں پھیل گیا۔ اور اب ان شاء اللہ کسی کی مخالفت اس فکری سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر اسماعیل عبد الحلیم ملیزیا (سلانگور) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ لندن میں ایک کالج سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں جولائی ۱۹۹۰ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ ہمارے یہاں حکومت میں امور مذہبی کا ایک شعبہ ہے۔ اس میں مجھے کام کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے مشورہ دیجئے کہ ملیزیا پہنچ کر میں کس طرح مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کام کروں۔

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ کا نظام رائج کیا جائے۔ میں نے کہا کہ آپ زکوٰۃ کے نفاذ سے اپنے کام کا آغاز نہ کریں۔ یہ طریقہ ضیاء الحق صاحب کے زمانہ میں پاکستان میں ناکام ہو چکا ہے۔ موجودہ صورت میں زکوٰۃ ایک مسلمان کو دہرا ٹیکس معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ کیسے اس پر راضی ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ میرے لئے نئی بات تھی۔ انھوں نے کہا کہ ملیزیا میں زکوٰۃ کی اداشدہ رقم کو ملکی ٹیکس میں محسوب کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں دہرا ٹیکس کی صورت نہیں پیدا ہوتی :

المسلم في ماليزيا عليه ان يدفع ضريبة الدخل السنوي وزكاة المال اذا كان غنيا۔ واذا دفع المسلم زكوٰة المال التي عليه فله الحق قانونيا أن يقول للحكومة عليك ان تحسب هٰذا المبلغ الذي دفعته باسم الزكاة، هو في حد ذاته جزء من ضريبة الدخل حقي۔

حسب پروگرام ۷ مئی کی شام کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ یہ افتتاح صدر مملکت عبدہ ضیوف نے کیا۔ یہ پروگرام یہاں کے سب سے بڑے ہال میں کیا گیا تھا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ کثیر تعداد میں لوگ ہال کے باہر موجود تھے۔ یہاں اکثر پروگراموں میں میں نے دیکھا کہ عوام ہزاروں کی تعداد میں اکٹھا ہیں۔ عام طور پر اس طرح کی کانفرنسوں میں محدود تعداد میں صرف علماء اور دانشور

شریک ہوتے ہیں۔ مگر یہاں عوامی شمولیت کا منظر نظر آیا۔

میں نے سنا تھا کہ صدر عبدہ ضیوف افریقہ کے سب سے زیادہ لمبے آدمی ہیں۔ میرے ذہن میں ان کی تصویر کچھ اس طرح تھی کہ وہ جب آئیں گے تو تمام شرکاء باعتبار قد چھوٹے نظر آنے لگیں گے۔ ان کا قد کچھ لمبا ضرور ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد کے بارہ میں جو شہرت ہے وہ "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے" کے اصول کے تحت عمل میں آئی ہے۔

افتتاح رسمی انداز کا تھا۔ تاہم اس کی ایک چیز نے مجھ کو بہت متاثر کیا۔ اس افتتاح میں قرآن کی تلاوت ایک افریقی بچہ نے کی۔ اس کی عمر گیارہ سال تھی اور اس کا نام علی حرازم تھا۔ بظاہر دیکھنے میں اس کا چہرہ اور اس کی شخصیت نہایت غیر جاذب تھی۔ مگر اس نے جب قرآن کی تلاوت کی تو وہ اتنی موثر تھی کہ آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ میں نے سوچا کہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کو کتنی بڑی طاقت حاصل ہے۔ قرآن کے ذریعہ ایک بے حقیقت آدمی اپنے کو باحقیقت بنا سکتا ہے۔

کانفرنس کے ایجنڈے میں دو چیزیں میری خاص دل چسپی کی تھیں:

الدعوة الاسلامية ومتغيرات العصر

المستجدات والتطورات فى العالم والعالم الاسلامى

اس موضوع پر لوگوں نے جو اظہار خیال کیا، اس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے ذہنوں پر زیادہ تر سیاسی تبدیلیوں یا سیاسی نوعیت کے واقعات کا اثر ہے۔ مثلاً یہ کہ روس اور امریکہ (سپر پاورس) نے آپس میں مفاہمت کر لی ہے۔ اس کے نتیجہ میں عالمی سیاست میں زبردست قسم کی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بہت سے ممالک جن کو امریکہ اپنی سرپرستی میں لئے ہوئے تھا، تاکہ ان کو روسی نفوذ سے بچا سکے، اب اس نے ان سے اپنی سرپرستی واپس لے لی ہے۔ کیوں کہ نئی پالیسی نے سرد جنگ یا گرم جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ اسی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ امریکہ جو اس سے پہلے مجاہدین کی زبردست مدد کر رہا تھا اب اس نے اپنی مدد روک دی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر نجیب حکومت کے خلاف افغانی مجاہدین کی مہم اچانک بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔

شرکاء کی طرف سے اس قسم کے بہت سے مسائل کا ذکر کیا گیا۔ میں نے کہا کہ بلاشبہہ نئے حالات نے کچھ نئے سیاسی مسائل مسلمانوں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ مگر اس کا اس سے بھی زیادہ بڑا پہلو یہ ہے کہ

ان تبدیلیوں نے جدید تاریخ میں پہلی بار اسلامی دعوت کے نئے مواقع کھول دئے ہیں۔

مثلاً سوویت روس میں اس سے پہلے مذہب پر مکمل پابندی لگی ہوئی تھی۔ وہاں کارل مارکس کا یہ کلمہ دہرایا جارہا تھا کہ "مذہب عوام کی افیون ہے"۔ مگر آج روس کے دانشور اعلان کر رہے ہیں کہ خود مارکسزم ایک مزید بدترقسم کی ذہنی افیون تھی جس کو مارکس نے ایجاد کیا۔ اور وہ اس قابل ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔ اس سے پہلے روس کے علاقہ میں قرآن کا کوئی نسخہ لے جانا قانوناً ممنوع تھا۔ آج خود ایروفلاٹ قرآن کے دس لاکھ نسخے جدہ سے ماسکو پہنچا رہی ہے۔ وغیرہ

میں نے کہا کہ ایسی حالت میں ہم کو چاہئے کہ مشکلات ومسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے نئے دعوتی مواقع کو استعمال (avail) کریں۔

شیخ محمود احمد کفتارو (دمشق) نے اپنی تقریر میں ایک مسیحی مبلغ کا قول نقل کیا۔ اس نے کہا کہ مسلم دنیا کے بعض علاقوں میں ہماری تبلیغی کوششیں کسی حد تک کامیاب ہوئی ہیں جہاں کہ اسلام کا دائرہ اثر گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ اسلام اچانک خود ہمارے اپنے گھر کے اندر پھیلنے لگا (نجحنا نسبياً بالتبشير في بعض نواحي العالم الاسلامي حيث بدء الاسلام ينحسر ولكننا فوجئنا بالاسلام في عقر دارنا ينتشر)

اسلام اور دوسرے مذہبوں کا فرق یہ ہے کہ دوسرے مذاہب نے تبدیلی اور تحریف کی بنا پر اپنی اصل حیثیت کھودی ہے۔ مگر اسلام اپنی فطری صورت پر قائم ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرف جب انسان کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو انسان اپنی فطری طلب اور موجودہ مذہب میں مطابقت نہیں پاتا۔ اس کے برعکس انسان جب اسلام سے متعارف ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اسلام میں اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ وہ فوراً اسلام کو اپنا لیتا ہے۔

بعض لوگ اپنے ذاتی مذہب پر چلتے ہیں اور اس کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں یہاں بھی سامنے آئیں۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ عوام کو متحرک کیا جائے:

Taqwa is to mobilize the people

میں نے اس کی مزید تشریح پوچھی تو اس کے جواب میں انھوں نے جو تقریر کی اس کے الفاظ سب کے سب

میرے لئے معلوم الفاظ تھے، مگر میں کچھ بھی سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

تفسیر اسلام اور تعبیر دین کا یہ طریقہ مشہور مسلم رہنماؤں کے یہاں بھی مکمل طور پر موجود ہے۔ مثلاً سفر سے پہلے میں نے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" پڑھی۔ یہ کتاب اردو میں تھی۔ مگر پوری کتاب میرے لئے ناقابل فہم تھی۔ کیوں کہ اس کتاب میں خطابت اور انشا پردازی تو ضرور تھی، مگر دلیل کی نوعیت کی کوئی چیز اس میں میں نے نہیں پائی۔ اس کتاب میں جن آیتوں یا حدیثوں سے مصنف نے اپنا انقلابی نقطۂ نظر نکالا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ویسا ہی تھا جیسا مذکورہ انگریزی قول میں نظر آتا ہے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا تو معلوم ہوا کہ وہ احمد خلیفہ نیاس ہیں۔ وہ المعہد الاسلامی الزراعی کے پریسیڈنٹ (رئیس) تھے۔ ان کے کارڈ پر "جنرل ڈی گال اسٹریٹ" لکھا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ڈکار میں فرانس کے سابق حکمراں جنرل ڈی گال کے نام سے سڑک موجود ہے۔

جنرل ڈی گال کے نام سے گالزم (Gaullism) کی اصطلاح بنی ہے۔ ڈیگال کے زمانہ میں سینیگال اور دوسرے کئی افریقی ملکوں میں فرانس کی حکومت تھی۔ تاہم آزادی کی تحریکوں نے ان مقبوضات کو فرانس کے لئے ایک بوجھ بنادیا تھا۔ ڈی گال نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان ملکوں کو یک طرفہ طور پر آزاد کر دیا۔ ڈیگال کے اس عمل نے فرانس کو نئی طاقت دے دی۔ تاہم فرانس کو زندہ کرنے کا یہ کام صرف اس قیمت پر ہوا کہ اس کے بعد ڈی گال کی سیاسی موت ہو گئی۔

اکثر حالات میں قوموں کے مسائل کا حل اسی حقیقت پسندانہ تدبیر میں ہوتا ہے۔ مگر قوموں کے رہنما افراد اپنی موت پر راضی نہیں ہوتے، اس لئے وہ قوموں کو زندگی دینے میں بھی کامیاب نہیں ہوتے۔

۶ مئی ۱۹۹۰ کی سہ پہر کو افریقی بچوں کا پروگرام تھا۔ یہ بے حد موثر پروگرام تھا۔ مگر وہ چوں کہ عملی نوعیت کا تھا اس لئے اس کو لفظوں میں پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں ایک تنظیم دائرۃ المسترشدین والمسترشدات کے نام سے قائم ہے۔ سارے ملک میں اس کے مدارس موجود ہیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہے۔ یہ طلبہ اور طالبات ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ انھوں نے کئی بڑے اثر انگیز پروگرام کئے۔

اس پروگرام کا انتظام ڈکار کے بڑے اسٹیڈیم میں کیا گیا تھا۔ اسٹیڈیم کے ایک طرف مہمان حضرات اونچی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں کھلا ہوا میدان تھا۔ میدان کے دوسری طرف ہمارے سامنے دوبارہ اونچی نیچی نشستوں پر ہزاروں کی تعداد میں افریقی لڑکے اور لڑکیوں کی قطاریں تھیں۔ سفید لباس یہاں کا قومی لباس ہے۔ چنانچہ سب کے سب مکمل طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ سفید کپڑوں میں لپیٹے ہوئے ان کے کالے چہرے اس طرح دکھائی دیتے تھے گویا یہ کوئی دوسری مخلوق ہے جو آسمان سے زمین پر اتر آئی ہے۔

ایک شخص سیٹی لئے ہوئے میدان کے درمیان کھڑا ہوا۔ اس کی سیٹی پر کنارہ کے گیٹ سے لڑکے اور لڑکیاں منظم ٹولیوں کی صورت میں سفید کپڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے سامنے سے گزرنے لگے۔ باری باری ایک ایک ٹولی آرہی تھی اور مخصوص انداز میں مارچ کرتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف جارہی تھی۔ ایک آدمی ماہرانہ انداز میں سیٹی بجا کر اور ہاتھ سے اشارہ کرکے ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس طرح تقریباً ۲۰ مدرسوں کے طلبہ وطالبات گزرے۔

یہ منظر بڑا اثر انگیز تھا۔ وہ میرے لئے قیامت کے اس واقعہ کی تمثیل بن گیا جس میں کہا گیا ہے کہ وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا (الزمر) ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اہل جنت کے قافلے ایک کے بعد ایک آرہے ہیں۔ اور خدا کا نمائندہ بلندی پر کھڑا ہوا ان کو جنت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

سینیگال (اور مغربی افریقہ کے دوسرے ملکوں) میں بعض رواج بڑے عجیب ہیں جو قدیم قبائلی دور سے چلے آرہے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ اگر آپ کسی افریقی عورت کو دیکھیں کہ اس کے سینہ کے اوپر کا حصہ کھلا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ابھی غیر شادی شدہ ہے اور اگر سینہ کے اوپر کا حصہ ڈھکا ہوا ہے تو وہ شادی شدہ ہوگی (اذا وجدتَ او رأيتَ فتاةً عاريةً من فوق صدرها فهذه دلالةٌ على أنّها لاتزال بكراً والعكس هو الصحيح)

اس جملہ میں والعکس ھو الصحیح انگریزی اسلوب (and vice versa) کا ترجمہ ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی اسالیب اس طرح کثرت سے جدید عربی میں رائج ہوگئے ہیں۔

ایک صاحب سے ملنے کے لئے میں ان کے ہوٹل کے کمرہ میں داخل ہوا۔ ٹیلی ویژن کھلا ہوا تھا

اور وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج ساری دنیا میں کروڑوں انسان روزانہ ٹیلی ویژن پر واقعات کی تصویریں دیکھتے ہیں اور اس کو دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ مگر شاید ہی زمین پر کوئی انسان ہو جو ٹیلی ویژن دیکھے تو اس کو ٹیلی ویژن کے پردہ پر خود اپنا ظلم دکھائی دینے لگے۔ وہ یہ سوچ کر تڑپ اٹھے کہ قیامت میں اگر خدائی ٹیلی ویژن پر میری زندگی کا ریکارڈ اسی طرح عیاں کر دیا گیا تو میرا انجام کیا ہوگا۔

ایک صاحب سے میں نے یہ بات کہی تو انھوں نے ایسا جواب دیا جس نے میری زبان کو بند کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ان سب اندیشوں میں نہیں رہتے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا راستہ سیدھا جنت کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اصحاب رسول کو جو ایمان ملا تھا وہ تو ان کو رجاء اور خوف کے درمیان رکھتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ایسا اسلام دریافت کر رکھا ہے جس میں "خوف" حذف ہو گیا ہے۔ اب ان کے لئے ایمان صرف رجاء ہی رجاء ہے۔ اس میں خوف اور اندیشہ کا گزر نہیں۔

۸ مئی کی سہ پہر کو کانفرنس کے تمام شرکاء قافلہ کی صورت میں دکار کے باہر اس مقام پر لے جائے گئے جہاں المؤتمر الاسلامی کا مرکز زیر تعمیر ہے۔ یہ عظیم مرکز سعودی عرب، کویت، لیبیا، عرب امارات، اور دوسرے عرب ممالک کے مشترک مالی تعاون سے تعمیر کیا جا رہا ہے۔

دیو پیکر مشینیں، اونچی دیواریں، بلند و بالا ستونوں کے درمیان آدمی اپنے قد کو چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ لوگ متحیر نگاہوں سے اس عمارتی پہاڑ کو دیکھ رہے تھے جو ان کی آنکھوں کے سامنے وسیع میدان میں ابھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ مادی حقیقتوں کی اس ظاہری عظمت کے سامنے کون ہوگا جو معنوی حقیقتوں کی مخفی عظمت کو محسوس کرے اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے آگے جھکا دے۔ یہی شاید خدا کے قانون التباس (الانعام ۹) کا ایک پہلو ہے کہ اگرچہ اللہ کے نزدیک ساری عظمت اور ساری اہمیت صرف معنوی حقیقتوں کو حاصل ہے، مادی حقیقتیں اللہ کے نزدیک جناح بعوضہ (مچھر کے پھا) کے برابر بھی وزن نہیں رکھتیں۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں معاملہ کو عملاً بالکل الٹ دیا گیا ہے۔

کیسا عجیب ہے یہ امتحان، اور کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ جو اس امتحان میں پورے اتریں۔ یہی لوگ خدا کے قریب جگہ پائیں گے۔

۹ مئی ۱۹۹۰ کی شام کو "قصر الرئیس" میں جمہوریہ سینیگال کے صدر عبدہ ضیوف کے ساتھ اجتماعی ملاقات ہوئی۔ اس عمارت کی تصویر اس سے پہلے میں نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں دیکھی تھی۔ اس لئے جب میں وہاں پہنچا تو مجھے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ باہر سے وہ مجھے دیکھی ہوئی عمارت کی طرح نظر آئی۔ فرانسیسیوں کی بنائی ہوئی یہ عمارت انتہائی سادگی کے باوجود انتہائی پرشوکت ہے۔

جب میں اس "قصر" میں داخل ہوا اور اس کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا اس مخصوص ہال میں پہنچا جہاں صدر کے ساتھ ملاقات مقرر تھی تو میرا پہلا تاثر یہ تھا: اقتدار کی شان وشوکت اتنی زیادہ ہے کہ مشکل ہی سے کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اس کو دیکھے، اس کے باوجود اس کا طالب نہ بنے۔

صدر سے ملاقات کے بعد کلچرل منسٹر کی رہائش گاہ پر ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہاں پہنچے تو گانے کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ صدر کی رہائش گاہ میں مکمل سکون تھا۔ مگر کلچرل منسٹر کی رہائش گاہ میں شاید عبدہ کی رعایت سے صوتی آرٹ کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ یہاں ہم نے مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔

یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں پاکستان اور ایران کے سفیر بھی تھے۔ میرا ارادہ ہندستان کے سفیر سے ملاقات کرنے کا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندستان کا سفارت خانہ اس وقت بغیر سفیر ہے۔ سکنڈ سکریٹری ضروری فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شام کا کھانا ایک لبنانی تاجر کے یہاں تھا۔ وہ لبنانی عرب ہیں اور ان کا نام فواد شقیری ہے۔ وہ یہاں امپورٹ اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کا عالی شان مکان بتا رہا تھا کہ وہ اپنی تجارت میں نہایت کامیاب ہیں۔ آج کے کھانے پر پریسیڈنٹ مسٹر عبدہ ضیوف بھی مدعو تھے۔ مگر کسی وقتی سبب سے نہ آسکے۔ ان کی طرف سے ان کے ایک نمائندہ نے شرکت کی۔

۹ مئی کو تواون (Tivoouane) کا پروگرام تھا۔ یہاں سینیگال کے بہت بڑے شیخ عبد العزیز سی (الخلیفۃ العام للطائفۃ التیجانیۃ) رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف بہت ضعیف ہو چکے ہیں، بلکہ دونوں آنکھوں سے معذور بھی ہیں۔ ان کا معاملہ یہاں تقریباً وہی ہے جو سعودی عرب میں شیخ باز کا ہے۔

صبح کو ۹ بجے ڈکار سے تواون کے لئے قافلہ کی صورت میں روانگی ہوئی۔ سڑک نہایت عمدہ اور کشادہ تھی۔ اس کا بیشتر حصہ سمندر (البحر المحیط) کے کنارے کنارے گزرتا ہے۔ درمیان میں بعض گاؤں دکھائی دئے۔ مکانات معمولی انداز میں بنائے گئے تھے۔ پختہ تعمیرات زیادہ تر قدیم فرانسیسی طرز کی نظر آئیں۔

درمیان میں ایک تعلیمی ادارہ (دارالعلوم) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بورڈ پر اس کا نام معہد الازہر للدراسات الاسلامیۃ (Tel. 511554) لکھا ہوا تھا۔ ہم لوگ اس کے اندر گئے۔ اس کے کئی درجات دیکھے۔ کلاس کی صورت اسکولوں کی مانند تھی۔ ایک طرف دیوار کالی کرکے اس کو بلیک بورڈ کی صورت دی گئی تھی۔ یہاں استاد کھڑا ہوا تھا۔ سامنے ڈسک پر طلبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ استاد عربی زبان میں لکچر کے انداز میں انھیں پڑھا رہا تھا۔

یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔ ہندستان میں کثرت سے عربی مدارس قائم ہیں۔ مگر ان میں ذریعہ تعلیم اردو رکھا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آدمی عربی مدرسہ سے فارغ ہوجاتا ہے مگر عربی بولنے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ہم تواون پہنچے۔ یہاں خلیفہ الحاج عبد العزیز سی سے ملاقات ہوئی۔ یہ اندازہ ہوا کہ انھیں عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ آج ان کی اپیل پر بے شمار لوگ کانفرنس کے شرکاء کے استقبال کے لئے نکل پڑے تھے۔ اس سے پہلے ڈکار کے اجتماع میں میں نے دیکھا کہ وہاں خلیفہ کے نمائندہ نے تقریر کی اور پریسیڈنٹ نے تقریر کی۔ مگر خلیفہ کے نمائندہ نے جب خلیفہ کا ذکر کیا تو ان کے لئے پریسیڈنٹ سے بھی زیادہ تالیاں بجائی گئیں۔

یہاں کے سیاسی لیڈر اس راز کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ مذہبی رہنماؤں کو بالکل نہیں چھیڑتے۔ وہ ان کا احترام کرتے ہیں۔ شاہ ایران نے اسی معاملہ میں غلطی کی اور اس کی قیمت اسے یہ دینی پڑی کہ اس کا اقتدار ایران سے ختم ہوگیا۔ شاہ ایران کو جس چیز نے ختم کیا وہ خود شاہ کے غیر حکیمانہ اقدامات تھے، اور سینیگال کے سیاسی لیڈر اس غلطی سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچائے ہوئے ہیں۔ تواون کا اجتماع الحاج عبد العزیز سی کی موجودگی میں ہوا۔ یہاں پریسیڈنٹ کا ایک نمائندہ بھی موجود تھا۔ اس نے ایک سے زیادہ بار یہ جملہ دہرایا: ذالك ببركة دعوات اسلافنا الكرام۔

(باقی)

ایک سبق

" اللہ تعالیٰ ہی کو مقدم کرو اور دین کو دنیا پر ترجیح دو۔ جب تک انسان اپنے اندر دنیا کا کوئی حصہ بھی پاتا ہے وہ یاد رکھے کہ ابھی وہ اس قابل نہیں کہ دین کا نام بھی لے۔ یہ ایک غلطی لوگوں کو لگی ہوئی ہے کہ دنیا کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں آئے ہیں، کیا انھوں نے دنیا کے لئے سعی اور مجاہدہ کیا ہے یا دین کے لئے ؟ اور باوجود اس کے کہ ان کی ساری توجہ اور کوشش دین ہی کے لئے ہوتی ہے پھر کیا وہ دنیا میں نامراد رہے۔ کبھی نہیں۔ دنیا خود ان کے قدموں پر آکر گری۔ یہ یقیناً سمجھو کہ انھوں نے دنیا کو گویا طلاق دے دی تھی۔ لیکن یہ ایک عام قانون قدرت ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں وہ دنیا کو ترک کرتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ دنیا کو اپنا مقصود اور غایت نہیں ٹھہراتے۔ اور دنیا ان کی خادم اور غلام ہو جاتی ہے۔ جو لوگ برخلاف اس کے دنیا کو اپنا اصل مقصود ٹھہراتے ہیں خواہ وہ دنیا کو کسی قدر بھی حاصل کریں مگر آخر ذلیل ہوتے ہیں۔ سچی خوشی اور اطمینان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عطا ہوتا ہے۔ یہ مجرد دنیا کے حصول پر منحصر نہیں ہے۔" (ملفوظات جلد ہفتم صفحہ ۳۱۶ ـ ۳۱۷)

اوپر جو عبارت نقل کی گئی، وہ ایک اقتباس ہے۔ اس کو پڑھئے۔ بظاہر یہ کسی مسلمان بزرگ کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ در اصل مرزا غلام احمد قادیانی کا ملفوظ ہے جو قادیان کے ہفت روزہ بدر (۳۱ مئی ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کو تمام مسلم علماء نے متفقہ طور پر کافر قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے "ملفوظات" میں ایسی باتیں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ وہ کسی سچے بزرگ کا کلام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف اچھا کلام اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس کو کہنے والا اچھا انسان یا صحیح انسان بھی ضرور ہے۔ کسی انسان کو سمجھنے کے لئے اس کے پورے کلام اور اس کی پوری زندگی کو دیکھنا چاہئے نہ کہ صرف جزئی کلام یا جزئی زندگی کو۔ کسی انسان کے بارہ میں حکم لگانے کے لئے اس کی تقریر یا تحریر کا صرف ایک اقتباس کافی نہیں۔

برصغیر ہند میں مغل سلطنت کا خاتمہ اور وسیع تر عالم اسلام میں خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد ساری دنیا میں احیاء کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان تحریکوں کا مشترک فکر یہ تھا کہ "اسلام کا اقدامی عمل جہاد ہے"۔ یہ حالت سو سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۶ میں الرسالہ جاری ہوا۔ اس نے پہلی بار یہ آواز بلند کی کہ "اسلام کا اقدامی عمل دعوت ہے"۔ اس وقت یہ ایک تنہا آواز تھی۔ آج اللہ کے فضل سے ساری دنیا میں لاکھوں آدمی اس پیغام کی اہمیت کو سمجھ چکے ہیں۔ بہت جلد انشاء اللہ وہ وقت آنے والا ہے جبکہ یہی دعوتی فکر سارے عالم اسلام کا غالب فکر بن جائے۔

۲ پچھلے ۵۰ سال سے ہندستانی مسلمانوں کو ایک ہی بات بتائی جا رہی تھی۔ یہ کہ تمہاری ہر محرومی دوسروں کے زیادتی اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ الرسالہ نے پہلی بار بتانا شروع کیا کہ یہ زندگی کی حقیقت ہے نہ کہ تعصب۔ اور محنت اور تدبیر کے ذریعہ اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اب وہ لوگ بھی اس واقعہ کا اعتراف کرنے لگے ہیں جو دوسروں کے ظلم و تعصب کے اعلان کے چمپئن بنے ہوئے تھے۔ مثلاً مسٹر شہاب الدین اپنے روایتی فکر کو دہراتے ہوئے اب یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ـــــ مگر محرومی زندگی کی ایک حقیقت ہے، صرف ہندستانی مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ۸۵ فی صد عوام کے لئے بھی۔ اور صرف تعلیم میں نہیں بلکہ انسانی سرگرمیوں کے ہر میدان میں۔ اس لئے محدود مواقع میں مقابلہ کی صورت حال کے اندر مراعات یافتہ مفادات اور غالب طبقوں کے خلاف ایک مستقل چوکسی اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے:

But deprivation is a fact of life and not only for Muslim Indians but for 85% of our people not only in education but in every field of human activity. So a constant vigil and a ceaseless struggle are called for in a situation of competition for scarce resources against vested interests and dominant groups. *Muslim India*, July 1990, p. 294.

۳ الرسالہ کا فکر خدا کے فضل سے اب اتنا غالب آچکا ہے کہ تقریباً تمام لوگ کسی نہ کسی طور پر اب اسی کو دہرا رہے ہیں۔ تاہم اعتراف کی جرأت نہ ہونے کی وجہ سے وہ الرسالہ کی بات کو اپنی بات بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ ریاض الجنۃ (مئی ۱۹۹۰) کا اداریہ

(عصر حاضر کا تقاضا) پورا کا پورا الرسالہ کی نقل ہے۔ صرف معمولی طور پر کچھ الفاظ بدل دیئے گئے ہیں۔ یہ بات اگر اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ کی جائے تو زیادہ موثر ہو۔

۴ جناب شکیل احمد خلیل صاحب (ابوظبی) الرسالہ مشن سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ وہ تقریباً ہر ماہ مختلف اسلامی اداروں، دینی درس گاہوں اور اردو لائبریریوں کے نام ماہانہ الرسالہ جاری کرواتے ہیں اسی کے ساتھ الرسالہ کیسٹ اور مرکز کی دوسری مطبوعات بھی ایک قابل لحاظ تعداد میں، بطور ہدیہ ارسال کرواتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مزید کچھ افراد اس قسم کے حوصلہ مندانہ تعاون کے لئے آگے بڑھیں تاکہ الرسالہ کا دعوتی اور تعمیری مشن زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیل سکے۔

۵ اسلامک سینٹر آف نارتھ امریکا (I.C.N.A.) کے زیر اہتمام نیویارک میں بتاریخ ۲۰ تا ۲۲ جولائی ۱۹۹۰ ایک سہ روزہ کنونشن منعقد ہوا۔ اس موقعہ پر امریکا میں ہمارے مخلص معاون جناب خواجہ کلیم الدین صاحب اور ان کے رفقاء نے اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا۔ جس کو حیرت انگیز کامیابی ملی۔ کافی بڑی تعداد میں لوگوں نے نہایت ذوق وشوق اور دلچسپی کے ساتھ کتابوں کا مشاہدہ کیا۔ اس طرح خدا کے فضل سے ایک نئے حلقہ میں الرسالہ اور مرکز کی دیگر مطبوعات کا تعارف ہوگیا۔

۶ اسلامی مرکز کی مطبوعات ہدیۃً ارسال کرنے کے لیے ہمیں دینی درسگاہوں، اردو لائبریریوں، اسکولوں اور کالجوں کے پتے مطلوب ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنے علاقے میں واقع دینی مدارس اور دوسرے علمی اداروں کے پتے مختصر تعارف کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ اگر اداروں کے ذمہ دار حضرات کو اس پہلو پر توجہ دلاکر ان کا مطلوبہ تعارف نامہ روانہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

۷ پاکستان کا مشہور اخبار "وفاق" ہر روز اپنے صفحہ ۳ پر الرسالہ کا کوئی ایک مضمون نقل کرتا ہے۔ اس کے ادارتی نوٹس میں بھی الرسالہ کے فکر کی جھلک آنے لگی ہے۔ مثلاً اس کے شمارہ ۱۲ جون ۱۹۹۰ میں ایک نوٹ کا عنوان ہے: "مسائل امن کی قوت سے حل کیجئے"۔ اس نوٹ میں پاکستانی حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پڑوسی ملک سے ہمارے جو مسائل ہیں

ان کو ہمیں جنگ کی قوت سے نہیں بلکہ امن کی قوت سے حل کرنا چاہئے۔ یہ واضح طور پر الرسالہ کے فکر کی تاثیر کی ایک مثال ہے۔

۸ جوہانسبرگ (افریقہ) سے انگریزی ماہنامہ البلاغ نے اپنے صفحات میں الرسالہ انگریزی کے مضامین نقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کے ایڈیٹر نے اپنے خط (۲ جولائی ۱۹۹۰) میں لکھا ہے:

I have taken the liberty of reproducing an article in the current issue of *Al-Balagh*, and wish to do so in future also, with your kind permission, for da'wah work. Your articles are short, concise, succinct and to the point. They are eye-openers and I, for one, enjoy reading them immensely. Every article, including the titbits, are highly educative and enlightening. (A.S.K. Joommal)

۹ سرینگر کا اخبار "روشنی" کشمیر کے جنگجوؤں اور دہشت گردوں کی باتیں مسلسل چھاپتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ الرسالہ کے وہ مضامین بھی تقریباً ہر شمارہ میں چھاپ رہا ہے جن میں امن اور تعمیر اور انسانیت کا پیغام ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نام نہاد اسلام پسندوں کی چھیڑی ہوئی تخریبی سیاست کے ساتھ الرسالہ کا تعمیری فکر کس طرح متوازی طاقت بن کر ابھر رہا ہے۔

۱۰ جناب مہدی حسن صاحب (بنارس) نے ۲۰ جون ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتایا کہ پروفیسر نور محمد بنارسی امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں قانون کے استاد ہیں۔ ان کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں غیر مسلم حضرات بھی شریک تھے۔ ایک غیر مسلم پروفیسر نے کہا "یہ بتائیے کہ آپ کے اسلام میں وہ کون سی تعلیم ہے جو موجودہ حالات میں سب سے زیادہ قابل عمل اور ریلیونٹ ہے۔ ایک مسلمان پروفیسر نے کہا کہ "صلح حدیبیہ کا اصول ایک ایسا اصول ہے جو آج کے حالات میں سب سے زیادہ قابل عمل اور ریلیونٹ ہے۔" غیر مسلم حضرات نے اس جواب کو بہت پسند کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا طرز فکر کس طرح عالمی سطح پر پھیل رہا ہے۔

۱۱ تذکیر القرآن کا عربی ترجمہ پہلے سے کیا جا رہا تھا۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۸ | نومبر ۱۹۹۰

فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

عجیب فرق

جو لوگ قرآن کو مان کر قرآن کے دین کو اختیار کریں، ان کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ ایسے لوگوں کا نام مسلم رکھا گیا ہے: هو سماكم المسلمين (الحج ۷۸) یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی سادہ سی چیز دوسرے مذہب والوں کو حاصل نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو جو لوگ مانتے ہیں، ان کو یہودی (Jews) کہا جاتا ہے۔ مگر ان کی مقدس کتاب بائبل میں کہیں بھی یہ درج نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ میرے ماننے والوں کا نام یہودی ہوگا۔ اسی طرح مسیح علیہ السلام کے دین کو جو لوگ مانتے ہیں ان کو مسیحی (Christians) کہا جاتا ہے۔ مگر انجیل (نئے عہد نامہ) میں کہیں بھی یہ نہیں ملتا کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے ماننے والوں کا نام مسیحی رکھا تھا۔

یہی حال ہندو ازم یا ہندو دھرم کے ماننے والوں کا ہے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔ مگر اپنی جن کتابوں کو وہ مقدس مانتے ہیں، ان میں کہیں بھی یہ لکھا ہوا نہیں ملتا کہ اس دھرم کو جو لوگ مانیں، ان کا نام ہندو ہوگا اور انھیں ہندو کہا جائے گا۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۰ اگست ۱۹۹۰) میں اندرا رودرمنڈ (Indira Rothermund) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے —— ہندو دھرم میں فنڈمنٹلزم کے لیے کوئی جواز نہیں:

Fundamentalism has no legitimacy in Hindu dharma

اس مضمون میں درج ہے کہ ایک ممتاز ہندو مورخ نے بتایا ہے کہ لفظ ہندو کسی بھی قدیم ہندستانی متن میں نہیں پایا جاتا۔ یہ لفظ عرب حملہ آوروں نے آٹھویں صدی عیسوی میں وضع کیا تھا۔ یہ لفظ جغرافی معنوں میں تھا اور وہ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا جو دریائے سندھ کے ساحل پر یا اس کے اُس پار رہتے تھے:

> An eminent historian has pointed out that the word Hindu is not found in many ancient Indian texts but was coined by the invading Arabs in the 8th century AD and was a geographical term applied to people who lived on or beyond the banks of the river Sindhu or Indus (p. 9).

نہ صرف نام بلکہ ہر بات جو اسلام میں دین کا جزر سمجھی جاتی ہے ، اس کی ٹھوس بنیاد خود قرآن اور حدیث میں موجود ہے ۔ جب کہ دوسرے مذاہب میں بہت بڑے پیمانہ پر تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ اس لیے وہ آج جن چیزوں کو مانتے ہیں ، ان کے لیے ان کے پاس ٹھوس تاریخی بنیاد موجود نہیں ۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے اور دوسرے تمام مذاہب غیر محفوظ مذہب ۔ اسلام اپنے پیچھے مکمل تاریخی استناد رکھتا ہے ، جب کہ دوسرے مذاہب تاریخی استناد کی زمین سے محروم ہیں ۔ اسلام پورے معنوں میں ایک سائنٹفک مذہب ہے ، اور دوسرے تمام مذاہب بے ثبوت عقیدہ کی حیثیت رکھتے ہیں ، ان کو ، جدید علمی معنوں میں ، سائنٹفک مذہب کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ۔ اسلام آج کا مذہب ہے ، جب کہ دوسرے مذاہب دور قدیم کے مذہب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے مذاہب اصلاً غلط تھے ۔ اپنی ابتدائی اصل کے اعتبار سے تمام مذاہب سچے تھے ۔ مگر بعد کے زمانہ میں وہ اپنی اصل صورت کو باقی نہ رکھ سکے ۔ اس لیے وہ علمی اور تاریخی اعتبار سے قابل اعتبار نہ رہے ۔

اسلام کو یہ امتیازی صفت اللہ تعالیٰ نے اس لیے دی تھی کہ اہل عالم کے درمیان اس کی تبلیغ کا کام آسان ہو جائے ۔ جب مذاہب کی لمبی فہرست میں ایک ہی مذہب مستند ہو اور بقیہ تمام مذاہب غیر مستند ، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب طالبین مذہب کے لیے انتخاب کا معاملہ آسان ہو گیا ۔ اب ان کے لیے تلاش وجستجو کا مسئلہ نہ رہا ۔ اب تو میدان میں ایک ہی صداقت ہے جس کو انھیں بلا بحث اختیار کر لینا چاہیے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس واحد سچائی کو دنیا کے سامنے تو پیش نہ کیا ، البتہ اس کے واحد سچائی ہونے پر فخر کرنے لگے ۔ انھوں نے اسلام کی امتیازی شان کو اس کی تبلیغ کے لیے استعمال نہیں کیا ، بلکہ اس کو اپنے لیے سرمایۂ فخر بنا لیا ۔

مسلمان اگر اسلام کی تبلیغ کرتے تو انھیں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا انعام ملتا ۔ مگر اپنی دیواروں پر "ہم کو اسلام پر فخر ہے" لکھ کر وہ صرف اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہے ہیں ۔

مقصدی کردار

۶ ستمبر ۱۹۹۰ء کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو دوسری طرف ایک خاتون انیتا پرتاپ (Anita Pratap) بول رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ نئی دہلی میں وہ ٹائم میگزین (نیویارک) کی اسپشل کرسپانڈنٹ ہیں۔ اور مجھ سے "اسلام میں عورت کا مقام" کے مسئلہ پر معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

مقررہ وقت پر وہ دفتر میں آئیں۔ ان کے پاس انگریزی کا ایک ٹائپ کیا ہوا آرٹیکل تھا۔ یہ اسلام میں عورت کی حیثیت کے بارہ میں تھا، اور اس کا عنوان تھا ـــــــ پردہ کے پیچھے :

Behind the veil

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ یہ آرٹیکل ہمارے پاس ٹائم کے صدر دفتر نیویارک سے آیا ہے۔ ہمارا میگزین ایک مضمون چھاپنا چاہتا ہے جس میں عورت کے بارہ میں اسلام کی تعلیمات بتائی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے صدر دفتر نے کچھ مسلم ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کو لکھا کہ وہ موضوع سے متعلق ضروری معلومات حاصل کر کے بھیجیں۔ ان معلومات کو سامنے رکھ کر نیویارک کے اڈیٹر نے یہ آرٹیکل تیار کیا۔ اب اس آرٹیکل کو دوبارہ مختلف ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کے پاس بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنے یہاں کے مستند علماء سے مل کر اس کے اندراجات کی جانچ کریں اور ان کی تصدیق یا تصحیح کر کے دوبارہ صدر دفتر (نیویارک) کو بھیجیں۔ ہماری ان ترمیمات کو سامنے رکھ کر نیویارک کا ایڈیٹر آرٹیکل کو دوبارہ لکھے گا اور اس کے بعد اُس کو ٹائم میں چھاپا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی چیزوں میں ہمارا طریقہ "چیک اینڈ ری چیک" کا ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک مضمون کی تیاری میں آپ لوگ اتنا زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں خاتون کرسپانڈنٹ نے کہا کہ ہمارا میگزین (ٹائم انٹرنیشنل) ساری دنیا میں جاتا ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں پڑھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس کا تحمل نہیں کر سکتے کہ ہم اس میں کوئی غلطی کریں :

We can't afford to make any mistakes.

ٹائم کے نمائندہ کا یہ جملہ بے حد سبق آموز ہے۔ ٹائم کا مقصد یہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں اپنے پرچہ کے لیے خریدار حاصل کرے۔ اسی لیے اس کا نام ٹائم انٹرنیشنل رکھا گیا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے

ضروری ہے کہ اس کا ہر شمارہ لوگوں کو غلطیوں سے خالی دکھائی دے۔ اگر لوگ محسوس کریں کہ اس کی رپورٹیں اور اس کی معلومات غلط ہوتی ہیں تو لوگ اس کی خریداری کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ ٹائم اپنے پرچہ کو ساری دنیا میں پھیلانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ٹائم اپنے پرچہ کی غیر مقبولیت کا تحمل نہیں کر سکتا، اس لیے وہ اِس کا تحمل بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے صفحات میں ایسی باتیں چھاپے جو غلط یا خلاف واقعہ ہوں۔ اور نتیجۃً لوگوں کو اس سے دور کر دینے کا سبب بن جائیں۔

یہی نفسیات زیادہ بڑے پیمانے پر دین کے داعی کی ہوتی ہے۔ داعی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے دین کو خدا کے تمام بندوں کے لیے قابل قبول بنائے۔ اس مقصد کے پیش نظر داعی ہر ممکن تدبیر کے ذریعہ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان ایسی کوئی بات پیش نہ آئے جو مدعو کو دین حق سے بیزار کر دے، جس کا نتیجہ اس صورت میں نکلے کہ خدا کا دین مدعو کو مشتبہ دکھائی دینے لگے، وہ مدعو کی نظر میں قابلِ قبول نہ رہے۔

اس مقصد کے لیے داعی ہر قسم کی "غلطی" سے بچنے کا مکمل اہتمام کرتا ہے۔ وہ مدعو کی پسندیدہ زبان (ابراہیم ۴) میں کلام کرتا ہے۔ وہ دین کو اس کے سامنے قول بلیغ (النساء ۶۳) کے اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ وہ مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر (ابراہیم ۱۲) کرتا ہے۔ وہ تالیف قلب (التوبہ ۶۰) کے ذریعہ اس کے دل کو نرم کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے پاک (المدثر ۴) کرتا ہے۔ وہ آخری حد تک مدعو کا خیر خواہ (الاعراف ۷۹) بن جاتا ہے۔ حتی کہ بعض اوقات وہ ایک صحیح اور جائز بات کے سلسلہ میں بھی مدعو کی ضد کو مان لیتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے حدیبیہ کے موقع پر مدعو کے اصرار پر لفظ "رسول اللہ" کو کاغذ سے مٹا دیا۔

ٹائم میگزین کے نمائندہ نے کہا کہ ہم غلطیوں کا تحمل نہیں کر سکتے۔ یہی بات ایک داعی کو مزید شدت کے ساتھ کہنا ہے۔ داعی کا احساس یہ ہونا چاہیے کہ میں ایسی کسی بات کا تحمل نہیں کر سکتا جو مدعو کو میرے پیغام سے دور کر دے۔ میں یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لوں گا کہ مدعو کو اپنے پیغام حق کے بارہ میں بدظن نہ ہونے دوں۔ میں ہر اس قول یا فعل سے بچوں گا جو مدعو کے اندر مخالفانہ نفسیات پیدا کرے اور میری بات کو اس کے لیے ناقابل قبول بنا دے۔

زیادہ بڑی واپسی

ڈاکٹر گوپال سنگھ ۲۹ نومبر ۱۹۱۱ کو ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۸ اگست ۱۹۹۰ کو نئی دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ مختلف زبانیں جانتے تھے۔ وہ بلغاریہ اور برٹش گائنا میں ہندستان کے سفیر تھے۔ آخر میں وہ ناگالینڈ اور گوا کے گورنر بنے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے عہدوں پر فائز ہوئے۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ نے اپنی موت سے صرف چند دن پہلے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنے وہ تلخ تجربات لکھے ہیں جو انھیں بطور گورنر حاصل ہوئے۔ ان کا یہ مضمون ہندستان ٹائمس (۱۲ اگست ۱۹۹۰) میں ذیل کے عنوان کے تحت شائع ہوا ہے :

An ex-Governor speaks out

مثال کے طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ مجھے ناگالینڈ میں گورنر کی حیثیت سے بھیجا گیا۔ ناگالینڈ میں ۹۰ فی صد عیسائی ہیں۔ وہاں ترقیاتی کام رکا ہوا تھا، میں نے بہت سے کام شروع کرائے۔ بجلی کی فراہمی کا انتظام کیا۔ پیپر مل بنوائی جس پر ۸۷ کرور روپے خرچ ہوئے۔ شوگر مل کو ترقی دی۔ ایک نئی یونی ورسٹی قائم کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں ریاست کی ترقی کے لیے محنت کرنے میں لگا ہوا تھا۔ مگر میں اپنے عہدہ کی مدت پوری کرنے سے پہلے عہدہ سے واپس بلالیا گیا :

But, I was recalled, before time!

ڈاکٹر گوپال سنگھ گورنری کے عہدہ سے واپس بلائے جانے کی شکایت تحریر کر رہے تھے، مگر انھیں معلوم نہ تھا کہ اس کے صرف چند دن بعد وہ خود موجودہ دنیا سے واپس بلائے جانے والے ہیں۔ کیسا عجیب ہے انسان کا یہ معاملہ۔ وہ ایک " واپسی " کو جانتا ہے، مگر دوسری زیادہ بڑی واپسی کی اس کو خبر نہیں۔

ہر انسان جو دنیا میں آیا ہے وہ ایک دن یہاں سے واپس جانے والا ہے۔ آدمی اس دنیا میں اسی لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ مر کر دوبارہ یہاں سے چلا جائے۔ وہ عالم آخرت میں اپنے قول وعمل کا حساب دینے کے لیے حاضر کر دیا جائے۔ یہی کسی آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، مگر یہی وہ مسئلہ ہے جس کے لیے کوئی آدمی فکر مند نہیں۔

بامعنی زندگی

ڈاکٹر جارودی (Roger Garaudy) فرانس میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ وہ عیسائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۲ء کے مشہور اقتصادی بحران نے ان کے ذہن پر اثر ڈالا۔ وہ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے، تاہم ان کو ذہنی اطمینان نہ مروجہ مسیحیت میں ملا اور نہ کمیونزم میں۔ بعد کو انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور ۱۹۸۲ء میں اسلام قبول کرلیا۔

ڈاکٹر جارودی کو ۱۹۸۶ء میں شاہ فیصل فاؤنڈیشن کے تحت خدمت اسلام کا نصف ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقع پر ریاض میں ایک تقریب ہوئی جس میں ڈاکٹر جارودی نے اپنے حالات کے بارہ میں مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر انھوں نے فرانسیسی زبان میں کی تھی۔ اس کا مکمل عربی ترجمہ سعودی اخبار الریاض (۲ رجب ۱۴۰۶ھ، ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر جارودی کا ذہن جب کمیونزم سے ہٹا اور وہ مذہب کی جانب مائل ہوئے تو ابتداءً ان کا میلان مسیحیت کی طرف ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر اسلام قبول کرلیا۔ اسلام میں انھوں نے اپنے پورے ذہنی اطمینان کو پالیا۔ الحاد سے اسلام کی طرف اپنے اس سفر کو بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے ایسا اس لیے کیا تاکہ کرکے گارڈ (Kierkegaard) کے الفاظ میں، اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکوں (حتی اعطی لحیاتی معنی)

زندگی میں معنویت کی تلاش ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ ہر آدمی کے اندر لازمی طور پر اور پیدائشی طور پر پایا جاتا ہے۔ اپنی اس اندرونی تلاش کا جواب پانے کے لیے وہ ہر طرف دوڑتا ہے۔ مگر دوسری تمام چیزوں میں اس کا جواب یا تو سرے سے موجود نہیں ہے یا اگر ہے تو جزئی طور پر ہے۔ اس لیے دوسری چیزوں میں انسان کو یہ تسکین نہیں ملتی کہ اس نے اپنی تلاش کا صحیح اور کامل جواب پالیا ہے۔

اس تلاش کا صحیح اور مکمل جواب صرف خدا کے محفوظ دین —— اسلام میں موجود ہے۔ اسلام کی یہ امتیازی صفت اس کی دعوتی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

موت کے آگے

ایم ایس اوبرائے ہندستان میں ہوٹل کے بزنس میں سب سے ممتاز شخص گنے جاتے ہیں۔ وہ ایک "ہوٹل ایمپائر" کے مالک ہیں اور نہ صرف ہندستان کے مختلف شہروں میں ان کے ہوٹل قائم ہیں ، بلکہ بیرونی دنیا میں بھی ان کے بڑے بڑے ہوٹل چل رہے ہیں۔ مسٹر اوبرائے ۱۵ اگست ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ اب ۹۰ سال کی عمر کو پہنچ کر وہ دہلی کے قریب ایک فارم میں سادہ طور پر رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا فارم میری پناہ گاہ ہے ، وہ مجھ کو سکون دیتا ہے :

My farm is my refuge and gives me solace.

ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن (۱۲ اگست ۱۹۹۰ء) میں اپنی زندگی کی کہانی بتاتے ہوئے اس کو انھوں نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے ——— اپنی زندگی کی شام کو پہنچ کر مجھے کوئی افسوس نہیں۔ یہ جان کر مجھے راحت ملتی ہے کہ اپنے طریقہ کے مطابق ، میں اس قابل ہوسکا کہ ضرورت مند لوگوں کی مدد کروں ، اور یہ کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ میرے ملک کی عزت میں اضافہ کا سبب بھی بنا۔ اس سے زیادہ کوئی شخص اور کیا تمنا کرسکتا ہے :

In the evening of life, I have few regrets and there is comfort in knowing that I have been able to, in my humble way, help people in need and that whatever I have achieved has also helped to raise the prestige of my country. What more could any man have wished for?

ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ایک شخص جو ملک کے لیے جئے ، وہ اپنی آخر عمر میں پہنچ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جس کے لیے جیا اس کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص خدا کے لیے جئے ، اس کا احساس آخر عمر میں یہ ہوگا کہ وہ جس ہستی کے لیے جیا ، وہ ہستی اس کے آگے ہے۔ پہلے شخص کو موت کے آگے صرف خلا نظر آئے گا ، اور دوسرے شخص کو موت کے آگے امید سے بھری ہوئی ایک پوری دنیا دکھائی دے گی۔

پھر کیوں نہ آدمی خدا کے لیے جئے۔ کیوں وہ غیر خدا کے لیے جئے جس کا آخری انجام صرف مایوسی اور ناامیدی ہے ، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

بند ذہن

یونانی فلسفی ارسطو (۳۲۲ - ۳۸۴ ق م) نے لکھا ہے کہ گول دائرہ معیاری دائرہ ہے اور وہ جیومٹری کی کامل صورت ہے۔ اس مفروضہ کی بنیاد پر ارسطو نے کہا کہ فطرت (نیچر) کا ہر کام چوں کہ معیاری ہوتا ہے، اس لیے فطرت آسمانی اجرام کو جن دائروں میں گھما رہی ہے، وہ صرف گول دائرہ ہی ہو سکتا ہے۔

ارسطو کا یہ نظریہ قدیم زمانہ میں تمام لوگوں کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔ قدیم زمانہ میں ہیئت کے جو نظام بنائے گئے، مثلاً بطلیموس کا نظام، کوپرنیکس کا نظام، ٹائیکو براہے کا نظام، سب میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ آسمانی اجرام (نظام شمسی کے سیارے) سب کے سب خلا کے اندر گول دائروں میں گھومتے ہیں۔

کپلر (Johannes Kepler) غالباً پہلا شخص ہے جس نے اس کے خلاف سوچا۔ اس نے حساب لگا کر ۱۶۰۹ میں بتایا کہ مریخ کی گردش سورج کے گرد گول دائرہ میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ بیضوی مدار (elliptical orbit) میں گھومتا ہے۔ اس نے پیشین گوئی کی کہ دوسرے تمام سیارے جو سورج کے گرد گھومتے ہیں، وہ بھی بیضوی شکل ہی میں گھومتے ہیں۔ کپلر کا یہ نظریہ آج ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا ہے۔

قدیم ہیئت داں دو ہزار سال تک گول دائرہ کے تصور میں گم رہے۔ وہ سیاروں کی گردش کے بارہ میں دوسرے نہج پر سوچ نہ سکے۔ اس کی وجہ ارسطو کے نظریہ کی عظمت تھی۔ اس نظریہ کو انھوں نے بلا بحث ایک مسلّمہ حقیقت مان لیا۔ اس بنا پر ان کا ذہن کسی اور انداز میں کام نہیں کر پاتا تھا۔

یہ صرف قدیم زمانہ کی بات نہیں، یہ ہر دور کی بات ہے۔ ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ بعض خیالات آدمی کے دماغ پر اتنا زیادہ چھا جاتے ہیں کہ ان سے نکل کر آزادانہ طور پر سوچنا آدمی کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ مذہبی دائرہ میں بھی ہوتا ہے اور غیر مذہبی دائرہ میں بھی۔ یہ بند ذہن ہر قسم کی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

تبدیلی کا اصول

اسلام سے پہلے عرب کے زمانہ کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ایک بار مکہ کے لوگوں میں جھگڑا ہوا۔ یہاں تک کہ جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ جھگڑا اس بات پر تھا کہ مکہ کے بڑے مناصب (السقایة، الحجابة، اللواء، الندوة) کس کے پاس رہیں۔ آخر کچھ سنجیدہ لوگوں کی کوشش سے اس پر صلح ہوگئی کہ حجابہ اور لواء اور ندوہ بنو عبدالدار کے پاس رہے۔ اور سقایہ اور رفادہ بنو عبد مناف کو دیدیا جائے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں :

فلم یزالوا علیٰ ذلك حتی جاء الله تعالیٰ بالاسلام۔ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ماكان من حلفٍ فی الجاهلية فانّ الاسلامَ لم یزدهُ الا شدةً

(سیرة ابن ہشام، ۱/ ۱۴۴)

وہ لوگ اس پر قائم تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام بھیجا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو بھی معاہدہ تھا، اسلام نے اس کے سوا کچھ اور نہیں کیا ہے کہ اس کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا ہے۔

اس سے اسلام کی پالیسی کا ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے مکہ کے لوگ مشرک تھے۔ ان کا یہ فیصلہ دورِ شرک کا کیا ہوا فیصلہ تھا جو اسلام کے مسلّمہ دشمن رہ چکے ہیں۔ ان سب کے باوجود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ کو نہیں بدلا۔ بلکہ اس کے مزید استحکام کا اعلان فرما دیا۔

مخالف پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اس کے تمام پچھلے فیصلوں کو بدلنا انتہائی غیر حکیمانہ ہے۔ بلکہ یہ سرکشی کا فعل ہے۔ اس طرح کی تبدیلیاں صرف مسائل کو بڑھاتی ہیں۔ سماج میں بدعنوانیوں کے ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے نتیجہ میں اصلاح کے نام پر فساد ظہور میں آتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ غلبہ کے باوجود ماضی کے ڈھانچہ کو باقی رکھا جائے، اور جن چیزوں کو بدلنا ضروری ہو ان کو بھی یکلخت نہ بدلا جائے۔ بلکہ تدریجی رفتار سے فطری انداز میں ان کے اندر تبدیلی لائی جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد بیشتر امور کو علیٰ حالہ برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے فطری عمل کے تحت اپنے آپ تمام چیزیں اسلامی رنگ میں رنگ گئیں۔

فطرت کے مطابق

مس سینڈرا اسٹرلنگ (Sandra Sterling) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے اس
قبول کرلیا ہے۔ اب ان کا نیا نام عالیہ اسٹرلنگ (Alia Sterling) ہے۔ وہ امریکہ کی راجدھا
واشنگٹن میں رہتی ہیں۔

انھوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک روز مجھے گھر کی الماری میں کچھ کتابیں ملیں
یہ کتابیں میری ماں نے اس وقت خریدی تھیں جب کہ وہ میری دادی کے ساتھ قاہرہ میں رہتی تھیں
میری دادی قاہرہ کے امریکی سفارت خانے میں ایک عہدہ دار تھیں۔ ان کتابوں میں ایک قرآن کا انگر
ترجمہ بھی تھا۔ میں نے اس ترجمہ کو پڑھنا شروع کیا۔ اس کے مطالعہ سے میری دل چسپی بڑھی۔ ا
کے بعد میں نے واشنگٹن سے اسلام کی تاریخ اور پیغمبر کی سیرت پر مزید کتابیں حاصل کیں اور ان
مطالعہ کیا۔ اس طرح اسلام کی طرف میرا سفر شروع ہوا۔ اسلام نے مجھے ان تمام سوالوں کا جواب
دیدیا جو میرے ذہن میں موجود تھا:

Islam answered all the questions I had in mind.

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ اور یہ چیز اس کو تمام دوسرے مذاہب سے الگ کرتی ہے
مثال کے طور پر یہودیت بھی ایک خدا کی بات کرتی ہے۔ مگر اس مذہب کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے
کہ خدا نے اپنی تمام نعمتیں صرف ایک قوم (یہود) کے لیے خاص کر دی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ
آتی کہ خدا جب ہر چیز کا خالق ہے تو اس نے اپنی نعمتوں کو کسی ایک گروہ کے لیے کیوں مخصوص کر
دوسری طرف مسیحیت کا یہ حال ہے کہ وہ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتی ہے۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ
میں نہیں آتی۔ اور نہ یہ سمجھ میں آتا کہ خدا کی خدائی میں کوئی اور حصہ دار ہو سکتا ہے۔ ان باتوں پر میں بہت
عرصہ تک غور کرتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

Islamic Voice, Bangalore, November 1987.

آدمی کی فطرت میں مطلوب دین کا ماڈل پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب دین
کو جانتا ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے معلوم ماڈل کے عین مطابق تھا۔

قابل عمل، ناقابل عمل

ایک دھوبی ایک روز اپنے گدھوں کو لے کر گھر سے گھاٹ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک محلّہ تھا۔ محلّہ والوں نے کہا کہ تمہارے گدھوں کو ہم اس شرط پر اپنے محلہ سے گزرنے دیں گے کہ وہ آواز نہ نکالیں، کیوں کہ گدھے کی آواز ہم کو پسند نہیں۔ دھوبی نے جواب دیا : آپ لوگوں کی یہ شرط تو میں مان سکتا ہوں کہ میرے گدھے کسی کو لات نہ ماریں، مگر یہ شرط میرے بس سے باہر ہے کہ میرے گدھے کوئی آواز نہ نکالیں۔

یہ واقعہ فرقہ وارانہ فساد کے معاملہ کو بہت خوبی کے ساتھ بتارہا ہے۔ ہندستان کے بیشتر فسادات کی بنیاد یہ ہے کہ ایک فرقہ اپنا جلوس نکالتا ہے۔ وہ چلتے ہوئے شہر کی ایسی سڑک سے گزرتا ہے جس کے کنارے دوسرے فرقہ کے مکانات ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ مانگ کرتے ہیں کہ جلوس والے جلوس تو نکالیں مگر وہ اشتعال انگیز نعرہ نہ لگائیں۔ جلوس اس شرط کو پورا نہیں کرپاتا۔ جلوس کے کچھ افراد اشتعال انگیز نعرے لگادیتے ہیں۔ اس پر دوسرا فرقہ بھڑک کر پتھر مارتا ہے۔ اس کے جواب میں فریق ثانی مزید مشتعل ہو کر گولیاں چلاتا ہے، اور پھر وہ فساد برپا ہوتا ہے جس میں ساری آبادی تہس نہس ہو کر رہ جاتی ہے۔

جلوس نکالنا بلاشبہ ایک سطحی کام ہے۔ اس میں سطحی قسم کے لوگ ہی حصہ لیتے ہیں۔ سنجیدہ اور پڑھے لکھے لوگ کبھی جلوس وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں جلوس، انسانی گدھوں کی بھیڑ کا نام ہے۔ ایسے لوگوں سے یہ مانگ کرنا کہ وہ نعرہ نہ لگائیں، سراسر ناقابل عمل ہے۔ وہ لازمی طور پر نعرہ لگائیں گے، حتیٰ کہ دل آزار نعرے بھی۔

ہم کو چاہیے کہ ہم قابل عمل اور ناقابل عمل کے فرق کو سمجھیں۔ ہم قابل عمل کی مانگ کریں اور جو ناقابلِ عمل ہے اس کو نظر انداز کردیں۔ ہم قول پر صبر کریں (المزمل ۱۰) اور عمل پر پابندی لگانے کی کوشش کریں۔ ایسے مواقع پر ہم کو نعرہ کی بات سے اعراض کرنا چاہیے۔ ہم کو ایڈمنسٹریشن سے صرف یہ مانگ کرنا چاہیے کہ وہ جلوس کو تشدد کی کارروائی کرنے سے روکے۔ ہم اگر اس حکمت کو اختیار کرلیں تو ملک سے فرقہ وارانہ فسادات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

اس دنیا میں ممکن کی مانگ ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے ، اور ناممکن کی مانگ ہمیشہ ناکامیاب۔

حکمت کلام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت)

لابرویر (Jean de La Bruyere) ایک فرانسیسی مصنف ہے۔ وہ ۱۶۴۵ میں پیدا ہوا اور ۱۶۹۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے یہی بات ان لفظوں میں کہی کہ یہ بڑی بدبختی کی بات ہے کہ آدمی کے اندر نہ اتنی سمجھ ہو کہ وہ اچھا بولے، اور نہ اتنی قوت فیصلہ ہو کہ وہ چپ رہے:

> It is a great misery not to have enough wit to speak well, nor enough judgement to keep quiet.

بولنے کی صلاحیت ناقابل بیان حد تک ایک عظیم صلاحیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ بولنے کی صلاحیت کو اگر درست طور پر استعمال کیا جائے تو وہ نعمت ہے، اور اگر بولنے کی صلاحیت کا بے جا استعمال کیا جائے تو وہ اتنی ہی بڑی مصیبت بن جاتی ہے۔

بولنے کی صلاحیت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے سوچے۔ خود کہنے سے پہلے وہ دوسروں کی سنے۔ جو لفظ بھی وہ منھ سے نکالے یہ سوچ کر نکالے کہ اس کو اپنے بولے ہوئے ایک ایک لفظ کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں دینا ہے، جس کے پاس بولنے کے لیے ہو، اس کے باوجود وہ چپ رہنے کو پسند کرے۔ جو ذمہ داری کے احساس کے تحت بولے نہ کہ شوقِ گفتگو کے جذبہ کے تحت۔

اس کے برعکس بولنے کی صلاحیت کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی سوچے بغیر بولے۔ اس کو صرف سنانے کا شوق ہو، سننے سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ معاملات کو گہرائی کے ساتھ سمجھے بغیر وہ معاملات پر تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ اس کا بولنا خودنمائی کے لیے ہو نہ کہ اظہار حقیقت کے لیے۔

بولنا سب سے بڑا ثواب ہے، اور بولنا سب سے بڑا گناہ بھی۔ جو آدمی اس حقیقت کو جان لے، اس کا بولنا بھی بامعنی ہوگا اور اس کا چپ رہنا بھی بامعنی۔

شہادت غیر حق

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ - ۱۸۷۸) مشہور سیاسی لیڈر ہیں۔ وہ ۱۹۱۰ سے ۱۹۳۰ تک برصغیر ہند کی سیاست پر چھائے رہے۔ وہ ہندستان کو انگریز کے سیاسی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے پرجوش واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

مولانا محمد علی کی آخر عمر میں لندن میں پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی۔ وہ سمندری سفر کرکے وہاں پہنچے۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو انھوں نے کانفرنس میں ایک "معرکۃ الآرا" تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ واحد چیز جس کو لینے کا میں نے تہیہ کر رکھا ہے وہ مکمل آزادی ہے۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں اس کو پسند کروں گا کہ میں باہر کے ایک ملک میں مرجاؤں جب کہ وہ ایک آزاد ملک ہو۔ اور اگر آپ ہم کو ہندستان میں آزادی نہیں دیتے تو مجھے یہاں انگلینڈ میں آپ کو ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی:

The only thing to which I am committed is complete independence, I will not go back to a slave country. I would prefer to die in a foreign country so long as it is a free country. And if you do not give us freedom in India, you will have to give me a grave here (in England).

مذہب آزادی کے اعتبار سے یہ الفاظ بڑے شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مذہب توحید کے اعتبار سے وہ بالکل بے قیمت ہیں۔ آزادی اور سیاست کے مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی قوم آزاد ہے یا محکوم۔ مگر مذہب توحید میں اس نوعیت کی تقسیم محض اضافی ہے۔

مذہب توحید (یا اسلام) کے نقطۂ نظر سے ساری اہمیت آخرت کی ہے۔ مومن کو سب سے زیادہ اس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ لوگ جہنم سے بچیں اور جنت کے راستہ کو اختیار کریں۔ قومی سیاست کو لے کر اٹھنے والے آدمی کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ آزادی اور محکومی کا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ جنت اور جہنم کا ہوتا ہے۔ وہ دوسری تمام باتوں کو نظر انداز کرکے اسی ایک بات پر اپنی ساری توجہ لگا دیتا ہے۔ کیوں کہ حقیقی مسئلہ صرف وہ ہے جو ابدی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ باقی تمام مسائل اضافی اور غیر حقیقی ہیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر شہادت غیر حق کی مثال ہے۔ انھوں نے انگریزوں

کے سامنے یہ گواہی دی کہ سیاسی محکومی سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے، حالاں کہ انھیں یہ گواہی دینا چاہئے تھا کہ جہنم کے عذاب سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انھوں نے انگریزوں کو بتایا کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز سیاسی آزادی ہے۔ حالاں کہ انھیں چاہئے تھا کہ انگریزوں کو یہ بتائیں کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز جنت ہے۔ اس لئے تم لوگ اپنے رب کی رحمت و مغفرت کے طالب بنو تاکہ تم موت کے بعد جنت میں داخل ہو:

وسارعوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضها السماوات والارض اعدت للمتقین (آل عمران ۱۳۳)	اور تم لوگ اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی سیاسی محکومی کے مسائل تھے۔ مگر وہ سیاسی محکومی سے نجات کا نعرہ لے کر نہیں اٹھے۔ بلکہ لوگوں کو توحید اور آخرت کی طرف پکارا۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں ایک بیرونی خاندان ہکسوس (Hyksos Kings) کی حکومت تھی۔ مگر حضرت یوسف نے اس بیرونی حکمرانی کو اشو نہیں بنایا جیسا کہ آپ کے بعد مصر کے قوم پرستوں نے بنایا۔ حتی کہ آپ اسی بیرونی بادشاہ کے تحت "خزائن ارض" کے شعبہ کے نگراں بن گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں فلسطین میں رومیوں کی حکومت تھی جو باہر سے آکر فلسطین پر قابض ہو گئے تھے۔ اس وقت فلسطین میں پیلاطس (Pontius Pilate) رومی گورنر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ مگر حضرت مسیح نے اس معاملہ کو اپنی تحریک کا اشو نہیں بنایا۔ آپ نے اپنی ساری توجہ اس پر مرتکز کر دی کہ لوگوں کو جہنم سے ڈرائیں اور انھیں جنت کی بشارت دیں۔

مومن کا کام یہ ہے کہ وہ توحید اور آخرت کو اپنی دعوت کا عنوان بنائے اور دوسری تمام چیزوں کو فیصلۂ الٰہی کے خانہ میں ڈال دے۔ مومن کا کام حق کی گواہی دینا ہے۔ اہل ایمان اگر دوسری دوسری چیزوں کو تحریک کا عنوان بنا کر اس کے لئے دھوم مچائیں تو یہ غیر حق کی شہادت کے ہم معنی ہوگا۔ اور اہل ایمان کے لئے جس خدائی نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ شہادت حق کے کام پر ہے۔ شہادت غیر حق کے کام پر انھیں ہرگز خدا کی نصرت ملنے والی نہیں۔

غیر خونی انقلاب

انسان انقلاب چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ چاہتا ہے کہ یہ انقلاب غیر خونی طور پر آئے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی بھی شخص غیر خونی انقلاب لانے پر قادر نہ ہو سکا۔ تمام معلوم انقلابات قتل اور خون کے جنگل کو پار کر کے ہی ظہور میں آئے ہیں۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب تمام معلوم تاریخ کا واحد انقلاب ہے جو حقیقی معنوں میں غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر تاریخ سے حذف کر دیا جائے تو نہ صرف غیر خونی انقلاب کی یہ بات افسانہ بن کر رہ جاتی ہے بلکہ اس کے بعد کوئی ایسی عملی مثال باقی نہیں رہتی جس کی روشنی میں کوئی انسان بعد کے زمانوں میں غیر خونی انقلاب کی بات سوچ سکے۔

فرانس میں جدید جمہوری انقلاب آیا۔ اس میں عوام اور شاہی نظام کے درمیان جو مقابلے ہوئے ان میں مرنے والوں کی تعداد ۱۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ بیسویں صدی میں روس میں اشتراکی انقلاب آیا۔ اس میں جو لوگ مرے اور مارے گئے ان کی حقیقی تعداد لامعلوم ہے۔ تاہم اندازہ ہے کہ ان کی تعداد کسی حال میں ایک کروڑ سے کم نہیں۔ امریکی انقلاب (۱۷۸۳-۱۷۷۵) میں نسبتاً کم آدمی مرے۔ تاہم اس میں بھی مقتولین کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ عالمی جنگوں کا معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ چنانچہ پہلی عالمی جنگ میں مختلف ملکوں کے ۷۵ لاکھ آدمی مارے گئے۔ اور دوسری عالمی جنگ میں چھ کروڑ سے زیادہ آدمی ہلاک ہوئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گئے تو ایک پورے ملک میں زبردست فکری اور اخلاقی انقلاب آچکا تھا۔ بوقت وفات ۱۲ لاکھ مربع میل کے رقبہ پر آپ کی حکومت قائم تھی۔ مگر اس پورے عمل میں صرف ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ جن میں مسلم مقتول ۲۵۹ تھے اور غیر مسلم مقتول ۷۵۹۔ یہ تعداد واقعہ کی نسبت سے اتنی کم ہے کہ وہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کو بلاشبہہ پورے معنوں میں غیر خونی انقلاب کہا جا سکتا ہے۔

ہر قائد غیر خونی انقلاب لانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر کوئی قائد غیر خونی انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں غیر خونی انقلاب لانے کے لئے خود اپنے آپ کو خون کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی وہ قیمت ہے جس کو دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ خونی انقلاب ٹکراؤ

کی زمین پر آتے ہیں ، اور غیر خونی انقلاب صبر کی زمین پر۔ اور صبر سے زیادہ مشکل کوئی کام اس دنیا میں ایک انسان کے لئے نہیں۔

صبر کی حقیقت جھٹکے کو اپنے آپ پر لینا ہے ، دوسروں پر انڈیلنے کے بجائے اپنے آپ پر سہنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑائی کے بغیر بھی جیت ہوتی ہے۔ مگر لڑائی کے بغیر جیتنے کے لئے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے ، لوگ اپنے آپ سے لڑ نہیں پاتے ، اس لئے وہ لڑائی کے بغیر لڑائی جیتنے والے بھی نہیں بنتے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم غیر خونی انقلاب لانے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔ اس کا اندازہ آپ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مکہ میں ۱۳ سال تک آپ کے مخالفوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ انھوں نے الفاظ کی چوٹ بھی دی اور پتھر اور نیزے کی چوٹ بھی۔ مگر اس طرح کے بے شمار واقعات پیش آنے کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بھی جوابی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ کسی سے کوئی لڑائی کی۔ آپ مخالفوں کے ہر وار کو یک طرفہ طور پر سہتے رہے۔ ان کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کے باوجود کبھی مشتعل نہیں ہوئے۔

اس کے بعد آپ نے یہ کیا کہ مکہ کو چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے گئے۔ آپ نے نہ اِس کے خلاف فریاد کی کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اپنے وطن اور اپنی جائداد کو چھوڑنا پڑ رہا ہے اور نہ اس کی پروا کی کہ اس طرح وطن چھوڑ کر جانے کی بنا پر لوگ آپ پر بزدلی اور فرار کا الزام لگائیں گے۔

مدینہ چلے جانے کے بعد مکہ کے لوگوں نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس وقت بھی آپ کی پالیسی یہ رہی کہ حتی الامکان جنگ سے اعراض کیا جائے۔ مثال کے طور پر احزاب کے موقع پر آپ نے خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان آڑ قائم کر دی۔ آپ نے صرف دفاع میں جنگ کی اور وہ بھی اس وقت جب کہ مڈبھیڑ کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ ایسی باقاعدہ جنگیں صرف تین ہیں جن میں آپ خود شریک رہے ہوں (بدر ، احد اور حنین) آپ کے زمانہ میں موتہ کی جنگ بھی ہوئی۔ مگر اس میں آپ خود شریک نہ تھے۔

آپ کو عرب میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہوا ، بلکہ اس "صلح" کے ذریعہ ہوا جس کو قرآن میں فتح مبین (الفتح ۱) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ کا واقعہ غیر خونی انقلاب لانے کے لئے اپنے آپ کو خون کرنے سے کم نہ تھا۔ آپ نے اپنی ذات کا خون کرنا گوارا کیا تاکہ باہر کی دنیا میں خون نہ بہایا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہوا بلکہ دعوت کے ذریعہ ہوا۔ اسی دعوت کے بند دروازوں کو کھولنے کے لئے آپ نے یہ کیا کہ دشمن سے اس کی اپنی شرائط کی بنیاد پر صلح کرلی۔ یہ صلح حدیبیہ تھی جس کو قرآن میں کھلی فتح (انا فتحنا لك فتحاً مبينا) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ اس بات کا ایک تاریخی ثبوت ہے کہ جنگ کے مقابلہ میں امن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی یک طرفہ صلح کے ذریعہ اسی عظیم حقیقت کا عملی مظاہرہ فرمایا، تاہم یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس قسم کے ایک واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے صبر کی ضرورت ہے، اور اس دنیا میں بلاشبہ صبر سے زیادہ مشکل قربانی اور کوئی نہیں۔

دعوتی کوتاہی

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب اسلام کا ظہور ہوا، اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت عیسائیوں کی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے دو بڑے حصے تھے۔ ایک مغربی حصہ اور دوسرا مشرقی حصہ۔ مغربی حصہ (یورپ) کو رومن ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت روم (اٹلی) تھا۔ مشرقی حصہ (ایشیا اور افریقہ) کو بازنطینی ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت قسطنطنیہ (ترکی) تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں شام کی سرحد پر رومیوں سے مسلمانوں کا فوجی ٹکراؤ شروع ہوا۔ اس ٹکراؤ میں مسلمان کامیاب رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے مسیحی سلطنت کے مشرقی حصہ کو تقریباً پورا کا پورا فتح کر لیا جس میں ان کے مقدس مذہبی مقامات (شام اور فلسطین) بھی شامل تھے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے ایک طرف سسلی اور اسپین کی جانب سے پیش قدمی شروع کی اور بڑھتے بڑھتے فرانس کے اندر داخل ہوگئے۔ دوسری طرف وہ ترکی کی جانب سے مشرقی یورپ میں داخل ہوئے۔ اور آگے بڑھتے ہوئے ویانا (آسٹریا) تک جا پہنچے۔ اس طرح انھوں نے مسیحی (رومی) سلطنت کے مشرقی بازو پر تقریباً پورا کا پورا قبضہ کر لیا۔ اور اسی کے ساتھ اس کے مغربی بازو کے بھی ایک حصہ کو کاٹ لیا۔

مشہور صلیبی لڑائیاں مغربی عیسائیوں کی طرف سے ان کی اسی شکست کا ردعمل تھیں۔ عیسائی دنیا ایک غیر قوم کے ہاتھ سے اپنی اس ذلت اور شکست کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے متحد ہو کر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا۔

یہ صلیبی لڑائیاں (Crusades) وقفہ وقفہ سے تقریباً دو سو سال (۱۰۹۵ - ۱۲۷۱ء) تک جاری رہیں۔ اس درمیان میں عیسائیوں کو وقتی اور جزئی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں بالآخر مسلمانوں نے فتح پائی۔ اور مسیحیوں کو ان کی سابقہ دنیا سے باہر نکال دیا گیا۔ پیرس سائیکلوپیڈیا *(Pears Cyclopaedia)* نے اس سلسلے میں بہت بامعنی تبصرہ کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed in these enterprises, and when all was done Jeruselem remained in the possession of the 'infidels'

لاکھوں جانیں اور بے شمار دولت ان مہموں میں قربان کردی گئی۔ اور جب سب کچھ ہو چکا تو یروشلم بدستور "بدویوں" کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

یہ واقعہ جو آٹھ سو سال پہلے عیسائیوں کے ساتھ پیش آیا تھا، ٹھیک یہی واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ مسلمانوں کی "دو سو سالہ" قربانیوں کے باوجود "یروشلم" انھیں لوگوں کے قبضہ میں ہے جن کو مسلمان سب سے زیادہ غیر مستحق سمجھتے ہیں۔

مسیحی قومیں صلیبی جنگوں میں تو کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ کی استعماری جنگ میں انھوں نے پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ پچھلی صدیوں میں انھوں نے مسلمانوں کی تمام سلطنتوں کو مغلوب کرلیا اور پھر ساری دنیا میں ان کے اوپر براہ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی اور تہذیبی غلبہ قائم کرلیا۔

اس کے جواب میں مسلمانوں نے پورے عالم اسلام میں مغربی قوموں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ تاہم دو سو سال (تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری) کی لڑائیوں اور مقابلوں کے بعد بھی صورت حال یہ ہے کہ مسیحی اقوام کا غلبہ بدستور قائم ہے۔ "یروشلم" اب بھی دشمنان اسلام کے قبضہ میں ہے۔

بے پناہ کوششوں کے باوجود اس ناکامی کی وجہ دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنا ہے جو امت مسلمہ کا اصل منصبی فریضہ ہے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر مسلمان نصرت خداوندی کے مستحق ہوتے ہیں۔ مسلمان جب تک دعوت الی اللہ کے کام کے لئے نہ کھڑے ہوں گے ان کی تمام کوششیں حبط اعمال کا شکار ہوتی رہیں گی۔ ان کا وہی حال ہوگا جو بائبل میں بنی اسرائیل کے لئے بیان کیا گیا تھا:

زرعتم کثیرا ودخلتم قلیلا۔ تاکلون ولیس الی الشبع۔ تشربون ولا تروون۔ تکتسون ولا تدفأون۔ والآخذ اجرۃ یاخذ اجرۃ لکیس منقوب (حجی، الاصحاح الاول)

تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا، پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو، پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو، پر پیاس نہیں بجھتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو، پر گرم نہیں ہوتے۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو (حجی، باب اول)

کامیابی کی شرط

جاپان آج متفقہ طور پر اقتصادی سپر پاور (Economic superpower) کی حیثیت رکھتا ہے۔ روایتی طور پر فوجی طاقت کسی قوم کو سپر پاور بناتی تھی۔ مگر جاپان نے اپنی مثال سے ثابت کیا کہ اقتصادی ترقی کے ذریعہ بھی ایک قوم سپر پاور بن سکتی ہے۔ مزید یہ کہ فوجی طاقت کے بل پر سپر پاور بننے والی قوم ایک حد کے بعد اپنی طاقت کھو دیتی ہے۔ جب کہ اقتصادی سپر پاور کے لیے اس قسم کی کوئی حد نہیں۔

جاپان اقتصادی سپر پاور کیسے بنا۔ وہ نعروں کی سیاست یا مطالبات کے ہنگاموں کے ذریعہ سپر پاور نہیں بنا۔ بلکہ خاموش عمل کے ذریعہ سپر پاور بنا۔ اس خاموش عمل کا اہم ترین جزء یہ تھا کہ پہلے اس نے اپنے لیے چھوٹی حیثیت کو تسلیم کیا، اس کے بعد اس کو بڑی حیثیت ملی۔ ٹوکیو کے ایک مقیم صحافی مسٹر سبھاش چکرورتی کا ایک جائزہ ٹائمس آف انڈیا (۲۷ اپریل ۱۹۹۰) میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک جزء یہاں قابل نقل ہے:

Japan, having long recognised the U.S. as the most important external actor in Asia, is seeking to share power and influence with it without compromising Japan's own self-interests or ambitions.

جاپان لمبی مدت تک امریکہ کی یہ حیثیت تسلیم کرتا رہا کہ وہ ایشیا میں سب سے زیادہ اہم خارجی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد اب وہ وقت آیا ہے کہ جاپان اپنے مفادات یا اپنے حوصلوں کے معاملہ میں مصالحت کیے بغیر امریکہ کے ساتھ طاقت اور اثر میں حصہ دار بننے کی کوشش کرے (صفحہ ۸)

یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا اصول ہے۔ یہاں بڑا بننے کے لیے پہلے چھوٹا بننا پڑتا ہے۔ غلبہ حاصل کرنے کے لیے پہلے مغلوبیت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہاں آگے بڑھنا اس کے لیے مقدر ہے جو آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے ہٹنے کے مرحلہ کو برداشت کرے۔

اس دنیا میں کھونا پہلے ہے اور پانا اس کے بعد۔

تہذیب کی واپسی

جوائس برادرس (Dr Joyce Brothers) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں پی ایچ ڈی کیا۔ وہ نفسیاتی ڈاکٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرتی ہیں۔ ان کی تازہ کتاب کا نام کامیاب خاتون (The Successful Woman) ہے۔

جوائس برادرس کا ایک مضمون ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ (اپریل ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کے قصے لکھے ہیں جو ان سے شادی شدہ زندگی کے بارہ میں مشورہ کرنے کے لیے ملے۔ انھوں نے اپنے تجربات کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

شادی شدہ جوڑے مجھ سے جو سوالات کرتے ہیں، ان میں حالیہ برسوں میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ دس سال پہلے یہ حال تھا کہ جب میاں بیوی میں تعلقات کشیدہ ہوتے تو پہلا سوال یہ کیا جاتا تھا کہ مجھے طلاق چاہیے۔ مگر آج جو مرد اور عورت مجھ سے ملتے ہیں وہ زیادہ تر اس بات کے خواہش مند رہتے ہیں کہ ازدواجی تعلق کو کس طرح برقرار رکھا جائے:

Many of the questions couples ask me have changed in recent years. A decade ago, the first reaction when a marriage hit rough times was, "I want a divorce." But today the men and women I talk to are more likely to want permanent relationships (p.61).

مغربی دنیا میں اس سے پہلے آزادی کو خیر مطلق سمجھ لیا گیا تھا۔ مرد اور عورت مکمل آزادی کو اپنا حق سمجھنے لگے۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ کامل آزادی آخر کار کامل خواہش پرستی تک پہنچتی ہے، اور کامل خواہش پرستی کی بنیاد پر کبھی کوئی اچھا سماج نہیں بنایا جاسکتا۔

اس تلخ تجربہ کے بعد اب کامل آزادی کے بجائے محدود آزادی کا نظریہ اختیار کیا جانے لگا ہے۔ اس کی ایک مثال اوپر کے جائزہ میں نظر آتی ہے۔ کامل آزادی نے گھروں کو اجاڑا اور زندگی کو سکون سے محروم کر دیا۔ اب انسان یہ ماننے پر مجبور ہو رہا ہے کہ گھر کی آبادی اور پرسکون زندگی کو حاصل کرنے کے لیے محدود آزادی کے طریقہ کو اختیار کرنا پڑے گا۔

آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ زیادہ دیر تک فطرت سے منحرف رہے۔

اسلام کی دعوت بدلتی ہوئی دنیا میں

خدا کے جن قوانین کے تحت موجودہ دنیا چلائی جا رہی ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ——— اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، ڈھا دئے جاتے۔ اور خدا ضرور اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے۔ بے شک خدا زبردست ہے، زور والا ہے (۲۲/۴۰)

خدا کے اس قانون کا اظہار انسانی زندگی میں مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ مثلاً اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اس کا ایک نمایاں اظہار اس طرح ہوا کہ وقت کی دو بڑی جابرانہ سلطنتوں ——— رومی شہنشاہیت اور ساسانی شہنشاہیت کو توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد اشاعت حق کے جو آزادانہ مواقع کھلے، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام اس وقت کی آباد دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں پھیل گیا۔

یورپ میں صنعتی دور آنے کے بعد نوآبادیاتی نظام (Colonialism) دنیا پر چھا گیا۔ اس نے دوبارہ، اگرچہ نسبتاً کم تر شدت کے ساتھ، انسانی دنیا میں جبر کی صورت حال پیدا کر دی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا۔ دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) پیش آئی۔ اس کے نتیجہ میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتیں بے حد کمزور ہو گئیں اور آخر کار اس نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون دفع کا ایک نمایاں اظہار حالیہ برسوں (۹۰ - ۱۹۸۹) میں ہوا ہے۔ اس بار اس قانون کا نشانہ کمیونسٹ ایمپائر تھی۔ کمیونسٹ روس میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ بظاہر ناقابل شکست سوویت ایمپائر ٹوٹ گئی۔ اس طرح اشاعت حق کی آخری رکاوٹ کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ بظاہر اب اس قسم کا نظام جبر دوبارہ دنیا میں آنے والا نہیں۔

مصلحت خداوندی

موجودہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا لازمی تقاضا ہے کہ دنیا میں آزادی کا ماحول ہو۔ یہاں ہر آدمی کے لئے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر

(الکہف ۲۹) کا موقع باقی رہے۔

ایسی حالت میں دنیا کے اندر جبر کا نظام قائم کرنا براہ راست مصلحت خداوندی کے خلاف ہے۔ کوئی شخص جب کسی علاقے میں جبر کا نظام قائم کرتا ہے تو گویا وہ خدا کے قائم کئے ہوئے نظام میں مداخلت کرتا ہے۔ خدا ایسے شخص یا گروہ کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ وہ ایسے لوگوں سے طاقت چھین کر انھیں باہر پھینک دیتا ہے۔

کچھ لوگ جہاد (بمعنی قتال) کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس کا مقصد موانع دعوت کو ہٹانا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ جہاد (بمعنی قتال) صرف دفاع کے لئے ہوتا ہے۔ جہاں تک موانع دعوت کا تعلق ہے وہ خود خدا کی طرف سے ہٹائے جاتے ہیں۔ موانع دعوت خدا کا مسئلہ ہے، وہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ ہمارا مسئلہ دعوت پہنچانا ہے، اگر ہم دعوت پہنچانے کا کام کریں تو خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ضرور موانع دعوت کا خاتمہ کر دے گا۔

بائبل کی پیشین گوئی

بائبل میں اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ــــــ وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں (حبقوق ۳ : ۶) :

وقف وقاس الارض ۔ نظر فرجف الامم ودُكّتِ الجبالُ الدهرية وخسفت آكامُ القِدَم ۔ مسالك الازل له (حبقوق ۳ : ۶)

اس پیشین گوئی کا تعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں " ازلی پہاڑ " اور " قدیم ٹیلہ " سے مراد رومی اور ساسانی سلطنتیں ہیں۔ یہ سلطنتیں جبر پر قائم تھیں۔ انھوں نے قدیم زمانہ میں وہ چیز پیدا کر رکھی تھی جس کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے۔ اور جس کو ہنری پیرین (Henri Pirenne) نے شاہانہ مطلقیت (Imperial absolutism) سے تعبیر کیا ہے۔ اس شاہانہ مطلقیت نے قدیم زمانہ میں دعوت حق کے تمام مواقع ختم کر دئے تھے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اللہ تعالیٰ نے عرب طاقت کے ذریعہ ان شہنشاہیتوں کو توڑ دیا۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار آزادانہ غور وفکر کا دور شروع ہوا۔ اس طرح وہ حالات پیدا

ہوئے جب کہ اہل حق آزادانہ طور پر خدا کے دین کی تبلیغ کریں اور لوگ آزادانہ غور و فکر کے تحت اس کو قبول کر لیں۔

دور جدید کا نظام جبر

موجودہ زمانہ میں مذکورہ قسم کی شاہانہ مطلقیت دوبارہ نئی صورت میں قائم ہو گئی۔ یہ وہ نظام جبر ہے جو کمیونسٹ نظریہ کے تحت سوویت یونین میں ۱۹۱۷ میں قائم ہوا۔ یہ جابرانہ نظام دوبارہ شدید تر صورت میں دعوت حق کی راہ میں مانع بن گیا۔ بیسویں صدی کے اس نظام جبر میں تاریخ کی سب سے بڑی طاقت کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ خدا اور مذہب کو آخری حد تک انسانی زندگی سے مٹا دیا جائے۔

مگر دوبارہ خدا کا قانون دفع حرکت میں آیا۔ خدا نے اپنی برتر مداخلت کے ذریعہ اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سوویت یونین، ٹائم میگزین ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ کے لفظوں میں، سوویت ڈس یونین (Soviet Disunion) بن گیا۔

مارکسزم کا خاتمہ

۱۹۵۸ میں راقم الحروف نے ایک کتاب لکھی تھی، اس کا ٹائٹل تھا: مارکسزم، تاریخ جس کو رد کر چکی ہے۔ اس وقت لوگوں کو یہ ٹائٹل بڑا عجیب معلوم ہوا تھا، مگر آج ۱۹۹۰ میں ساری دنیا کے اخبارات و رسائل میں ایسے مضامین چھپ رہے ہیں جن کی سرخی اس قسم کی ہوتی ہے:

The Collapse of Socialist system
Soviet Empire is Crumbling
The End of Communist History
Marxism is Over
Total Failure of Communism
Fragmented Empire of the U.S.S.R.

ہندستان ٹائمس (یکم جنوری ۱۹۹۰) نے کسی مغربی اخبار سے ایک کارٹون نقل کیا تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک ویران قبرستان ہے۔ اس کے ایک طرف کارل مارکس کی قبر بنائی گئی ہے۔ قبر کے اوپر ایک پتھر لگا ہوا ہے۔ اس پتھر پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

Marx: Finally buried 1989

اسی طرح ہندستان کے دوسرے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۳ مئی ۱۹۹۰) نے اپنے پہلے صفحہ پر ایک کارٹون چھاپا تھا۔ اس میں ایک گلوب ہے جس میں دنیا کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ اس گلوب کے سامنے روسی لیڈر مسٹر گورباچیف آتشیں شیشہ (magnifying glass) لئے ہوئے کھڑے ہیں اور اس کے نقشہ میں اپنا ملک تلاش کر رہے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی بیوی سے کہہ اٹھتے ہیں کہ رئیسہ، وہ یہاں ہے، میں نے اس کو پالیا، سوویت یونین :

Raisa, It's here! I found it – the Soviet Union!

سوویت یونین میں ہونے والے اس انقلاب کا کریڈٹ ٹائم میگزین نے میخائیل گورباچیف کو دیا ہے۔ اس نے اپنا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۰ استثنائی طور پر گورباچیف نمبر کے طور پر نکالا ہے اور گورباچیف کو دہے کی شخصیت (Man of the Decade) قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ گورباچیف نے دنیا کو بدل دیا :

Gorbachev has transformed the world (p. 14).

اس میں شک نہیں کہ سوویت یونین میں جو انقلابی واقعہ ہوا، اس کو ظہور میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے گورباچیف کو وسیلہ بنایا ہے۔ اس معاملہ میں زیادہ بڑے پیمانہ ان کا وہی درجہ ہے جو فرانس کے جنرل ڈیگال کا تھا۔ ڈیگال نے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے فرانس کے افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اسی طرح میخائیل گورباچیف نے اندرونی اور بیرونی حالات کا اعتراف کرتے ہوئے سوویت روس میں انقلاب کے بند دروازے کھول دئے۔ اس سلسلہ میں ٹائم کا یہ ریمارک بہت بامعنی ہے کہ گورباچیف ایک ماہر سیاست داں ہیں۔ وہ بہت سے ملکوں میں الکشن جیت سکتے ہیں مگر غالباً خود اپنے ملک میں نہیں :

A master politician, Gorbachev could win election in many countries, but probably not his own.

سوویت روس میں لائے جانے والے اس انقلاب کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک اہم پہلو وہ ہے جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ کیمونسٹ حکومت کے قیام (۱۹۱۷) کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح اسلام بھی وہاں محبوس ہو کر رہ گیا تھا

ہزاروں مسجدیں اور مدرسے بند کر دئے گئے۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ اسلامی تعلیم یا اسلامی سرگرمیاں جرم قرار پا گئیں۔ مگر نئے انقلاب نے دوبارہ سوویت روس میں اسلامی سرگرمیوں کے دروازے کھول دئے ہیں۔

اسلام کا دور

سوویت روس میں عبادت خانے بند کر دئے گئے تھے۔ مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے ایک مستقل محکمہ قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سوویت روس سے مکمل طور پر مذہب کے خاتمہ کی تدبیریں اختیار کرے۔ مگر آج یہ تمام چیزیں عملاً ختم ہو چکی ہیں۔

سوویت روس میں اب ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی ہیں۔ اسلامی لٹریچر شائع کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۰ میں وہاں سے ایک اسلامی جریدہ "نور الاسلام" کے نام سے نکالا گیا ہے۔ روسی حکومت کی منظوری کے تحت خود روس کی ہوائی کمپنی ایروفلاٹ نے قرآن کے ایک ملین نسخے جدہ سے ماسکو پہنچائے ہیں، جب کہ اس سے پہلے قرآن کا ایک نسخہ بھی روس کے اندر لے جانا ممنوع تھا۔

کمیونسٹ انقلاب کے بعد سوویت روس میں حج کا سفر بند کر دیا گیا تھا۔ اب خود سوویت یونین کے صدر میخائیل گورباچیف نے روسی ایئر لائن ایروفلاٹ کو ہدایت کی ہے کہ وہ روسی حاجیوں کو عرب پہنچانے کا خصوصی انتظام کرے اور اس مقصد کے لئے ماسکو، تاشقند، باکو، تاتار، قازان اور دوسرے بڑے روسی شہروں سے جدہ تک براہ راست پروازیں جاری کرے۔ اسی کے ساتھ گورباچیف نے روسی وزیر خارجہ سے کہا ہے کہ سوویت روس سے جو مسلمان حج کے لئے جانا چاہیں، ان کے لئے بسہولت ویزا جاری کیا جائے۔

سوویت روس میں اسلام کے لئے جو نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں، ان کے سلسلہ میں یہ چند باتیں بطور مثال ہیں نہ کہ بطور حصر۔ انھیں چند مثالوں سے بقیہ باتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کارل مارکس نے اپنی ایک تحریر میں مذہب کے خلاف نہایت سخت ریمارک دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ مذہب عوام کی افیون ہے:

Religion is the opium of the people.

مگر آج خود کیونسٹ روس میں ایسے اہل علم پیدا ہو چکے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مارکسزم خود بدترین قسم کی ذہنی افیون تھی۔ مارکس خود اس افیون میں مبتلا ہوا اور دوسرے بہت سے لوگوں کو اس میں مبتلا کیا۔ اسٹالن نے روس کے ۲۵ ملین انسانوں کو یا تو ہلاک کر دیا یا انھیں سخت ترین سزائیں دیں۔ اس کے باوجود وہ کیونسٹ نظام کو مستحکم نہ کر سکا۔

"ٹائم میگزین نے اپنے شمارہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ میں سوویت روس کے بارہ میں ایک مفصل رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نئے انقلاب کے بعد اب روس میں مذہب کی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کا بھی تفصیلی حال درج کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ روس کے تقریباً ۵۵ ملین مسلمان نئی مذہبی رواداری کا فائدہ حاصل کر رہے ہیں:

Some 55 million Soviet Muslims enjoy the fruits of new religious tolerance.

اس باتصویر رپورٹ کی سرخی نہایت بامعنی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ـــــ کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے:

Karl Marx makes room for Muhammad.

کیسا عجیب ہے یہ انقلاب جو تاریخ انسانی میں پیش آیا ہے۔

آزاد دنیا میں دورِ خاتمیت

یہ وہ صورت حال ہے جو دوسری دنیا (second world) میں پیش آئی۔ اسی طرح پہلی دنیا (first world) میں بھی ایک اور انداز سے دور رس تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور یہ تبدیلیاں بھی عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں۔ ان تبدیلیوں نے مغربی دنیا میں موانع دعوت کا حصار توڑ کر وہاں دعوت کے نئے وسیع تر امکانات کھول دئے ہیں۔

امریکہ کے دانشور طبقہ میں پچھلے چند برسوں میں ایک نیا فکر پیدا ہوا ہے۔ اس فکر کو خاتمیت (endism) کا نام دیا گیا ہے۔ "آزاد دنیا" نے حیرت انگیز طور پر اپنی تہذیب میں اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔

لامحدود آزادی کا نظریہ حقائق فطرت سے ٹکرا گیا۔ صنعتی ترقی کے مسائل نے دنیا میں جنت

تعبیر کرنے کے خواب کو برباد کر دیا۔ جاپان کی غیر متوقع اقتصادی طاقت نے مغرب کی فوجی طاقت کو غیر موثر بنا دیا۔ انسانی ساخت کے تمام نظریات اپنے تجربہ میں غیر معتبر قرار پاگئے۔ مادی ترقیاں انسان کی روح کو مطمئن کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ وغیرہ

ناکامیوں کی اس فہرست میں سب سے اہم اور دوررس نتائج والی ناکامی وہ ہے جو فکری سطح پر پیش آئی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اہل مغرب نے یہ یقین کر لیا تھا کہ ان کی سائنس ان کے لئے الہامی مذہب کا بدل ہے۔ سائنس فکری اعتبار سے انھیں وہ سب کچھ دے سکتی ہے جس کی امید مذہب سے کی جاتی ہے۔ مگر موجودہ صدی کے آخر میں پہنچ کر اصل سائنس نے آخری طور پر اپنے اس یقین کو کھو دیا ہے۔ اب انسان دوبارہ وہاں کھڑا ہے جہاں اس کو فکری اعتقاد اور نظریاتی یقین کے لئے دوبارہ اسی چیز کی ضرورت ہے جس کو مذہب کہا جاتا ہے۔

سائنس کی اس ناکامی پر موجودہ زمانہ میں کثیر تعداد میں کتابیں چھپی ہیں۔ ان کتابوں کا مشترک خلاصہ یہ ہے کہ سائنس کی تمام تحقیقات نے اس کو اس مقام پر پہنچایا ہے کہ انسان جو کچھ جاننا چاہتا ہے، وہ اس کو سائنسی مطالعہ کے ذریعہ نہیں جان سکتا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں انسان نے "انسائیکلوپیڈیا آف نالج" چھاپی تھی، اب موجودہ صدی کے خاتمہ پر وہ قاموس جہالت (Encyclopaedia of Ignorance) چھاپ رہا ہے۔

یہاں میں ایک کتاب کا حوالہ دوں گا جو ۱۹۸۹ میں نیو یارک سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W Hawking) ہیں۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کے پروفیسر ہیں۔ میتھمیٹکس کی یہ چیر نیوٹن کے نام پر قائم کی گئی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آئن سٹائن کے بعد وہ نظریاتی طبیعیات میں سب سے زیادہ ممتاز سائنس داں ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب وقت کی مختصر تاریخ (A Brief History of Time) کو ان سطروں سے شروع کیا ہے:

ایک مشہور سائنس داں (کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ برٹرینڈرسل) نے ایک بار فلکیات پر ایک دامی لکچر دیا۔ اس نے بتایا کہ زمین کس طرح سورج کے گرد گھومتی ہے اور پھر سورج کس طرح کہکشاں کے مرکز کے گرد گھومتا ہے جو کہ بہت سے ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ لکچر کے آخر میں ایک چھوٹی بوڑھی عورت کمرہ کے پچھلے حصہ سے اٹھی اور کہا۔ جو کچھ تم نے ہمیں بتایا وہ لغو ہے۔ زمین درحقیقت ایک

چپٹی پلیٹ کی طرح ہے اور وہ ایک بڑے کچھوے کی پشت پر ٹھی ہوئی ہے۔ سائنس داں برتری کے احساس کے تحت مسکرایا اور پھر کہا کہ یہ کچھوا کس چیز کے اوپر ہے۔ خاتون نے کہا کہ نوجوان، تم بہت چالاک ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کچھوے کے نیچے کچھوا ہے، اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے تک چلا گیا ہے۔

بہت سے لوگ دنیا کی اس تصویر کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ یہاں کچھوؤں کا ایک لامتناہی کھمبا قائم ہے۔ مگر ہم کیوں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا علم اس سے بہتر ہے۔ ہم دنیا کی بابت کیا جانتے ہیں اور کس طرح جانتے ہیں۔ دنیا کہاں سے آئی اور وہ کہاں جا رہی ہے۔ کیا دنیا کا ایک آغاز ہے، اور اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے کیا پیش آیا۔ وقت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا وہ کبھی ختم ہو جائے گا۔ علم طبیعیات کے حالیہ انکشافات جو نئی ٹکنالوجی کے ذریعہ ممکن ہوئے ہیں، وہ ان میں سے بعض سوالات کا کچھ جواب دیتے ہیں۔ یہ جواب آئندہ اتنے ہی بدیہی دکھائی دے سکتے ہیں جتنا کہ زمین کا سورج کے گرد گھومنا یا شاید وہ اتنے ہی مضحکہ خیز نظر آئیں جتنا کہ کچھوؤں کا کھمبا۔ صرف وقت ہی اس کے بارہ میں کچھ بتا سکتا ہے:

A well-known scientist (Some say it was Bertrand Russell) once gave a public lecture on astronomy. He described how the earth orbits around the sun and how the sun, in turn, orbits around the center of a vast collection of stars called our galaxy. At the end of the lecture, a little old lady at the back of the room got up and said: "What you have told us is rubbish. The world is really a flat plate supported on the back of a giant tortoise." The scientist gave a superior smile before replying, "What is the tortoise standing on?" "You're very clever, young man, very clever," said the old lady. "But it's turtles all the way down!"

Most people would find the picture of our universe as an infinite tower of tortoises rather ridiculous, but why do we think we know better? What do we know about the universe, and how do we know it? Where did the universe come from and where is it going? Did the universe have a beginning, and if so, what happened before then? What is the nature of time? Will it ever come to an end? Recent breakthroughs in physics, made possible in part by fantastic new technologies, suggest answers to some of these longstanding questions. Someday these answers may seem as obvious to us as the earth orbiting the sun or perhaps as ridiculous as a tower of tortoises. Only time (whatever that may be) will tell.

ایک اور مثال

اسٹفن ہاکنگ نے اپنی کتاب میں مختلف پہلوؤں سے بحث کرکے دکھایا ہے کہ کائنات نے بے شمار امکانی ماڈلوں میں سے اسی ایک ماڈل کو اختیار کیا ہے جو انسان جیسی مخلوق کی زندگی ان

ترقی کے لئے ضروری تھا۔" کائنات ویسی کیوں ہے جیسی ہم اسے دیکھتے ہیں"۔ ان کے الفاظ میں، اس سوال کا جواب بالکل سادہ ہے۔ اگر کائنات کسی اور ڈھنگ کی ہوتی تو ہم یہاں موجود ہی نہ ہوتے:

"Why is the universe the way we see it?" The answer is then simple: If it had been different, we would not be here! (p. 131).

انھوں نے بگ بینگ (big bang) نظریہ کا حساب کرکے بتایا ہے کہ اس میں بے شمار ایسے پہلو ہیں جن کے متعلق ماننا پڑتا ہے کہ وہ کسی ناقابل توجیہہ سبب (unexplained reason) کی بنا پر ہوا۔ کیوں کہ معلوم مادی قوانین میں اس کی توجیہہ موجود نہیں۔

مثال کے طور پر انھوں نے بتایا ہے کہ بگ بینگ کے بعد کائنات کی جو توسیع شروع ہوئی اور جو اب تک مسلسل جاری ہے، اس کی توسیع کی شرح (rate of expansion) انتہائی حد تک حسابی (well-calculated) ہے۔ اس توسیع کی شرح رفتار میں اگر ایک سکنڈ کے جزء (fraction) کے بقدر بھی فرق ہوتا تو کائنات اب تک منہدم ہو چکی ہوتی۔

اس قسم کی مختلف تفصیلات دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ بتانا بے حد مشکل ہے کہ کائنات اس خاص طریقہ سے کیوں شروع ہوئی، سوا اس کے کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایک خدا کا عمل ہے جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق پیدا کر کے یہاں رکھے:

It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

کائنات کا سائنٹفک ماڈل تقاضا کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا مانا جائے۔ خدا کو نہ ماننے کی صورت میں یہ ماڈل ناقابل فہم بن کر رہ جاتا ہے۔

سائنس کی تصدیق

موجودہ زمانہ عقل (reason) کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو عقل کے معیار پر پرکھ کر اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مگر آج کے انسان نے جب موجودہ مذاہب کو عقل کے معیار پر پرکھا تو اس نے پایا کہ تمام مذاہب کی کتابیں غیر عقلی تعلیمات سے بھری ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر بائبل میں زمین پر انسان کے ظہور کی جو تاریخ دی گئی ہے، اس کے لحاظ سے حساب لگایا جائے تو ۱۹۹۱ میں زمین پر انسان کے ظہور کی مدت ۵۷۵۲ سال ہوگی۔ سائنسی نقطۂ نظر سے انسانی عمر کا یہ تعین مضحکہ خیز ہے۔ مگر اس قسم کی غیر علمی اور غیر تاریخی باتیں تمام مذہبی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ قرآن کا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی کوئی مثال مطلق طور پر موجود نہیں۔ اس موضوع پر مختلف کتابیں چھپ چکی ہیں۔ فرانس کے ڈاکٹر موریس بوکائی (Dr Maurice Bucaille) کی مشہور کتاب *(The Bible, the Qur'ān and Science)* خاص اسی موضوع پر ہے جو پہلی بار فرانسیسی زبان میں ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب تک ۱۰ زبانوں میں اس کے ترجمے کئے جا چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بکائی کی دوسری کتاب ۱۹۸۴ میں پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ ۲۰۰ صفحہ پر مشتمل اس کتاب کے انگریزی اڈیشن کا نام یہ ہے :

What is the Origin of Man?

ڈاکٹر موریس بوکائی نے اس کتاب میں خاص طور پر ان آیات کا مطالعہ کیا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ رحم مادر کے اندر انسان کی ابتدائی تخلیق کس طرح ہوتی ہے۔ مثلاً : اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک علقہ کی شکل دی۔ پھر علقہ کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا (۲۳/۱۲-۱۴)

ڈاکٹر بوکائی نے دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے الہام کا زمانہ ۶۱۰ سے ۶۳۲ء تک ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشرق و مغرب میں ہر طرف علمی تاریک خیالی (scientific obscurantism) کا ذہن چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس دور کی تمام کتابوں میں اس زمانہ کے غیر علمی خیالات کا انعکاس پایا جاتا ہے۔

مگر قرآن حیرت انگیز طور پر اس عمومی تاثر سے مستثنیٰ ہے۔ قرآن میں اپنے زمانہ کی کوئی ایک بھی علمی

راہ نہ پا سکی۔ حتی کہ قرآن اگر اس زمانہ کی کسی رواجی بات کو نقل کرتا ہے تو وہ صرف اس کے
جزاء کو نقل کرتا ہے، اور اس کے غیر صحیح اجزاء کو حذف کرتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی نے اس سلسلہ میں ان آیتوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے جن کا تعلق انسان
پائش اور رحم مادر میں اس کے ارتقاء سے ہے۔ انھوں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ انسان کی
ش کے بارہ میں قرآن کے جو بیانات ہیں وہ حیرت انگیز طور پر جدید تحقیقات کے عین مطابق
وہ تحقیقی نتائج جو پہلی بار صرف بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئے ہیں، وہ ۱۴
ال پہلے کی کتاب قرآن میں کیوں کر موجود ہیں، یہ ظاہرہ (phenomenon) انتہائی حد تک
ہے۔

ڈاکٹر بکائی اس قسم کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم کی تاریخ ہم کو اس نتیجہ
پہنچاتی ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی موجودگی کی کوئی انسانی توجیہ ممکن نہیں:

> The history of science leads us to conclude that there can be no human explanation for the existence of these verses in the Qur'ān (p. 188).

اس طرح کی کثیر مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ علم کا دریا (river of knowledge) جو
کو انیسویں صدی میں الحاد کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا تھا، اب بیسویں صدی میں وہ اپنا رخ
ر مذہب کی طرف جارہا ہے۔ مذہبی عقائد عین سائنٹفک سطح پر ثابت شدہ حقائق بنتے جارہے
مذہب آج خالص سائنس کی روشنی میں، سب سے زیادہ قابل فہم اور قابل اعتبار آئیڈیالوجی
ا ہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ مذہب کی صداقت کا ثابت ہونا اسلام کی صداقت کا ثابت
ہے۔ کیوں کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب تبدیلی اور اضافہ کی بنا پر اپنا استناد کھو چکے ہیں۔ اب
نا میں صرف اسلام ہے جس کو مستند اور قابل قبول مذہب کا درجہ دیا جاسکے۔

سائنس کی طرف سے مایوسی

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کی سائنسی دریافتوں نے انسان کو علم سے زیادہ بے علمی تک
ہے۔ مثلاً بلیک ہول کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات کا صرف ۳ فی صد حصہ ہمارے لئے

قابل مشاہدہ ہے۔ بقیہ ۹۰ فی صد حصہ روشنی خارج نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے لئے قابل مشاہدہ ہی نہیں۔

یہ سادہ طور پر مادہ (mass) کی بات ہے۔ جہاں تک مادی مشاہدات کی توجیہہ کا سوال ہے تو اس معاملہ میں سائنس نے ہمیں کسی بھی یقینی جواب تک نہیں پہنچایا ہے۔ ہر چیز جس کو آدمی جاننا چاہتا ہے، بہت جلد وہ دیکھتا ہے کہ اس کی حد (limit) آگئی۔ اور اس کے آگے معاملہ کو جاننا یا سمجھنا آدمی کے لئے موجودہ حالت میں ناممکن ہے۔

ان تجربات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں آدمی نے سائنس کے بارہ میں اپنے یقین کو کھو دیا ہے۔ کیونسٹ دنیا کا مسئلہ اگر جبر تھا، تو آزاد مغربی دنیا کا مسئلہ ذہنی گھمنڈ (intellectual arrogance) تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو سائنس کی محدودیت (Limitations) بتا کر ان کے علمی گھمنڈ کو چور چور کردیا۔

یہاں میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔ اس نے "ہسٹری آف سائنس" کے آرٹیکل کے تحت لکھا ہے کہ ابھی حال تک، سائنس کی تاریخ کامیابی کی تاریخ تھی۔ سائنس کی کامیابیاں بڑھتے ہوئے علم، اور جہالت اور توہم پرستی پر فتح کی نمائندگی کررہی تھیں۔ سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا تھا جو انسانی زندگی کو ترقی دینے والا تھا۔ مگر حال میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ لامحدود ٹکنکل ترقیوں سے پیدا ہونے والے خطرات نے مورخین کو مجبور کیا ہے کہ وہ سائنس کے بارہ میں اپنے ابتدائی سادہ خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں:

Until recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition; and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier simple faith. (16/366)

خلاصہ کلام

دوسری دنیا (کیونسٹ دنیا) میں اسلامی دعوت کے لئے کام کرنے کے مواقع مسدود ہوگئے

تھے۔ اب وہاں اسلامی دعوت کے مواقع دوبارہ کھل گئے ہیں۔ جہاں تک پہلی دنیا (آزاد دنیا) کا تعلق ہے، وہاں کام کے مواقع پہلے سے موجود تھے۔ اب نئے حالات نے ان مواقع میں صرف مزید اضافہ کیا ہے۔

ان حالات میں ہماری ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اب ہمیں مزید طاقت اور سرگرمی کے ساتھ ان مواقع دعوت کو استعمال کرنے میں لگ جانا چاہئے۔

اسلام کا احیاء اور مسلمانوں کی ترقی تمام تر دعوت کے عمل سے وابستہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں دعوت کے مواقع آخری حد تک کھول دئے گئے ہیں۔ اب تاریخ منتظر ہے کہ کچھ لوگ اٹھیں اور ان مواقع کو استعمال کرکے اسلام کی دعوت کو تمام بندگان خدا تک پہنچا دیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف ہر قسم کے دعوتی مواقع کے دروازے کھل گئے ہیں۔ دوسری طرف وسائل اعلام (communication) کے جدید ذرائع نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ خدا کی دعوت سارے عالم میں پہنچائی جاسکے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہو جائے جس میں آپ نے فرمایا کہ زمین کے اوپر کوئی بھی مکان یا خیمہ نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔ تاریخ ہمیں یہ عظیم کریڈٹ دینے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ ہم ان ضروری شرائط کو پورا کر دیں جس کے بعد کسی کو اس قسم کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔

تجویز

اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر آخر میں میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ خاص اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ اس کمیٹی میں اہل علم اور باخبر افراد شریک ہوں۔ یہ لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ اور غور و فکر کریں۔ اور پھر دعوتی عمل کا ایک مکمل منصوبہ بنائیں۔ اس کے بعد منظم انداز میں اس پر عمل شروع کر دیا جائے۔ مذکورہ نوعیت کی ایک کمیٹی کا قیام اس معاملہ میں صحیح اور موثر آغاز کی ضمانت ہوگا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ مشترک صفت ہے کہ وہ اپنے ملکوں کے شاکی رہتے ہیں۔ مگر یہی لوگ باہر کے ملکوں میں جاکر نہایت کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ مثلاً پاکستان اور ہندستان کے لوگ اپنے اپنے ملکوں میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہاں ظلم اور فساد ہے۔ مگر یہی لوگ مغرب میں یا خلیج کے ملکوں میں پہنچتے ہی ایک کامیاب زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مصر اور شام کے اسلام پسند اپنے ملکوں میں اپنی حکومت سے ٹکراؤ کے سوا کوئی اور کام نہیں جانتے۔ مگر یہی لوگ سعودی عرب اور کویت میں آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کا راز ایک لفظ میں ایڈجسٹمنٹ ہے۔ یہ لوگ اپنے ملکوں میں ایڈجسٹمنٹ نہیں کرتے، اس لئے وہ اپنے ملک میں ناکام رہتے ہیں۔ اور دوسرے ملک میں، مجبورانہ طور پر نہ کہ شعوری طور پر، ایڈجسٹمنٹ کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ وہاں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ملکوں میں "مجاہد" ہیں اور دوسرے ملکوں میں "بزدل"۔ اگر وہ اپنے ملکوں میں اسی طرح "بزدل" بن جائیں جس طرح وہ باہر کے ملکوں میں بنے ہوئے ہیں تو وہ خود اپنے ملک میں بھی وہ ساری کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں جو وہ باہر کے ملک میں حاصل کر رہے ہیں۔

اس صورت حال کا اصل نقصان عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ باہر جانے والے ذہین لوگ اپنی زبان سے یہ اعلان نہیں کرتے کہ تجربہ کے بعد ہم نے اپنی پالیسی بدل لی ہے، اسی طرح تم بھی بدل لو۔ چنانچہ عملاً یہ ہو رہا ہے کہ ان تمام نام نہاد مجاہدین کے لکھے یا بولے ہوئے الفا کی بنا پر ان کے ملکوں کے لوگ برابر مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ اور وہ خود باہر کے ملک میں اپنے اا کو عملاً ترک کر کے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا مستقبل تعمیر کر رہے ہیں۔

یہ سب سے بڑی برائی ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جاری ہے۔ او عجیب بات یہ ہے کہ اس برائی کو جاری کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو بے خبر عوام نے برائی مٹانے کریڈٹ دے رکھا ہے۔ ایک صاحب کے سوال پر میں نے یہ بات کہی۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران کہا کہ اسلامی دنیا کو ہمارے دشمنوں نے پارہ پا کر دیا ہے (ان العالم الاسلامی مزّقہ اعداؤنا)

۰ امئی کی شام کو موتمر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں سینیگا

اخباری نمائندے جمع ہوئے اور سوال وجواب کے انداز میں گفتگو ہوئی۔

مگر پریس کے نمائندوں نے جو سوالات کئے، وہ زیادہ تر سطحی نوعیت کے تھے۔ ایک صحافی نے یہ سوال کیا کہ کانفرنس نے سلمان رشدی کے بارہ میں کوئی تجویز پاس نہیں کی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال وجواب کو سن کر مجھے احساس ہوا کہ اس وقت پوری ملت اسلام قول بلا فعل کی سطح پر ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر مسلمان اس بات کو ثابت کرنے پر اپنے آخری الفاظ خرچ کر دینا چاہتا ہے کہ سلمان رشدی واجب القتل ہے۔ حتی کہ وہ اس قابل ہے کہ کوئی بھی شخص اس پر قابو حاصل کر کے اس کو قتل کر دے۔

مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہر شخص قتل کی بات کرتا ہے مگر کوئی شخص قتل کرنے کے لئے نہیں اٹھتا۔ حتی کہ ایران کی حکومت نے ایک سال پہلے اعلان کیا تھا کہ سلمان رشدی کے قتل کے لئے ایک اسکوئڈ روانہ کر دیا گیا ہے۔ مگر آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اسکوئڈ کہاں گیا۔ ہندستان، پاکستان یا کسی بھی ملک کے کسی مسلم دانشور یا عالم نے ایسا نہیں کیا کہ وہ خود انگلینڈ جائے یا اپنے صاحبزادہ کو وہاں بھیجے اور پھر وہ یا تو سلمان رشدی کو مارنے میں کامیاب ہو یا اسی راہ میں اپنی جان دیدے۔

حقیقت یہ ہے کہ سلمان رشدی کے واقعہ نے سلمان رشدی سے زیادہ خود موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ سلمان رشدی کی کتاب نے اگر سلمان رشدی کو شتم رسول کا مجرم ثابت کیا ہے تو مسلم لکھنے اور بولنے والوں کو قول بلا فعل کا مجرم ثابت کیا ہے۔ اور دوسرا جرم یقیناً پہلے جرم سے کسی طرح کم نہیں۔

اس سفر کے دوران مجھے ایک عرب ملک کی مطبوعہ رپورٹ (۱۹۸۹) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں نام بنام دکھایا گیا تھا کہ کس ملک کو کس مد میں کتنی رقم دی گئی۔ ہندستان کے عنوان کے تحت اس رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ درج تھے:

الهند: لجنة تعمير المساجد، لاصلاح المساجد المتضررة من الزلازل $20,000 اس اندراج کے مطابق، ہندستان میں تعمیر مساجد کے لئے ایک ادارہ قائم ہے۔ اس نے ۲۰ ہزار ڈالر ان مساجد کی مرمت کے لئے حاصل کیا ہے جن کو زلزلوں سے نقصان

پہنچا ہے۔

یہ پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ "لجنۃ تعمیر المساجد" کے نام سے کوئی معروف ادار ہندستان میں موجود نہیں۔ اور اگر بالفرض "اسٹیمپ اور لیٹر پیڈ" کی سطح پر ایسا کوئی ادارہ کہیں موجو ہو تو یہ یقینی ہے کہ ۱۹۸۹ میں یا اس سے پہلے کے قریبی سال میں ہندستان میں کوئی زلزلہ نہیں آیا جس میں مسجدوں کو نقصان پہنچا ہو اور اس کی ضرورت پیش آئی ہو کہ باہر سے رقم لاکر ان مرمت کرائی جائے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کا "باریش طبقہ" کتنے بر انداز میں عرب ملکوں کے جذبۂ انفاق کا استحصال کر رہا ہے۔

عبد المغنی شمس الدین (عمر ۴۶ سال) کوالالمپور (ملیشیا) سے آئے تھے۔ وہ اخوانی تحریک سے متاثر ہیں۔ جامعہ ازہر کے پڑھے ہوئے ہیں، اس لئے عربی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ گفت کے دوران میں نے کہا کہ الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ اختتا آغاز کرنا چاہتے ہیں، وہ آغاز سے اپنے عمل کی ابتدا کرنا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ وہ لفظی شور اور بے فائدہ ٹکراؤ کے سوا امت کو کوئی اور چیز نہیں دے سکے۔ وہ ہر جگہ "نظام" کو توڑنے باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ لوگوں کے مزاج اور طرز فکر کو بدلا جا

انھوں نے کہا کہ مگر فکر بدلنے کے تمام بڑے بڑے ذرائع (اسکول، ریڈیو، ٹیلی اخبارات وغیرہ) سب حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ پھر حکومت کو بدلے بغیر طرز فکر بدلنے کا کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک زبردست مغالطہ ہے جس میں موجودہ مسلم پچھلی نصف صدی سے مبتلا ہیں۔ حالانکہ واقعات نے اس کا بے معنی ہونا آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں مکمل اقتدار ملا۔ اور سید ابو الاعلیٰ مودودی سمیت تمام اسلام پسند لوگوں نے ان کی تائید کی۔ ضیاء الحق صاحب ساڑھے گیارہ تک، آپ کے الفاظ میں، فکر بنانے والے تمام اداروں پر مکمل قبضہ کر کے اس کو افکار بد لنے استعمال کرتے رہے۔ حتی کہ انھوں نے جماعت اسلامی کے افراد کو ان شعبوں کا چارج

مگر ساڑھے گیارہ سال کی کوشش کے باوجود ادنی درجہ میں بھی لوگوں کی فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ آج پاکستان کا ذہن پہلے سے بھی زیادہ بگڑا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ ضیاء الحق صاحب کی موت کے فوراً بعد جو عوامی الکشن ہوا، اس میں پاکستان کے عوام نے ضیاء الحق کے دور کے تمام افراد کے خلاف ووٹ دے کر انھیں ہرا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دور اول کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر حضرت ابو بکر صدیق کو خلیفہ بنایا۔ اس کا نام ذہن کی تبدیلی ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ کے لوگ عبد اللہ بن ابی جیسے کسی شخص کو اپنا حکمراں بنا لیتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی تحریک وہاں کے لوگوں کے ذہن کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے یہی صورت ضیاء الحق صاحب کے بعد ہونے والے انتخابات میں پیش آئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تعمیر فکر کا کام ایک خالص غیر سیاسی کام ہے۔ وہ حکومت واقتدار کے باہر انجام دیا جاتا ہے نہ کہ حکومت واقتدار کے اندر۔

۱۰ مئی کی صبح کو ہمارا قافلہ توبا (Touba) کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں سینیگال کے سب سے بڑے صوفی رہتے ہیں۔ ان کا نام شیخ عبد القادر مباقی (M'Backe) ہے۔ وہ طائفہ مریدیہ کے پیر ہیں۔ اس حلقہ کو احمد بامبا نے قائم کیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ کے دروازہ پر مسکن الشیخ الخدیم لکھا ہوا تھا۔

بزرگ اپنے لباس اور حلیہ کے اعتبار سے اسی روایتی انداز میں تھے جو ہندستان کے بزرگوں کا انداز ہے۔ مگر ان کا وسیع مرکز پورے معنوں میں "ماڈرن" تھا۔ میز، قالین، صوفہ سٹ، ٹیلیفون، غرض ہر چیز موجود تھی۔ مجھے حمام (ٹائیلٹ) میں جانے کا اتفاق ہوا۔ حمام خالص مغربی طرز کا بنا ہوا تھا۔ جتنی دیر ہم لوگ شیخ کے پاس رہے، ٹیلی وژن کا عملہ مسلسل ہر چیز کو ریکارڈ کرتا رہا۔

وسیع کمرۂ ملاقات ٹیک لکڑی کا منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ ایک بڑی کرسی بزرگ کے لئے تھی جن کو یہاں الشیخ الاکبر کہا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ آئے۔ ایک بات نے خاص طور پر مجھے سوچنے کا موقع دیا۔ وہ یہ کہ شیخ اپنی شخصیت (پرسنالٹی) کے اعتبار سے نہایت غیر جاذب تھے۔

میں نے سوچا کہ اس کا راز کیا ہے کہ سینیگال کے لاکھوں لوگ ان پر فدا ہیں اور صدرِ ریاست ان کو خصوصی سلام بھجواتے ہیں۔ اس کا راز کئی سو سال کی تاریخ ہے۔

پہلے شیخ جو اپنے کو خادم رسول اللہ کہتے تھے، وہ اس مقام (توبا) میں آئے۔ انھوں نے خدمت اور تقدس کی تاریخ بنائی۔ اس کے بعد مختلف بزرگ اس تاریخ میں اضافہ کرتے رہے۔ اس طرح تقدس کی ایک لمبی تاریخ ہے جس کے اوپر موجودہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

ہندستان کے موجودہ تمام "شیوخ" کا حال بھی یہی ہے۔ ہر ایک کسی قدیم ادارہ یا قدیم تحریک کی بنائی ہوئی تاریخی روایات کی زمین پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک ہے خود ایک تاریخ بنانا، اور دوسری چیز ہے سابقہ تاریخ کو استعمال کرنا۔ بعد کو آنے والا زمین کے اوپر جگہ پاتا ہے، مگر تاریخ بنانے والے کے حصہ میں جو چیز آتی ہے، وہ یہ کہ وہ زمین کے نیچے دفن ہو کر رہ جائے۔

طوبی میں ایک افریقی احمد بھی میرے قریب آئے۔ انھوں نے پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہند سے۔ وہ عربی میں کلام کر رہے تھے۔ انھوں نے الاسلام یتحدی کی تعریف کی۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ اس کتاب کے مصنف کو جانتے ہیں۔ کیا وہ زندہ ہیں (ھل تعرف مولف ھذا الکتاب، اھو حی)، میں خاموش رہا۔ انھوں نے کہا آپ عربی نہیں سمجھتے ہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ میں ہی اس کا مصنف ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیتے رہے۔

اس قسم کے واقعات میرے ساتھ ہر سفر میں پیش آتے ہیں۔ یہاں "مکتبۃ الشیخ" میں جانا ہوا۔ اس کے لائبریرین ہم لوگوں کو لائبریری کا ایک حصہ دکھا رہے تھے۔ وہ ایک الماری کے سامنے کھڑے ہوگئے اور کہا کہ ہمارے پاس ہر موضوع کی کتابیں ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے چند کتابیں نکال کر دکھائیں۔ پھر انھوں نے ایک کتاب نکالی اور دکھاتے ہوئے کہا: ھذا الاسلام یتحدی للمفکر الاسلامی الکبیر وحید الدین خان۔ لائبریرین کے اس جملہ کو سن کر میرے ساتھی ہنس پڑے۔ انھوں نے کہا کہ مصنف یہ آپ کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔

اس لائبریری کے ایک حصہ میں شیخ کی تالیفات مجلد کر کے رکھی ہوئی ہیں۔ کچھ مطبوعہ اور بیشتر قلمی۔ یہ تالیفات عقائد اور تصوف وغیرہ موضوعات پر ہیں۔ ایک کتاب میں نے دیکھی۔ اس میں تصوف اور صوفی پر بحث تھی۔ صوفی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ صوفی وہ ہے جو انسانوں سے منقطع ہو کر اللہ سے متصل ہو جا۔

(عربی الفاظ یاد نہیں)

۱۰ مئی کی شام کو کھانے کی میز پر دو افریقی نوجوان تھے۔ ایک کا نام شیخ احمد تیجانی کوتا تھا۔ دوسرے کا نام میں نہ پوچھ سکا۔ دوسرے ساتھی سے میں نے پوچھا کہ آپ تیجانیہ سے تعلق رکھتے ہیں یا مریدیہ سے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اس وقت سینیگال کے گھروں کا یہ حال ہے کہ ماں اور باپ تو ان دو میں سے کسی ایک طائفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر سینیگال کی نئی نسل ان باتوں میں یقین نہیں رکھتی۔ نوجوان نسل دونوں سے کٹتی جا رہی ہے۔

میں طوبی کی مسجد کو دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب مجمع سے نکل کر میری طرف آئے۔ وہ میرا نام وغیرہ پوچھنے لگے۔ میں نے کہا کیا آپ نے میری عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ کو میرے بارہ میں پوچھنے کا خیال کیوں آیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں جب میں نے مجمع کو دیکھا تو میں نے آپ کے چہرہ کو منتخب کر لیا۔ کیوں کہ آپ کے چہرہ میں مجھے اسلامی عظمت دکھائی دی (لما رأيت الوجوه فقد اخترت وجهكم لما توحي من العظمة الاسلامية)

۱۱ مئی کی صبح کو جزیرہ گورے (Goree) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ ڈکار سے پانچ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جدید طرز کی مشینی کشتی جب ہم لوگوں کو لے کر سمندر کی موجوں کے اوپر تیزی سے چلنے لگی تو بے اختیار میری زبان پر یہ آیت آگئی: ولقد كرمنا بني آدم وحملناهم في البر والبحر (۱۷ / ۷۰)

جانور اپنے پیروں کے ذریعہ زمین پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کر کے خشکی کا سفر کرایا۔ مچھلیاں اپنی جسمانی محنت سے سمندر میں تیرتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو کشتیوں پر بٹھا کر سمندر کی سطح پر رواں دواں کیا۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ فضا میں اڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر فضا میں اڑنے کا انتظام کیا۔ یہ کیسا عجیب "کرمنا" کا معاملہ ہے جو انسان کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر انسانوں میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں کے لئے حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوں۔ شکر یہ ہے کہ آلاء اللہ کو سوچ کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور پھر زبان سے نکلے کہ خدایا تیرا شکر ہے۔ محض ش ک ر کو دہرانے کا نام شکر نہیں۔

جزیرہ میں کار وغیرہ نہیں ہوتی۔ یہاں لوگ پیدل چلتے ہیں۔ اس لئے یہاں فضائی کثافت کا وجود نہیں ہے۔ پورا جزیرہ نہایت پرسکون اور خوش گوار ہے۔ اس جزیرہ کے تمام مکانات قدیم یورپی طرز کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں لوگوں نے سب سے پہلے اس جزیرہ کو آباد کیا تھا۔ سب سے پہلے ۱۴۴۴ء میں ہالینڈ کے لوگ اس جزیرہ میں آئے۔ پھر پرتگالی اور فرانسیسی آئے۔ سب سے آخر میں انگریز آئے۔ انگریزوں نے جزیرہ گورے پر قبضہ کرلیا۔ فرانس کا قبضہ گامبیا پر تھا۔ دونوں میں تبادلہ ہوا۔ گامبیا کو فرانس نے انگریزوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اور اس کے بدلے میں انگریزوں نے جزیرہ گورے کو فرانس کے حوالہ کر دیا۔ آجکل اس جزیرہ میں کل دو ہزار آدمی رہتے ہیں۔

جزیرہ گورے میں جو چیزیں دیکھیں، ان میں ایک وہ مکان (سلیو ہاؤس) تھا جو غلاموں کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس میں نیچے کے حصہ میں نہایت تنگ قسم کی کوٹھریاں تھیں جن میں غلام پکڑ کر بند رکھے جاتے تھے اور سمندر کے راستہ سے روانہ کئے جاتے تھے۔ اور مکان کے اوپر کے حصہ میں کشادہ اور آرام دہ کمرے تھے۔ یہاں یورپ کے سفید لوگ ٹھہرتے تھے جو غلاموں کی خرید وفروخت کے کاروبار کے لئے یہاں آتے تھے۔

غلاموں کی کوٹھری کو میں نے ناپ کر دیکھا تو کوئی تین قدم چوڑی اور چار قدم لمبی تھی اور کوئی چار قدم چوڑی اور آٹھ قدم لمبی۔ ان چھوٹی کوٹھریوں میں ایک سو اور دو سو آدمی جانوروں سے بدتر انداز میں بھر دئے جاتے تھے۔ انھیں دن میں صرف ایک بار قضائے حاجت کے لئے نکالا جاتا تھا۔ یہاں اس زمانہ کے بہت سے سامان اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً لوہے کی وہ ہتھکڑی جس میں انھیں باندھ دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی وحشیانہ چیزیں تھیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

غلاموں کا یہ گھر پندرھویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ کی دریافت نے غلاموں کی تجارت (Slave trade) بہت بڑھا دی۔ امریکہ میں زرخیز زمین بہت تھی۔ مگر وہاں کام کے لئے آدمی نہیں تھے۔ چنانچہ یورپی قوموں نے افریقہ سے غلاموں کو پکڑ کر وہاں بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ زرعی مزدور کے طور پر استعمال کئے جاسکیں۔ یہ لوگ کالے انسانوں کو ایک قسم کا حیوان سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ افریقہ آکر اس طرح ان کو پکڑتے تھے جیسے جنگلوں میں جانور پکڑے جاتے ہیں۔ اور پھر نہایت وحشیانہ اور بے دردانہ انداز میں ان کو سمندری جہازوں میں بھر کر امریکہ لے جاکر انھیں

بیچے تھے۔ اس غیرانسانی تجارت میں ڈچ، پرتگال، فرانسیسی، انگریز سب شریک تھے۔

جزیرہ گورے میں قدیم طرز کی مگر صاف ستھری خوب صورت مسجد ہے۔ اس میں کوئی گنبد نہیں ہے۔ مسجد کے ایک طرف پہاڑی ہے اور دوسری طرف سمندر۔ یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ اور پھر امام سے ملاقات کی۔ امام صاحب نے بتایا کہ یہ مسجد افریقہ کی چند قدیم مسجدوں میں سے ایک ہے۔

نئی دہلی میں سینیگال کے سفارت خانہ کی طرف سے کچھ تعارفی لٹریچر دیا گیا تھا۔ ایک پمفلٹ میں جزیرہ گورے کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں غلام گھر ہے جس کا دروازہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ یہ انسان کے اوپر انسان کے ظلم کی ایک دہشت ناک یاددہانی ہے:

The slaves house with its door opened on the ocean is a terrible reminder of the cruelty of men towards men.

ان الفاظ کو پڑھ کر صرف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جزیرہ گورے میں کوئی عمارت ہے جس کو "غلام گھر" کہا جاتا ہے۔ مگر جب میں نے وہاں جا کر غلام گھر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور زنجیریں اور دوسری چیزیں دیکھیں تو اندازہ ہوا کہ واقعی سیاہ فام لوگوں کے ساتھ کتنا زیادہ ظلم کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم یہ مشاہدہ بھی آخری نہیں۔ اس سے زیادہ دہشت ناک مشاہدہ وہ ہوگا جب کہ آدمی اس وقت وہاں موجود ہو جب کہ یہ انسانیت سوز واقعہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے سیاہ فام لوگوں کے ساتھ عملاً حیوانی سلوک ہوتے ہوئے دیکھے۔ موجودہ زمانہ میں اہل مغرب نے "نیگرو" اور دوسرے ناموں سے کچھ فلمیں بنائی ہیں۔ ان میں ایکٹنگ کے ذریعہ وہ تمام قدیم مناظر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مگر یہ دیکھنا بھی آخری دیکھنا نہیں۔ اس سے بڑا اور آخری مشاہدہ وہ ہے جب کہ کوئی شخص دونوں کی اندرونی حالت کو دیکھ سکے۔ ایک طرف وہ سفید فام لوگوں کے اندرون کو دیکھے کہ کس شقاوت کے ساتھ وہ اس فعل کو انجام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ سیاہ فام مظلوموں کے دلوں کی حالت جان سکے کہ کس طرح ذلت اور ظلم کی اس ناقابل برداشت صورت کو وہ برداشت کر رہے ہیں۔

یہ آخری حقیقت صرف خدا دیکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انسانوں کا عادلانہ حساب کر سکے۔

۱۱ مئی کو جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے لئے ہم لوگ ڈکار کی جامع مسجد میں لے جائے گئے۔ یہ مسجد جامع قرویین کے طرز پر بنی ہوئی تھی، اس کا ہر جز دہلی کی مساجد سے مختلف تھا۔ اندر داخل ہوا تو وسیع مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ گیٹ پر عمومی اعلان ہو رہا تھا کہ جوتا اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میں بھی جوتا اپنے ہاتھ میں لے کر اندر داخل ہوا۔

میزبانوں کی رہنمائی میں ہم لوگ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک پہلی صف میں پہنچ گئے۔ اتنے میں ایک افریقی بزرگ نے جوتا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں اس قسم کے تکلف سے گھبراتا ہوں۔ کیوں کہ نماز کے بعد اگر وہ صاحب مجھے نہ ملیں تو دوسرے کے رکھے ہوئے سامان کو تلاش کرنا میرے لئے سخت مشکل ہو جائے گا۔ مگر جب میں نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو مذکورہ افریقی میرا جوتا لئے ہوئے میرے پیچھے موجود تھے۔

میں اگلی صف میں امام کے قریب تھا۔ سنت پڑھ کر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ مسجد کی چھت کے اوپر سے شاید کوئی بیل کا پٹر گزر رہا ہے۔ مگر دیکھا تو "دیوار" کے اندر سے ایک بہت بڑا لکڑی کا ڈھانچہ برآمد ہو رہا تھا۔ یہ منبر تھا جو بھاری بھاری موٹی لکڑیوں سے منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ وہ ریل کے ڈبہ کی طرح لکڑی کے پہیہ پر ہوتا ہے۔ اس کو دیوار کے پیچھے ایک مخصوص کمرہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور خطبہ کے وقت کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کو اس سے پہلے میں نے جامع قرویین میں دیکھا تھا۔

امام صاحب منبر پر بیٹھے تو حسب معمول مسجد کے اندر موذن نے کھڑے ہو کر دوسری اذان دی۔ اذان ختم ہوئی۔ میں آغاز خطبہ کا منتظر تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ امام صاحب بدستور بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں مسجد کے ایک گوشہ سے "اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ میں متحیر تھا کہ یہ کیا۔ میرے ساتھی نے اپنے ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھا کر اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں خطبہ سے پہلے تین اذانیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک کے بعد ایک تین اذانیں ہوئیں۔ اس کے بعد امام

۱ سوویت روس کی حکومت کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے سوویت روس کا سفر کیا۔ یہ سفر ۲۸ جولائی ۱۹۹۰ کو شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں وہ ماسکو اور تاشقند گئے۔ اس کی تفصیلی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲ دہلی کے ہندی اخبار جن ستہ کے نمائندہ مسٹر ایس کرمانی نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو جن ستہ کے شمارہ ۳ جولائی ۱۹۹۰ میں شائع ہوا ہے۔ جن ستہ انگریزی اخبار انڈین اکسپریس کا ہندی اڈیشن ہے۔

۳ نئی دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پر ایک آل انڈیا سیمینار ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کے منتظمین کی دعوت پر ۵ اگست ۱۹۹۰ کو اس کی ایک نشست میں شرکت کی اور مولانا حفظ الرحمٰن اور علماء ہند کے کارناموں کی بابت ایک تقریر کی۔ خاص طور پر یہ بتایا کہ موجودہ ہندستان میں ان علماء کے رول کی اہمیت کیا ہے۔

۴ اردو اکادمی نے دہلی کی ۲۷ لائبریریوں میں اپنی طرف سے الرسالہ اردو جاری کرایا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا تعاون ہے۔ اس کے لئے ہم اردو اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس کے ذریعہ سے سیکڑوں نئے لوگ الرسالہ سے استفادہ کر سکیں گے۔

۵ احمد آباد سے ایک گجراتی ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام چھیپا بلیٹن ہے۔ اس پرچہ میں ایک مستقل کالم ہے جس کا عنوان ہوتا ہے "میری آواز سنو"۔ اس عنوان کے تحت ہر مہینہ الرسالہ کا کوئی مضمون گجراتی میں ترجمہ کرکے شائع کیا جاتا ہے۔ ماہانہ اشاعت کا یہ سلسلہ کئی سال سے جاری ہے۔ یہ بات پروفیسر فرید محمد محمود جی بلو والا نے ۷ جون ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتائی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہمارے قارئین سب سے پہلے اسی کالم کو پڑھتے ہیں۔

۶ لئیق محمد خاں صاحب (بنگلور) نے بتایا کہ بنگلور میں انھوں نے قارئین الرسالہ کا ایک حلقہ بنایا ہے۔ اس کے تعاون سے وہ لوگ مختلف دعوتی کام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ الرسالہ اردو اور انگریزی کے منتخب مضامین کی فوٹو کاپیاں تیار کرتے ہیں اور ہاکر کے ذریعہ ان کاپیوں کو اخبارات میں ڈال کر لوگوں کے گھروں میں پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح اور دوسرے طریقہ سے الرسالہ مشن کو

لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔

۷ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے ۲۰ جون ۱۹۹۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو لیا جو اکسٹرنل سروس سے نشر کیا گیا۔ یہ انٹرویو ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ انٹرویو لینے والے آل انڈیا ریڈیو کے مسٹر مجیب صدیقی تھے۔ سوالات زیادہ تر برصغیر ہند کے مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے متعلق تھے۔ اس انٹرویو کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۸ جناب حبیب بھائی (حیدر آباد) نے بتایا کہ ایک روز وہ الرسالہ ہاتھ میں لئے ہوئے اس کو پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب نے دیکھ کر پوچھا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ پڑھ رہا ہوں انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ الرسالہ کیا ہے۔ حبیب بھائی نے کہا کہ "یہ مارل بلڈر ہے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کے قارئین الرسالہ کو کیا حیثیت دیتے ہیں۔

۹ محمد ریاض الحنفی (نیوجرسی) ایک امریکی مسلمان ہیں۔ ان کی مادری زبان انگریزی ہے۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں پڑھی ہیں اور انگریزی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم ایک ورلڈ آف لاجک میں رہ رہے ہیں۔ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات اسی آج کی زبان میں اسلام کی دعوت کو پیش کرتی ہیں۔ مغربی دنیا کو آج ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے۔ "گاڈ ارائزز" کے بارہ میں انھوں نے اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا:

Before reading this book I knew that Islam was correct, but after reading I now know why Islam is correct.

۱۰ مولانا محمد شعیب کوٹی سعودی عرب سے لکھتے ہیں: میں کئی سال سے شرورہ میں ہوں۔ یہ سعودی عرب میں یمن کی سرحد پر واقع ایک شہر ہے۔ میں اپنے ذرائع سے الرسالہ کے اردو اور انگلش دونوں اڈیشن حاصل کرتا ہوں۔ یہاں شرورہ میں الرسالہ کے پڑھنے والوں کا حلقہ خاصا وسیع اور وقیع ہے۔ اس سے پہلے میں تبوک میں تھا تو وہاں بھی کئی حضرات سے الرسالہ کا تعارف ہوا۔ میں کوشش میں ہوں کہ پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ اپنے ساتھ کام کرنے والے فلپینی حضرات کو مطالعہ کراؤں۔ اس سے پہلے وہ لوگ الرسالہ انگریزی کے کئی شماروں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

١١ اسلامی مرکز کی مطبوعات ہدیۃً ارسال کرنے کے لیے ہمیں دینی درسگاہوں، اردو لائبریریوں، اسکولوں اور کالجوں کے پتے مطلوب ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنے علاقے میں واقع دینی مدارس اور دوسرے علمی اداروں کے پتے مختصر تعارف کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ اگر اداروں کے ذمہ دار حضرات کو اس پہلو پر توجہ دلاکر ان کا مطبوعہ تعارف نامہ روانہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ مئی ۱۹۹۰ ہماری بستی کے قاری دلشاد احمد رحیمی لے کر آئے جو بیت العلوم (پیپلی مزرعہ) میں مدرس ہیں۔ موصوف نے مسجد میں تمام مقتدیوں کو کئی روز تک بعد نماز سنایا۔ اس کے مضامین سے دل بے چین ہوا اور سمجھا کہ الرسالہ سے وابستگی ایک دینی حمیت اور وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انشاء اللہ میں اس کو ضرور اپنے حلقہ احباب میں پہنچاؤں گا (عطاء الرحمٰن پردھان، بہیٹ) اس طرح کے ہزاروں لوگ ہیں جو الرسالہ کا صرف ایک شمارہ دیکھ کر اس سے متاثر ہوگئے اور اس کو پڑھنے اور پڑھانے میں لگ گئے۔

۱۳ مولانا خلیل احمد امین (ترکیسر) کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ الرسالہ کے صبر و اعراض کے اصول سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں مسلسل لوگوں کو اس کی نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے ہزاروں لوگ ہیں جو الرسالہ سے متفق ہو کر ان باتوں کو عوام کے اندر پھیلا رہے ہیں۔ والحمد للہ علی ذالک

۱۴ محمد نور عالم صاحب (سمستی پور) نے بتایا کہ وہ ایجنسی کے طور پر الرسالہ کی پانچ کاپی منگاتے ہیں ایک پرچہ اپنے پاس رکھ کر بقیہ چار پرچے لوگوں کو تقسیم کر دیتے ہیں، خواہ وہ قیمت دیں یا نہ دیں۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی اسی طرح کر رہے ہیں۔

۱۵ ڈاکٹر عمر خالدی بوسٹن (امریکہ) کی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ آجکل وہ "ہندستانی مسلمان اور سیاست" کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ۸ اگست ۱۹۹۰ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ	
قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا



فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 Telex: 031-61758 FLSH IN ATTIC
Fax: 91-11-353318, 331260
Annual Subscription: Inland Rs. 60 Abroad US $ 25 (Air Mail)

کلمۂ معرفت

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ
(الاحقاف ۹)

کہو کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کے ذریعہ آتا ہے۔ اور میں صرف ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔

یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے۔ ایک واقعہ کے ذیل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم، میں نہیں جانتا، اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں، کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ (واللہ ما ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم، التفسیر المظہری، ۳۹۶/۸)

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ کلمۂ عبدیت ہے نہ کہ کلمۂ آخرت۔ یعنی یہ عبدیت کے احساس کے تحت نکلے ہوئے الفاظ ہیں، یہ آخرت کے فیصلہ کا اعلان نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے لیے اور اپنے تمام سچے بندوں کے لیے مغفرت کا اعلان فرمایا ہے۔ مگر ایک صاحب معرفت بندہ جب یہ سوچتا ہے کہ میں عاجز مطلق ہوں اور خدا قادر مطلق ہے۔ اور آخرت کے فیصلہ کا اختیار یک طرفہ طور پر صرف خدا کے ہاتھ میں ہے تو رحمت کے یقین کے باوجود وہ کانپ اٹھتا ہے۔ خدا کی عظمت کے احساس سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

ایک طرف اس کو خدا کی رحمت کا یقین ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا کی پکڑ کا اندیشہ۔ یہ صورت حال اس کو امید اور خوف کے عین درمیان کھڑا کر دیتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اس کو اپنا معاملہ بالکل ففٹی ففٹی (fifty-fifty) کا سا نظر آنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "مایفعل بی ولا بکم" معرفت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ جس آدمی کو خدا کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی زیادہ اس کے اندر عظمت خداوندی کا احساس بڑھتا چلا جائے گا۔ اور عظمت خداوندی کا حقیقی ادراک آدمی کی زبان سے جو کلمہ نکلواتا ہے وہ یہی کلمہ ہے۔

منصوبۂ خداوندی

قرآن میں مومنین صالحین کو خیر البریہ کہا گیا ہے اور ان کے لئے ہمیشہ کی جنت کا وعدہ کیا گیا ہے (البینہ) یہ کون لوگ ہیں جو اس عظیم فضل کے مستحق قرار پائیں گے۔ ایک لفظ میں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی صفت ہوگی کہ وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور اللہ ان سے راضی ہوگیا (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)

مومن کے اللہ سے راضی ہونے (ورضوا عنہ) کا ایک پہلو خالص شخصی ہے۔ یعنی اپنی ذات کے معاملہ میں اپنی پسند کو چھوڑ کر اللہ کی پسند کو اختیار کر لینا۔

اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جو دنیا میں اللہ کے منصوبہ کو جاری کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے ورضوا عنہ کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اپنے آپ کو اللہ کے منصوبہ میں شامل کریں۔ وہ اپنے جان و مال کو منصوبۂ الٰہی کی تکمیل میں لگانے پر راضی ہو جائیں۔

اس معاملہ کی پہلی اور کامل مثال وہ ہے جو اصحاب رسول نے اپنی قربانیوں سے قائم کی۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اللہ کا خاص منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسا انقلاب لایا جائے جس کے بعد صرف عقیدۂ توحید کو فکری عظمت حاصل رہے۔ دوسرے تمام عقیدے اور نظریے اپنا فکری جواز کھو دیں۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عالمی سطح پر ایک عظیم انقلاب لانا تھا جو صرف عظیم قربانی ہی کے ذریعہ ممکن ہوسکتا تھا۔ صحابہ کرام نے پوری رضامندی کے ساتھ اپنے آپ کو اس منصوبۂ الٰہی میں شامل کیا۔ اس میں وہ اس حد تک پورے اترے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے بارے میں اعلان کر دیا گیا: رضی اللہ عنہم۔

اس انقلاب کے مختلف پہلو تھے۔ اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ خدا کے دین کو ایک تاریخی واقعہ بنا دیا جائے۔ اس سے پہلے ایک سو ہزار سے زیادہ پیغمبر آئے۔ مگر دین خداوندی ایک تسلیم شدہ واقعہ کی حیثیت سے تاریخ میں ریکارڈ نہ ہوسکا۔ صحابۂ کرام نے اپنی قربانیوں سے دین خداوندی کو مرحلۂ دعوت سے نکال کر مرحلۂ انقلاب اور درجۂ استحکام تک پہنچا دیا۔

آج دوبارہ اللہ تعالیٰ کا ایک منصوبہ ہے۔ وہ دوبارہ تقاضا کر رہا ہے کہ اہل ایمان اپنے آپ

کو اس منصوبۂ خداوندی میں شامل کریں۔ وہ اپنی تمام طاقتیں خرچ کرکے اس منصوبہ کو تکمیل تک پہنچائیں۔ جو لوگ اس پر راضی ہوں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے اس منصوبہ میں شامل کریں، ان کے لئے خدا کی طرف سے پیشگی طور پر یہ خوشس خبری ہے کہ وہ ان سے راضی ہوگا اور ان کو ابدی جنتوں میں داخل کرے گا۔

یہ منصوبہ کیا ہے۔ یہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ امام احمد اور دوسرے محدثین نے اس کو سند صحیح سے نقل کیا ہے۔ حضرت مقداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین کی سطح پر کوئی کچا یا پکا گھر ایسا نہیں بچے گا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا (لا یبقیٰ علیٰ ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام، مشکوٰۃ المصابیح، الجزء الاول، صفحہ ۲۰)

قدیم زمانہ میں یہ واقعہ ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں اس کے ذرائع حاصل نہ تھے۔ موجودہ زمانہ میں جو وسائل اعلام (پرنٹ میڈیا، الکٹرانک میڈیا) ظہور میں آئے ہیں، انھوں نے پہلی بار اس کو ممکن بنایا ہے کہ ساری دنیا کے ایک ایک گھر میں اسلام کا پیغام پہنچایا جاسکے۔

جدید وسائل اعلام کے ظہور کے باوجود دوسری دنیا (کیونسٹ بلاک) میں اسلام کا پیغام پہنچانا بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا۔ مگر ۹۰ - ۱۹۸۹ میں جو تبدیلیاں سامنے آئی ہیں انھوں نے حیرت انگیز طور پر اس رکاوٹ کو بھی ختم کر دیا ہے۔ ٹائم میگزین (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) نے بجا طور پر اس کو سوویت ایمپائر کے انہدام سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد سوویت روس میں ازسرنو اسلام کی اشاعت کے نئے دروازے کھل گئے ہیں۔ ٹائم (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) نے ایک باتصویر رپورٹ چھاپی ہے۔ اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے کہ کارل مارکس محمد کو جگہ دیتا ہے:

Karl Marx makes room for Muhammad

جمہوریت اور آزادی کے انقلاب کے نتیجہ میں مذہبی اشاعت کی مکمل آزادی، سوویت روس میں میخائیل گورباچیف کی لائی ہوئی تبدیلیوں کے بعد مذہب کے لئے آزادانہ مواقع کھلنا، جدید وسائل اعلام کے ذریعہ یہ ممکن ہو جانا کہ ساری دنیا کے تمام لوگوں تک اسلام کا پیغام حق پہنچایا جاسکے، یہ واقعات واضح طور پر یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے زمانہ کے لئے اسلام کی عمومی

اشاعت کی جو پیشین گوئی فرمائی تھی، اس کا وقت پوری طرح آچکا ہے۔

خدا نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب اہل ایمان کو اپنے حصہ کا کام کرنا ہے۔ خدا اپنے منصوبہ کے مطابق ضروری مواقع مہیا فرماتا ہے۔ اس کے بعد خدا کے مومن بندے اٹھتے ہیں اور ان مواقع کو استعمال کرکے اس منصوبہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

ساتویں صدی میں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ختم شرک کے منصوبہ کے لئے تمام ضروری مواقع جمع کر دئے تھے۔ رسول اور اصحاب رسول نے ان مواقع کو استعمال کرکے خدا کے منصوبہ کو عملی واقعہ بنایا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اسلام کی عمومی اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کا جو منصوبہ ہے، اس کے تمام ضروری اسباب مہیا کر دئے گئے ہیں۔ خدا نے دوبارہ اپنا کام کر دیا ہے۔ اب خدا کے بندوں کو اٹھنا ہے اور پیدا شدہ مواقع اور اسباب کو استعمال کرکے دوبارہ خدا کے منصوبہ کو عملی طور پر مکمل کر دینا ہے۔

خدا کا دین قرآن کی زبان میں آواز دے رہا ہے کہ مَنْ انصاری الی اللہ۔ اہل ایمان کو اس کے جواب میں کہنا ہے کہ نحن انصار اللہ۔ یہ تاریخ کا نازک ترین لمحہ ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس لمحہ کو پہچانیں اور اپنا سب کچھ اس کی بجاآوری میں لگا دیں۔

خاص نمبر

الرسالہ کا اگلا شمارہ جنوری ۱۹۹۱ موجودہ حالات کے بارہ میں ہوگا اور وہ خصوصی نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ اس کا نام "روشن مستقبل" ہوگا۔ اصحاب ایجنسی اگر تعداد میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو فوراً مطلع فرمائیں۔

سرکلیشن منیجر

آج اور کل

گریٹا گاربو (Greta Garbo) ایک مشہور امریکی ایکٹرس ہے۔ وہ ۱۹۰۵ میں پیدا ہوئی۔ اور ۱۹۹۰ میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ اسکرین کی ایک انتہائی مسحورکن (most glamorous) شخصیت سمجھی جاتی تھی۔ مگر اپنی شہرت کے عین عروج کے زمانہ میں ۱۹۴۱ میں وہ فلم سے ریٹائر ہوگئی اور نیویارک کے ایک مکان میں مکمل تنہائی کی زندگی گزارنے لگی۔ یہاں تک کہ اسی تنہائی میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔

گریٹا گاربو نے پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک تنہائی کی زندگی کیوں گزاری۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس کے بارے میں خود خاتون نے کبھی کوئی بیان نہیں دیا۔ اس کے ایک تبصرہ نگار نے اس کی بابت جو الفاظ لکھے ہیں اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

Garbo took her moment, and when she realised that it was over she retired into her private world. She did not want the crowd to see the degrading of her beauty. It had to remain perfect or not be seen at all. What were her thoughts in her half century of exile from cinema? We will never know perhaps. But I would guess she suffered deeply but serenely. She must have watched the passing years go by with the same wisdom with which she endowed her great heroines.

گاربو اپنی قدر و منزلت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گئی۔ اور جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ ڈھلنے لگی ہے تو وہ اپنی تنہائی کی دنیا میں گوشہ نشین ہوگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ اس کی کشش کو کم ہوتے ہوئے دیکھیں۔ یا تو اس کو معیاری حالت میں نظر آنا تھا یا سرے سے نظر ہی نہیں آنا تھا۔ آدھی صدی تک سنیما سے علیحدگی کے بعد اس کے خیالات کیا تھے، اس کو شاید ہم کبھی نہ جان سکیں گے۔ مگر میرا قیاس ہے کہ اس کو اپنی اس حالت کا شدید غم تھا۔ اس نے اپنے بعد کے سالوں کو اسی سمجھ داری سے گزارا جس کو اس نے اداکاری کے دوران ہیروئن کے اندر دکھایا تھا۔

انسان آج اپنے وجود کی جزئی نفی کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ کل اس کا کیا حال ہوگا جب اس کے وجود کی کلی نفی کی جائے گی، اور اس کے لیے کوئی گوشہ نہ ہوگا جہاں جاکر وہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپا سکے۔ کیسا عجیب ہے انسان اور کیسا عجیب ہے انسان کا معاملہ۔

الرسالہ، دسمبر ۱۹۹۰

شاعرانہ خیال آرائی

رائے قائم کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے فرضی تخیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ دوسرا ہے، حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ شاعر فرضی تخیل کی بنیاد پر اپنی رائے بناتا ہے۔ حکیم یا مفکر وہ ہے جو حقیقتِ واقعی کی بنیاد پر اپنی رائے بنائے۔

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۲۱۳ء) ایک شاعر تھے۔ وہ اپنے ایک قطعہ میں کہتے ہیں کہ نوح پیغمبر کا بیٹا بروں کی صحبت میں بیٹھا تو پیغمبر کے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ بگڑ گیا اور اصحاب کہف کا کتا چند دن نیکوں کی صحبت میں رہا تو وہ انسان ہو گیا:

پسر نوح با بداں بنشست   خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے چند   پئے نیکاں گرفت مردم شد

ان اشعار کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے، وہ فرضی تخیل کی بنیاد پر کہی گئی ہے نہ کہ حقائق کی بنیاد پر۔ حضرت نوح کے لڑکے کے بگڑنے کا سبب بروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بتایا گیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ اُس کا اٹھنا بیٹھنا خود اپنے باپ حضرت نوح کے ساتھ تھا۔ پھر کیسے ایک کا اثر ہوا اور دوسرے کا اثر نہیں ہوا۔ اسی طرح اصحاب کہف کے کتے کی وفاداری کو صحبت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ حالاں کہ کتے کے بارہ میں عام تجربہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کی بنا پر اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے نہ کہ صحبت پکڑنے کی بنا پر۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں جو رہنما اٹھے وہ اسی قدیم دور شاعری سے متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے نثر میں اسی قسم کی شاعری شروع کر دی۔ انھوں نے فرضی تخیل کی بنیاد پر ایک رائے قائم کی۔ اور اس کو نظریہ کے انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ نظریہ وہ ہے جو حقائق کے گہرے تجزیہ کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہو نہ کہ شاعرانہ خیال آرائی کی بنیاد پر۔

یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں، مگر عملاً وہ اتنی بے نتیجہ ثابت ہوئیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ مثلاً جمال الدین افغانی کی اتحاد اسلامی، محمد علی کی خلافت تحریک، ابو الاعلیٰ مودودی کی حکومتِ الٰہیہ، وغیرہ۔

آسان طریقہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷ - ۱۸۹۲) جون پور میں پیدا ہوئے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ ان کی شہرت زیادہ تر مزاح نگار کی حیثیت سے ہوئی۔ مزاحیہ نگاری میں وہ اردو کے ممتاز لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

موصوف کے ایک رفیق آل احمد سرور نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک دفعہ اپنا ایک مضمون مجھ سے لے کر کہیں اور شائع کر دیا۔ میں اسے ماہنامہ اردو ادب میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس پر احتجاج کیا تو انھوں نے نوٹس نہ لیا۔ پھر میں نے فریاد کی تو محرم کا مہینہ اسی زمانہ میں گزر چکا تھا۔ رشید صاحب نے لکھا کہ ——— محرم ختم ہو گیا، ماتم موقوف کیجیے" (قومی آواز ۲۲ اپریل ۱۹۹۰)

جواب کا یہ طریقہ بعض اوقات نہایت مفید ہوتا ہے۔ علمی تبادلۂ خیال میں منطقی طریقہ ہی مناسب ہے۔ علمی گفتگو میں طنز و مزاح کے الفاظ بولنا ایک معیوب فعل سمجھا جاتا ہے، مگر دوسرے بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں مذکورہ قسم کا ہلکا انداز زیادہ کارآمد ہے۔

خاص طور پر جب دو شخص یا دو گروہ میں تلخی کی صورت پیدا ہو جائے تو ایسے موقع پر سنجیدہ مزاح کا طریقہ ہی زیادہ مناسب ہے۔ تلخی اور کشیدگی کے وقت آدمی اس حالت میں نہیں ہوتا کہ وہ دلائل کی زبان کو سمجھے۔ ایسے وقت میں بہترین صورت یہی ہے کہ کوئی پُرلطف جملہ بول کر ذہن کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیا جائے۔

یہ اصول گھریلو سطح پر بھی کارآمد ہے، اور جماعتی سطح پر بھی اور دو گروہوں کے باہمی نزاعات کے موقع پر بھی۔ آدمی اگر اپنے ہوش و حواس نہ کھوئے، اور جھنجھلاہٹ سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے تو وہ ہر ایسے موقع پر کوئی دل چسپ بات پالے گا جس سے وہ لوگوں کی برہمی کو ٹھنڈا کر سکے۔

مزاح کو اگر عادت کے طور پر اختیار کیا جائے تو وہ ایک معیوب بات ہے۔ لیکن مزاح کو اگر تدبیر کے طور پر اختیار کیا جائے تو وہ ایک پسندیدہ چیز بن جائے گی۔ کیوں کہ بعض اوقات مزاحیہ کلام وہ کر دیتا ہے جو سنجیدہ کلام نہیں کر سکتا۔

سبب یہاں ہے

۱۷ مارچ ۱۹۹۰ کو میں دہلی سے ایک بیرونی سفر پر روانہ ہوا۔ اردن ایئر لائنز پر سفر کرتے ہوئے اس کا انفلائٹ میگزین الاجنحۃ (مارچ ۱۹۹۰) پڑھنے کو ملا۔ اس کے صفحہ ۵۸ پر ایک عرب خاتون یمانبیل کا مضمون چھپا ہوا تھا۔

مذکورہ عرب خاتون اسپین (غرناطہ) گئیں۔ وہاں انھوں نے عرب دور کے آثار دیکھے۔ ان پُر عظمت آثار کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ یہاں انھوں نے تاریخ النصر العربی کو بھی دیکھا اور تاریخ الذل العربی کو بھی۔ انھوں نے کہا کہ کبھی عرب کی عظمت یہاں تھی، اور یہیں سے پانچ سو سال پہلے عرب کی ذلت شروع ہوئی۔ وہ اپنے دل سے پوچھتی رہیں کہ عرب کی یہ رات کب تک باقی رہے گی (الیٰ متی سیستمر ھذا اللیل العربی)

سفر سے واپس آیا تو ڈاک میں دہلی کا سہ روزہ دعوت (۲۸ مارچ ۱۹۹۰) موجود تھا۔ اس کے پہلے صفحہ کے مضمون کی سرخی ان الفاظ میں چھپی ہوئی تھی: اسلامی دنیا آخر اتنی بے سہارا، بے وقعت اور بے وزن کیوں بن کر رہ گئی ہے۔

اس قسم کے مضامین آج مسلم دنیا کے کسی بھی پرچہ اور کسی بھی میگزین میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر مشہور عرب ہفتہ وار الدعوۃ نے اپنے شمارہ ۱۲ ذی القعدہ ۱۴۰۵ھ (۲۹ جولائی ۱۹۸۵) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں موجودہ حالات کا ذکر تھا۔ اس مضمون کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا گیا تھا: الیس للدین رب یحمیہ (کیا اس دین کا کوئی رب نہیں جو اس کی مدد کرے)

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کی دنیا میں مسلمان سب سے زیادہ پست اور حقیر اور مغلوب قوم بن گئے ہیں۔ ان کا یہ حال صرف ان ملکوں میں نہیں ہے جہاں وہ اقلیت کی حیثیت سے آباد ہیں۔ ان کا یہی حال ان ملکوں میں بھی ہو رہا ہے جہاں وہ اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں بظاہر ان کی آزاد حکومتیں قائم ہیں۔

یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ ان کی کس کمی کی بنا پر ان کا یہ حال ہو رہا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو آج مسلمانوں کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بظاہر ان کے پاس دین اور دنیا دونوں ہمیشہ سے زیادہ

مقدار میں موجود ہیں۔

آج دنیا میں مسلمانوں کے ۵۶ بااختیار ممالک ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ایک ارب ہے۔ یہ تعداد ماضی کے کسی بھی دور کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کے درمیان آج ہمیشہ سے زیادہ مسجدیں اور مدرسے ہیں۔ ۱۹۲۵ میں حج کا فریضہ ادا کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کم تھی (90,622) ۔ ۱۹۹۰ میں جن مسلمانوں نے حج ادا کیا، ان کی تعداد پندرہ لاکھ (1,500,000) ہے۔ جب کہ اس سال ایرانی مسلمان حج کے لئے نہیں آئے تھے۔

قرآن اور حدیث اور دوسری اسلامی کتابیں آج اتنی زیادہ مقدار میں ہیں کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خدا اور رسول کے نام پر آج جتنے جلسے اور سمینار اور کانفرنس ہو رہی ہیں ان کی تعداد ساری انسانی تاریخ میں ہونے والے تمام جلسوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ آج مسلمان ایسے اسلامی اجتماعات منعقد کر رہے ہیں جن میں ۲۵ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمی بیک وقت جمع ہوتے ہیں، جب کہ رسول اللہ کے آخری اجتماع (حجۃ الوداع) میں جمع ہونے والے مسلمانوں کی کل تعداد بمشکل سوا لاکھ تھی۔ آج اسلامی نظام قائم کرنے کے نام پر اتنے ہنگامے جاری ہیں کہ اگر تمام انبیاء کی مجموعی آوازیں اکٹھا کی جائیں تو ان کی آوازیں اس کے مقابلہ میں دب کر رہ جائیں گی۔ آج مسلمانوں نے اتنے بڑے بڑے اکابر پیدا کر رکھے ہیں جن میں سے کوئی "عہد آفریں شخصیت" کا حامل ہے اور کسی کے متعلق اس کے معتقدین یہ اعلان کر رہے ہیں کہ :

ہمارے حضرت والا کے فیض سے یارو ۔ تمام عالم اسلام جگمگا رہا ہے

یہ تمام چیزیں مسلمانوں کے پاس وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود وہ ساری دنیا میں پست اور حقیر ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان سب کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جو مسلمانوں کو عزت اور غلبہ کے مقام تک پہنچاتی ہے، اور وہی چیز آج ان کے پاس موجود نہیں۔

اگر آپ اسلام کی مطلوبہ چیزوں کی فہرست بنا کر اس معاملہ پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ موجودہ مسلمانوں کے یہاں اگرچہ تمام چیزیں موجود ہیں، مگر ایک چیز ان کے درمیان سے مکمل طور پر غائب ہے، اور وہ دعوت ہے۔ بدقسمتی سے جو چیز حذف ہوئی وہی اس معاملہ میں اصل اہمیت رکھتی تھی :

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

[redacted]

آج مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر دعوت ہی ایک ایسا کام ہے جس کا ان کے یہاں سرے سے کوئی وجود نہیں۔ اس معاملہ میں ان کی دوری کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کام کرتے ہیں اور اس پر دعوت کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی اصلاح کے کام کو دعوت بتا رہا ہے کوئی اپنے قومی فخر کے اظہار کو دعوت کا نام دئے ہوئے ہے۔ کوئی دوسری قوموں سے قومی اور مادی جنگ لڑتا ہے اور اس کو دعوت کا عمل قرار دیتا ہے۔ کوئی شاعری اور خطابت کے مظاہرے کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دعوت کا کام انجام دے رہا ہے۔ وغیرہ

دعوت دراصل دعوت الی اللہ کا نام ہے۔ اس سے مراد وہ عمل ہے جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کہا گیا ہے۔ یعنی اقوام عالم کو خدا کی مرضی سے آگاہ کرنا۔ انھیں آنے والے دن سے باخبر کرنا۔ انھیں خدا کے اُس منصوبہ کی اطلاع دینا جو خدا نے زندگی اور موت کے بارہ میں مقرر فرمایا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ خدا کے بندوں کو جہنم کے راستہ سے ہٹا کر جنت کے راستہ پر لگانے کی کوشش کا نام دعوت ہے۔

دعوت کا یہ عمل ہمیشہ محبت کی زمین پر اگتا ہے۔ دعوت کا کام وہ لوگ انجام دیتے ہیں جو انسانوں کے انجام آخرت کو سوچ کر تڑپ اٹھے ہوں اور انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے کے لئے دیوانہ وار نکل پڑیں۔ مدعو کو محبوب بنائے بغیر کبھی دعوت کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے ذلت اور ہزیمت کا تجربہ ہوا۔ اس تجربہ نے مسلمانوں کے دلوں میں دوسری قوموں کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ وہ دوسری قوموں کو دشمن یا حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے لئے محبت کا موضوع نہ رہیں، وہ صرف نفرت کا موضوع بن کر رہ گئیں۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس نے مسلمانوں سے داعیانہ جذبہ کو چھین لیا۔ اور ان کے درمیان دعوتی عمل کو زندہ ہونے نہیں دیا۔

دین رحمت کی پیغام رسانی کے لئے داعی کے اندر محبت و شفقت کا جذبہ ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ کوئی شخص ایسے لوگوں کے اوپر دعوت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا جو اس کی نظر میں مبغوض بنے ہوئے ہوں۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں سے نفرت کرکے اپنے اندر داعیانہ صلاحیت کھو دی ہے۔ موجودہ حالت میں ان کا دعوت کا نام لینا صرف ایک مذاق ہے، وہ کسی سنجیدہ ارادہ کا اظہار نہیں۔

دعوت الی اللہ کی لازمی شرط صبر ہے۔ مسلمانوں کو داعی بننے کے لئے سب سے پہلے صابر بننا پڑے گا۔

دوسری قوموں سے خواہ انھیں کتنی زیادہ ناخوشگواری کا تجربہ ہو۔ دوسری قوموں کی طرف سے انھیں خواہ کتنا ہی زیادہ مادی نقصان پہنچایا جائے۔ دوسری قوموں کی جانب سے خواہ انھیں کتنا ہی زیادہ اشتعال انگیزی کا تجربہ ہو، ان سب کے باوجود انھیں دوسری قوموں کا خیرخواہ بنے رہنا ہے۔ انھیں یک طرفہ طور پر تمام ناخوش گوار باتوں کو صبر کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔

یک طرفہ صبر دعوت کے عمل کو انجام دینے کی لازمی شرط ہے۔ اس یک طرفہ صبر کے بغیر مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دوسری قوموں پر اپنی دعوتی ذمہ داری کو ادا کر سکیں۔ اور جب تک مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داری کو انجام نہ دیں، ان کے حالات کبھی بدلنے والے نہیں۔ کوئی دوسرا عمل خواہ کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں کیا جائے، وہ ان کے احوال کو بدلنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اتنی سنگین ہے کہ اس میں معمولی کوتاہی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ناقابل قبول ہے، کجا کہ اس کو مستقل طور پر ترک کر دیا جائے۔

یہ معاملہ سیدنا یونس علیہ السلام کی مثال سے بخوبی طور پر واضح ہے۔ حضرت یونس قدیم عراق (نینوا) میں دعوت توحید کے لئے بھیجے گئے۔ انھوں نے اہل نینوا کو دعوت دی۔ مگر ابھی دعوت کا عمل اپنی تکمیل (اتمام حجت) تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ قوم کو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ روش پسند نہیں آئی۔ ان کو مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا گیا۔ قرآن کا بیان ہے کہ اگر وہ اپنی کوتاہی کا اقرار کرکے دوبارہ اپنی مخاطب قوم کی طرف جانے کے لئے تیار نہ ہوتے تو وہ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہتے (الصافات ۱۴۴)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ انھوں نے اپنی مدعو اقوام پر دعوت کا عمل سرے سے انجام نہیں دیا۔ بلکہ اپنی نفرت بڑھانے والی سرگرمیوں کے ذریعہ اس کی راہ میں مزید رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اس غفلت کے نتیجہ میں وہ خدا کی گرفت میں آگئے ہیں۔ وہ آج خدا کے عتاب کی زد میں ہیں۔ وہ تمام زیادتیاں جن کا تجربہ انھیں دوسری قوموں کی طرف سے ہو رہا ہے اور جس کو وہ دوسری قوموں سے منسوب کرکے ان کے خلاف احتجاج یا ٹکراؤ کر رہے ہیں، وہ سب یقینی طور پر خدا کی طرف سے ہیں۔ یہ خدا کی تنبیہ ہے نہ کہ دوسری قوموں کا ظلم یا سازش۔

معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ ایک معاملہ جو خدا کی طرف سے ہو، اس کو آپ انسان کی طرف سے سمجھ لیں تو آپ اس سے خلاصی کی تدبیر کو بھی صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ اپنی آخری صورت میں عین وہی ہے جو اپنی ابتدائی صورت میں بلا تشبیہ حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آج دنیا بھر کے مسلمان "مسائل کے پیٹ" میں ہیں۔ ان کو مسائل کی عظیم مچھلی نے نگل رکھا ہے۔ ان کو فالتقمہ الحوت کا تجربہ کرایا جا رہا ہے۔

مسلمان اس پیٹ سے ہرگز نکل نہیں سکتے جب تک وہ دعوت الی اللہ کے معاملہ میں اپنی کوتاہی کی تلافی نہ کریں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ اس خدائی کام کے لئے اٹھیں اور اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیں۔ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک اقوام عالم پر خدا کی حجت پوری نہ ہو جائے۔

اگر مسلمانوں نے اپنی اس کوتاہی کی تلافی نہ کی تو وہ قیامت تک مسائل کے بطن (پیٹ) میں پڑے رہیں گے۔ کوئی دوسرا عمل، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا ہو اور کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں کیا جائے، انھیں اس گرفتاری سے نجات دینے والا نہیں۔ جب گرفتاری کے اس معاملہ کا سبب دعوتی کوتاہی ہے تو دوسرا عمل کیوں کر انھیں اس گرفتاری سے نکالنے والا بن سکتا ہے۔

دوڑنے والوں کو خدا کی طرف دوڑنا چاہئے۔ اگر وہ انسانوں کی طرف دوڑتے رہے تو وہ انسانوں کو بھی کھو دیں گے، اور خدا کو تو وہ پہلے ہی سے کھوئے ہوئے ہیں۔

خدمت کا کرشمہ

نئی دہلی کے انگریزی پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے (۱۵ اگست ۱۹۹۰ء) میں صفحہ ۹۸ پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا ہے۔ محمد حنیف سلیمان (۴۵ سال) لکھنؤ کے ایک مسلمان باربر ہیں۔ وہ پچھلے دس سال سے مسٹر ملائم سنگھ یادو کی حجامت بناتے رہے ہیں۔ مسٹر یادو پہلے صرف ایک نیتا تھے اب وہ یوپی کے چیف منسٹر ہیں۔ محمد حنیف سلیمان نے مسٹر یادو سے کہا کہ آپ ایک بڑے عہدے پر پہنچ گئے ہیں۔ مجھے لکھنؤ کے بازار حضرت گنج میں ایک دکان دلا دیجئے۔

مسٹر یادو اس پر راضی ہو گئے۔ مگر وہ اس کے بعد اپنے وعدہ کو بھول گئے۔ محمد حنیف سلیمان چند مہینے تک انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے چیف منسٹر کی رہائش گاہ پر جانا چھوڑ دیا۔ مسٹر یادو نے دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ محمد حنیف سلیمان ان کی وعدہ خلافی پر ناراض ہیں اور اس بنا پر ان کے یہاں جانا چھوڑ دیا ہے۔ مسٹر یادو کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ سلیمان کے لیے حضرت گنج میں ایک دکان تلاش کرو۔ افسروں نے حضرت گنج میں دوڑ دھوپ کی تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں کوئی بھی دکان خالی نہیں ہے۔

حضرت گنج میں لکھنؤ ڈولپ منٹ اتھارٹی کے پاور ڈپارٹمنٹ کا ایک سرکاری دفتر موجود تھا۔ مسٹر یادو کے حکم پر یہ دفتر خالی کر کے سلیمان کو دے دیا گیا تاکہ وہ وہاں اپنی دکان کھول سکیں۔ رپورٹر کے مطابق اس وقت ۱۲۵۰ لوگ حضرت گنج میں دکان حاصل کرنے کے منتظر ہیں۔ سلیمان نے ان سب پر چھلانگ لگا کر ایک دن میں لکھنؤ کی اہم ترین مارکیٹ میں ایک ایسی دکان حاصل کر لی جس کی قیمت اس وقت پانچ لاکھ روپیہ ہے۔ اب محمد حنیف سلیمان نے اس دکان میں اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اس دکان کے اوپر اس نام کا بورڈ لگا ہوا ہے: بمبئی ہیر ڈریسرز (Bombay Hair Dressers) اور رپورٹر کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سلیمان نے جو کچھ کہا اس کو رپورٹر نے اپنی زبان میں اس طرح نقل کیا ہے کہ میں اپنی سیوا کی وجہ سے اس کا حقدار تھا:

I deserved this much for all my seva.

پیشگی جانچ

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جب اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو ابراہیم نے اسماعیل سے کہا کہ اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تم سوچ لو کہ تمہاری رائے کیا ہے۔ اسماعیل نے کہا کہ اے میرے باپ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کو کر ڈالیے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں پائیں گے (الصافات ۱۰۲)

اس آیت میں "صبر" کا لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے بیٹے اسماعیل کو لٹایا اور اپنے خواب کے مطابق، ان کی گردن پر چھری چلائی تو اس فعل سے اللہ کا مقصود اسماعیل کو ذبح کرنا نہ تھا بلکہ ان کے صبر کا امتحان لینا تھا۔ کیونکہ خدائی منصوبہ کے مطابق، ان کو عرب کے بے آب و گیاہ صحرا میں آباد ہونا تھا۔ وہاں مستقل مزاجی کے ساتھ آباد ہونے کے لیے صبر کی غیر معمولی صفت درکار تھی، حضرت اسماعیلؑ نے پیشگی آزمائش کے مطابق یہ ثابت کر دیا کہ یہ ضروری صفت ان کے اندر مکمل طور پر موجود ہے۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ انھیں صحرائے عرب میں چھوڑ کر چلے گئے۔

اس واقعہ سے پیغمبرانہ طریق کار کا ایک اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی شخص یا کسی گروہ کو کسی بڑی مہم میں لگانا ہو تو سب سے پہلے مناسب امتحان کے ذریعہ یہ معلوم کیا جائے کہ آیا اس شخص یا اس گروہ میں وہ مطلوبہ صفت اطمینان بخش مقدار میں موجود ہے یا نہیں جو مہم میں کامیابی کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنے کے لیے ضروری ہوگی۔

بنی اسرائیل کے رہنما نے یہی اصول اپنی قوم کے ساتھ اختیار کیا تھا جب انھوں نے دریا پار کرتے ہوئے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کوئی شخص اس سے پانی نہ پیے (البقرہ ۲۴۹)

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا ہر اقدام ناکامی سے دوچار ہوا ہے۔ اور اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی اہلیت کے بارہ میں کبھی کوئی جانچ نہیں کی۔ انھوں نے پرجوش تقریروں کے ذریعہ قوم کو اکسایا اور اس کے بعد اس کو صحراؤں اور سمندروں میں دوڑا دیا۔

جذبۂ عبودیت

۲ اگست ۱۹۹۰ کو عراق کے حکمراں صدام حسین نے اپنی ایک لاکھ فوج کویت میں داخل کر دی۔ انھوں نے کویت پر قبضہ کر کے اعلان کر دیا کہ کویت آج سے عراق کا حصہ ہے۔ اس کے بعد امریکہ نے دوسری مغربی طاقتوں کو ساتھ لے کر وہ فوجی کارروائی کی جس کو صحرائی ڈھال (Operation Desert Shield) کہا جاتا ہے۔ بہت بڑی طاقت نے عراق اور کویت کو گھیر لیا اور اس کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔ امریکہ کا مطالبہ تھا کہ عراق غیر مشروط طور پر کویت کو خالی کرے اور عراق کے حکمراں صدام حسین کا کہنا تھا کہ اب وہ پیچھے جانے والے نہیں۔

اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کسی بھی وقت ہولناک جنگ چھڑ سکتی ہے، عراق اور کویت میں جو بیرونی لوگ کمائی کے لیے گئے تھے، وہ اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ہندستان کے ۱۷۲۰۰۰ آدمی کویت میں تھے اور ۹۰۰۰ آدمی عراق میں کام کر رہے تھے۔ ہندستان کے وزیر خارجہ اندر کمار گجرال نے عراق اور کویت کا دورہ کیا تاکہ ہندستانیوں کو وہاں سے واپس لانے کا بندوبست کر سکیں۔

۲۲ اگست ۱۹۹۰ کو مسٹر گجرال کا ہوائی جہاز دہلی واپس آیا تو کویت کے ۲۰۰ عورتیں اور بچے اور مرد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۳ اگست ۱۹۹۰) میں ان کی واپسی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک جزء یہ تھا کہ جہاز جب دہلی ایئرپورٹ پر اترا تو واپس آنے والے ہندستانیوں نے بھارت ماتا کی جے کے نعرے لگائے۔ ان میں سے کچھ نے زمین پر گر کر اسے چوما:

As the plane touched down at the airport, the evacuees raised slogans of "Bharat mata ki Jai". Some of them kissed the soil (p.14).

بھارت کی زمین کو چومنا گویا اپنے اس احساس کا اظہار تھا کہ میں اپنے پناہ دہندہ کی پناہ میں آگیا۔ یہی کسی ہستی کو معبود بنانا ہے۔ یہ معبود صرف خدا ہے۔ کیونکہ وہی دینے والا بھی ہے اور وہی چھیننے والا بھی۔ مگر انسان نہ دکھائی دینے والے خدا پر یقین نہیں کر پاتا۔ اس لیے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا خدا فرض کر لیتا ہے۔ عبودیت کا جذبہ فطری طور پر انسان کے اندر موجود ہے۔ مگر اپنی بے شعوری کی بنا پر وہ ایسا کرتا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر وہ غیر خدا کو اپنے جذبۂ عبودیت کا مرکز بنا لیتا ہے۔

تعمیر کی طاقت

مئی ۱۹۹۰ء کا واقعہ ہے ۔ کراچی کی ایک سڑک پر دونوں طرف سے گولیاں چل رہی ہیں ۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ زخمی ہو رہے ہیں ۔ لاشیں زمین پر پڑی ہوئی نظر آتی ہیں ، کلاشنکوف (kalashnikov) کے ذریعہ مہاجروں اور سندھیوں میں فائرنگ کے تبادلے ہو رہے ہیں ۔ پولس کے افراد بھی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے ہیں ۔

اتنے میں سائرن کی آواز آتی ہے ۔ جلد ہی ایک ایمبولنس گاڑی سڑک پر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے ۔ جیسے ہی ایمبولنس سامنے آتی ہے ، دونوں طرف کے لوگ اپنی اپنی فائرنگ روک دیتے ہیں ۔ ایمبولنس کھڑی ہوتی ہے ، اس کے آدمی مردہ لاشوں کو اور زخمیوں کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھتے ہیں ۔ اس پوری کارروائی کے دوران لڑائی بند رہتی ہے ۔ جب ایمبولنس چلی جاتی ہے تو دوبارہ وہی لوگ اس طرح لڑنا شروع کر دیتے ہیں جیسے کہ وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں ۔

یہ کراچی کے عبدالستار ایدھی (۶۱ سال) ہیں ۔ انھوں نے اپنی ۳۰ سال کی بے غرضانہ خدمت سے لوگوں کے اندر اتنا احترام پیدا کیا ہے کہ جہاں وہ پہنچ جائیں ، وہاں لوگوں کے سر ان کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ، خواہ وہ فسادی اور دہشت گرد کیوں نہ ہوں ۔

عبدالستار ایدھی کی تعلیم صرف چھٹے درجہ تک ہو سکی تھی ۔ ۱۹۴۷ء میں وہ جوناگڑھ سے نقل وطن کر کے پاکستان چلے گئے ۔ وہاں وہ حصول معاش کے لیے معمولی کام کرتے رہے ۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ پاکستان میں ایمبولنس سروس بہت کمزور ہے ۔ ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوا ۔ انھوں نے قرض اور چندہ کی مدد سے ایک پرانا ٹرک خریدا اور اس کے اوپر پردہ لگا کر اس کو ایمبولنس گاڑی کے طور پر استعمال کرنے لگے ۔

زخمیوں اور مریضوں کو اسپتال لے جانا ، لاوارث لاش کو قبرستان پہنچانا ، اس قسم کے رفاہی کاموں میں وہ سرگرم ہو گئے ۔ ان کے خلوص اور محنت کو دیکھ کر لوگوں نے تعاون کرنا شروع کیا ۔ انھوں نے مزید ایمبولنس گاڑیاں خریدیں ۔ یہاں تک کہ اب ان کے پاس ۳۵۰

گاڑیوں کا دستہ ہے جو سب کی سب سائرن، وائرلیس، گیس سلنڈر وغیرہ سے لیس ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے دو ہیلی کاپٹر خریدے ہیں تاکہ دور تک کے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرسکیں۔

اسی کے ساتھ انھوں نے اسپتال، زچہ گھر، یتیم خانے اور مختلف قسم کے رفاہی مراکز قائم کر رکھے ہیں، اب انھوں نے گیارہ ایکڑ کی ایک زمین حاصل کی ہے۔ یہاں وہ اپنے تمام شعبے قائم کریں گے۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر ہیلی کاپٹر کو ٹھہرانے اور اتارنے کا میدان بھی بنایا جائے گا۔

۳۰ سال پہلے عبدالستار ایدھی کی مفلسی کا یہ عالم تھا کہ ان کی ماں بیمار ہوئی تو نہ ان کے پاس دوا لانے کے پیسے تھے اور نہ ماں کو اسپتال لے جانے کا سادھن۔ ان کی ماں نہایت تکلیف کی حالت میں مرگئی۔ مگر ماں کی موت نے ان کو ایک نئی زندگی دے دی۔ اس سے ان کو سخت جھٹکا لگا۔ انھوں نے سوچا کہ اسی طرح کتنے غریب ہوں گے جو تکلیف میں تڑپتے ہوں گے، مگر کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے خدمت خلق کا ایک ادارہ قائم کریں گے۔ ۳۰ سال پہلے یہ ادارہ انھوں نے نہایت معمولی حالت سے شروع کیا تھا۔ آج وہ اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس کا سالانہ بجٹ بارہ کرور روپیہ ہے۔ جس شخص کا حال یہ تھا کہ مرض الموت میں مبتلا اپنی ماں کی دوا خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے، وہ آج اپنے مرکز میں ۵۰۰ ، ۷ آدمیوں کے لیے کھانا اور کپڑا فراہم کر رہا ہے۔

عبدالستار ایدھی کو عالمی انعام (Magsayay Award) دیا گیا ہے۔ امریکہ کے کثیر الاشاعت ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ (جون ۱۹۸۹ء) نے ان کے بارہ میں ایک تعریفی مضمون شائع کیا تھا جس کا خلاصہ الرسالہ (فروری ۱۹۹۰ء) میں آچکا ہے۔ نئی دہلی کے انڈیا ٹوڈے (۳۰ جون ۱۹۹۰ء) نے سات صفحہ کی ایک باتصویر رپورٹ شائع کی ہے۔ ان کا عنوان یہ ہے ——— پاکستان کا فادر ٹریسا:

Pakistan's Father Teresa.

تعمیری کام اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ اگر آپ واقعی معنوں میں کسی تعمیری کام کا نمونہ پیش کر دیں تو تمام لوگ آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، حتی کہ آپ کے کٹر مخالفین بھی۔

عبدالستار ایدھی کے لیے ایک نمونہ وہ تھا جو سطحی لیڈروں نے ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ پیش کیا ہے۔ یعنی "نظام" کے خلاف نعرہ اور جھنڈا کی سیاست لے کر کھڑا ہو جانا۔ وہ تیسرے درجہ کا ایک اخبار نکالتے اور موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ عوام کی مصیبت کی داستانیں چھاپنا شروع کر دیتے۔ وہ حکومتی اداروں سے مطالبات کی مہم چلاتے۔ وہ غصہ میں بھرے ہوئے نوجوانوں کی ایک بھیڑ جمع کرتے جو احتجاج کے نام پر بسیں جلاتا اور ہسپتالوں میں آگ لگاتا۔

اسی طرح عبدالستار ایدھی کے لیے ایک نمونہ وہ تھا جو نام نہاد اسلام پسندوں نے پیش کیا ہے۔ وہ "اسلامی نظام قائم کرو" کے نعرہ کے ساتھ سڑکوں پر نکل پڑتے۔ وہ عوام اور حکومت کے درمیان وہی نفرت اور کشاکش کا ماحول بناتے جو موجودہ اسلام پسندوں نے مجرمانہ طور پر ہر جگہ بنا رکھا ہے۔

عبدالستار ایدھی اگر اس قسم کے طریقے اختیار کرتے تو وہ اپنے ملک کے مسائل کو حل کرنے کے نام پر صرف اس کے مسائل میں اضافہ کرتے۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود اس مسئلہ کو حل کرنے کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ ان کا کام خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو، مگر وہ خود اپنے آپ سے عمل کا آغاز کریں گے۔

عبدالستار ایدھی کے اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۰ برس بعد انھوں نے پاکستان میں ایک ایسی تعمیری تاریخ بنائی جس کا ہندستان سے لے کر امریکہ تک اعتراف کیا جا رہا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں اسی ملک کے دوسرے رہنما بربادی اور تخریب کے سوا کوئی اور تاریخ نہ بنا سکے۔

اسلام کا سیلاب

امریکہ میں ایک ٹی وی تنظیم ہے جس کا نام اے بی سی ہے۔ وہ ہر روز شام کو "ورلڈ نیوز ٹو نائٹ" کے عنوان کے تحت اس دن کی اہم عالمی خبریں نشر کرتی ہے۔ ۱۶ فروری ۱۹۸۹ کو اس نے ٹیلی وژن دیکھنے والوں کو جو خبریں بتائیں، ان میں سے ایک اہم خبر یہ تھی کہ ریسرچ کرنے والوں کی ایک ٹیم نے رپورٹ دی ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے زیادہ تیز رفتار مذہب ہے۔ ان کے جائزہ کے مطابق ۲۰۲۵ تک دنیا کی آبادی میں ہر چار آدمی میں سے ایک آدمی مسلمان ہوگا۔ پچھلے سال عیسائی تنظیموں کی دو رپورٹوں میں بھی یہی بات کہی گئی تھی کہ اسلام کرۂ ارض پر سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے والا مذہب ہے۔

امریکہ (پلین فیلڈ) سے ایک انگریزی ماہنامہ شائع ہوتا ہے جس کا نام اسلامک ہورائزن (Islamic Horizons) ہے۔ اس نے اپنے شمارہ مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۹ میں اس رپورٹ کا خلاصہ شائع کیا ہے۔ وہ اس کے الفاظ میں یہ ہے:

> ABC's "World News Tonight" reported in its February 16, 1989 newscast that a new reliable study showed that Islam is the fastest growing religion in the world. According to researchers, one out of every four people in the world will be Muslim by the year 2025, about one generation from now. At least two reports from Christian organisations last year marked Islam as not only the fastest blooming religion on the planet but in the United States, as well (p.21).

نیو یارک میں دسمبر ۱۹۸۸ میں "مسلم ورلڈ ڈے" کے نام سے ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کی کارروائیاں نیو یارک کے پنٹا ہوٹل (Penta Hotel) میں انجام پائیں۔ اس موقع پر امریکہ کی کئی مشہور شخصیتیں بھی شریک ہوئیں۔ ان میں سے ایک امریکہ کے ممتاز بیرسٹر ولیم کنسٹلر (William Kunstler) بھی تھے۔

ولیم کنسٹلر کی تقریر نیو یارک کے انگریزی ہفت روزہ دی مینارٹ (The Minaret) میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں موصوف نے اسلام کی غیر معمولی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ کچھ دنوں بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہوگا۔ کل وہ دنیا کی آبادی کا چالیس فی صد حصہ ہو جائے گا اور اگلے پچاس برسوں میں وہ دنیا کی آبادی کا ساٹھ فی صد حصہ ہوگا:

Someday it will be the major religion of the world. Two-fifth tomorrow and three-fifth in the next 50 years.

۱۰ ستمبر ۱۹۸۹ کو ڈاکٹر محمد طاہر صاحب (حیدر آباد) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے لائبریری سائنس میں ماسٹر ڈگری لی ہے۔ اور انگریزی زبان میں چھپنے والی کتابوں اور مقالات پر ریسرچ کیا ہے۔ ان کے ریسرچ کا عنوان تھا:

English language material on Islamic studies.

انھوں نے ۱۹۱۰ سے لے کر اب تک انگریزی کی اسلامی مطبوعات کا جائزہ لیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۸۰ ہزار چھپی ہوئی چیزوں (references) کے اعداد و شمار جمع کئے۔ انھوں نے پایا کہ اسلام پر انگریزی کتابیں اور مقالے موجودہ زمانہ میں اتنے زیادہ چھپے ہیں کہ ان کو ایک عظیم انفجار (tremendous explosion) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں انگریزی اسلامی کتابوں کے اضافہ کی شرح یہ رہی ہے:

۱۹۱۰ ——— ۱۹۵۰ ۱۹۵۱ ——— ۱۹۸۰

۲۵ فی صد ۷۵ فی صد

گویا بیسویں صدی کے نصف اول میں اضافہ ۲۵ فی صد تھا، جب کہ اس صدی کے نصف ثانی میں یہ اضافہ ۷۵ فیصد تک پہنچ گیا۔ یہ واقعہ بے حد سبق آموز ہے۔

اسلام کی اس تیز رفتار ترقی کا راز کیا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری دین ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح کامل اور مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ وہ بڑھتا ہی رہے، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کی پیشین گوئی حدیث میں ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ زمین کی سطح پر کوئی پکا یا کچا گھر نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو گیا ہو (لا یبقیٰ علیٰ ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام)

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کے تمام معروف لیڈر انگریزوں اور فرانسیسیوں سے لفظی یا عملی لڑائی لڑنے میں مشغول تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس مغربی استعمار کو اگر ختم نہ کیا گیا تو وہ اسلام کو مٹا ڈالے گا۔ اس لئے سب سے پہلا کام اس سے لڑ کر مسلم دنیا پر اس

کے غلبہ کو ختم کرنا ہے۔ مسلم رہنماؤں کی لڑائی کا تو یک طرفہ جانی و مالی نقصان کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں نکلا۔ البتہ دوسری عالمی جنگ نے ان مغربی قوموں کو اتنا کمزور کر دیا کہ وہ ایشیا اور افریقہ سے اپنی فوجوں کو واپس بلالیں۔

اب مسلم ممالک مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو گئے۔ اس کے بعد ان ملکوں میں مقامی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان حکومتوں کے تمام ذمہ دارانہ مناصب پر وہ مسلمان قابض تھے جنھوں نے مغربی ملکوں میں تعلیم پائی تھی اور مغربی کلچر کو اپنا رکھا تھا۔ اب دوبارہ مسلم رہنما خود اپنے حکمرانوں سے لڑ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ "مغرب زدہ" مسلمان ہمارے لئے سابق مغربی حکمراں سے بھی زیادہ برے ہیں۔ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان کو اقتدار کی کرسیوں سے ہٹایا جائے۔ ورنہ یہ لوگ اسلام کا خاتمہ کر دیں گے اور آئندہ اسلام کے لئے کام کرنے کے مواقع باقی نہیں رہیں گے۔ یہ ناکام جنگ تادم تحریر کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ مگر کسی بھی ملک میں وہ تبدیلی اقتدار کے مرحلہ تک نہیں پہنچی۔

اسلامی رہنماؤں کی اس سیاسی ناکامی کے باوجود اسلام کا نظریاتی قافلہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے بلکہ وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف ثانی میں ہمیشہ سے زیادہ اسلامی لٹریچر شائع ہوا ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ اسلامی ادارے ساری دنیا میں قائم ہوئے ہیں۔ ہمیشہ سے زیادہ تعداد میں لوگ اسلام قبول کر کے اسلام کے حلقہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ وغیرہ

اس قسم کے بے شمار واقعات بتاتے ہیں کہ سیاسی حالات خواہ کچھ ہوں، اسلام کا سفر مسلسل جاری رہتا ہے۔ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی طاقت دے دی ہے جو کسی بھی خارجی سبب سے ختم ہونے والی نہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خارجی حالات کی مساعدت یا نامساعدت سے بے پروا ہو کر اسلامی دعوت کے میدان میں سرگرم رہیں، وہ سیاسی دفاع کے بجائے ہمیشہ نظریاتی اقدام کے میدان میں اپنا جہاد جاری رکھیں۔

میسور کے سلطان ٹیپو انگریزوں سے لڑتے ہوئے ۱۷۹۹ء میں شہید ہو گئے۔ اقبال کے نزدیک یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ انھوں نے لکھا کہ ٹیپو ہماری ترکش کا آخری تیر تھا جواب ہمارے پاس نہیں رہا:

ترکش مارا خدنگ آخریں

بیسویں صدی کے آغاز میں ترکی کی عثمانی خلافت ٹوٹنے لگی تو تمام مسلمان گھبرا اٹھے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی شبلی نعمانی کے اس شعر میں ملتی ہے:

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع وملت ہے   عزیزو فکرِ فرزند وعیال وخانماں کب تک

مگر یہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں کی کوتاہی تھی۔ انھوں نے اپنی کوتاہ فکری کی بنا پر اسلام کی طاقت کا کمتر اندازہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو کسی سلطان یا کسی سلطنت کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنی طاقت سے زندہ رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ کسی کی موت یا کسی حکومت کا زوال اس کا راستہ روکنے والا نہیں۔

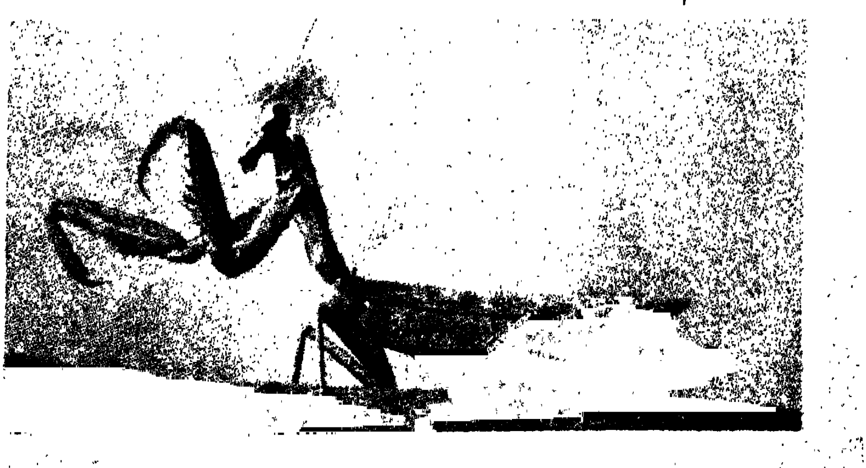
غلط فہمی

گرم علاقوں میں ایک خاص قسم کا پتنگا پایا جاتا ہے۔ اس کو عام طور پر عبادت گزار مینٹس (praying mantis) کہا جاتا ہے۔ زیادہ صحیح طور پر اس کا نام شکاری مینٹس (preying mantis) ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ کیڑوں مکوڑوں کا شکار کرکے ان سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔

مینٹس کی دنیا بھر میں ایک ہزار قسمیں دریافت کی گئی ہیں۔ وہ ایک انچ سے سات انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ اپنے ماحول کے اعتبار سے اس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً بھورا، لال اور ہرا۔

ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے گھر کے پاس کھلی زمین میں اپنا کچن گارڈن (kitchen garden) بنایا۔ چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں دھنیا، مرچا، بیگن، ٹماٹر وغیرہ کی کاشت کی۔ جب پودے بڑھے اور خوب سرسبز ہوگئے تو ایک روز اس نے دیکھا کہ اس کی کیاری کے اندر بڑے بڑے دو ہرے رنگ کے کیڑے موجود ہیں۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ یہ میری سبزیوں کو کھائیں گے اور ان کو نقصان پہنچائیں گے۔ اس نے فوراً ان دونوں کیڑوں کو پکڑا اور انھیں مار ڈالا۔

شام کو اس کا ایک دوست اس سے ملنے کے لئے آیا۔ وہ مقامی کالج میں علم نباتات (botany) کا استاد تھا۔ اس نے اپنے دوست سے فاتحانہ انداز میں کہا کہ آج میرے کچن گارڈن میں دو بڑے کیڑے آگئے۔ وہ میری سبزیوں کو کھانا چاہتے تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ میری سبزیوں کو نقصان پہنچائیں، میں نے انھیں مار کر ختم کردیا۔



اس واقعہ کو اس نے کچھ ایسے انداز سے بیان کیا کہ دوست کو خیال آیا کہ وہ نئے کیڑے کون سے تھے۔ اس نے پوچھا کہ وہ مرے ہوئے کیڑے کیا اب بھی موجود ہیں کہ میں انھیں دیکھوں۔ اس کے بعد آدمی نے اپنے دوست کو دونوں کیڑے دکھائے۔ دوست نے کہا کہ تم نے تو بڑی نادانی کی۔ تم جانتے نہیں، یہ تو مینٹس ہے، اور مینٹس سبزی خور کیڑا (herbivorous) نہیں، وہ تو مسلّمہ طور پر ایک گوشت خور کیڑا (carnivorous) ہے۔ وہ یہاں قدرت کی طرف سے تمہاری مدد کے لئے آیا تھا۔ اس کی فطرت کے خلاف تھا کہ وہ کسی سبزی کو کھائے۔ وہ تمہاری سبزیوں کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچاتا۔ وہ صرف ان کیڑوں کو کھاتا جو سبزیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، اور جن کو ختم کرنا تمہارے لئے سخت مشکل ہے۔ تم بھی کیسے نادان نکلے کہ تم اپنے فائدہ اور نقصان کو نہ سمجھ سکے۔ تم نے اپنے ایک قیمتی چوکیدار کو مار ڈالا۔

دوست کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی آدمی کی زبان بند ہوگئی۔ اس کو اپنے کئے پر بے حد افسوس ہوا۔ یہاں تک کہ وہ بیمار پڑگیا اور کئی دن تک کام کرنے کے قابل نہ رہا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کسی آدمی کو کتنی بڑی بڑی کوتاہیوں میں مبتلا کر سکتی ہے۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص شدید غلط فہمی میں پڑکر دوسرے شخص کی جان مار ڈالے، حالاں کہ یہ دوسرا شخص بالکل بے قصور ہو۔ وہ ایک آدمی کو بے عزت کرنے پر تل جائے، حالاں کہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ ایسا آدمی ہو کہ اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا سلوک کیا جائے۔

اسی لئے شریعت میں یہ حکم ہے کہ رائے قائم کرنے یا کسی کے خلاف اقدام کرنے سے پہلے اس کے معاملہ کی پوری تحقیق کرو۔ ایسا ہرگز مت کرو کہ کسی کے خلاف ایک خبر سنو اور فوراً اس کو مان لو، اور اس کے خلاف ایک بُرا اقدام کر بیٹھو۔ عین ممکن ہے کہ تحقیق کے بعد تم کو معلوم ہو کہ جو خبر تم کو پہنچی تھی، وہ خبر سراسر غلط اور بے بنیاد تھی:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس ایک خبر لائے تو تم اس خبر کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچادو، پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے (الحجرات ۶)

غلط خبر کو سن کر اس کے انجام سے بچنے کی تدبیر نہایت آسان ہے ـــــ وہ یہ کہ کسی بات کو سننے کے بعد اس وقت تک اسے نہ مانا جائے جب تک براہ راست ذرائع سے اس کی تحقیق نہ کرلی جائے۔

نے خطبہ شروع کیا۔

خطبہ حسب معمول مقفیٰ انداز میں تھا۔ اس کا قافیہ " نا " تھا۔ امام نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس کو پڑھنا شروع کیا۔ اس میں قافیہ کے مطابق اس طرح کے الفاظ تھے۔ مثلاً سترأ وعلنا ، مابَعُدَ وادنیٰ ۔ وغیرہ۔

نماز کے بعد باہر نکلے تو مانگنے والوں کی قطار تھی۔ بھیک مانگنے کا رواج ہندستان ہی کی طرح سینیگال میں بھی پایا جاتا ہے۔ تاہم ہندستان کے مقابلہ میں غالباً کم ہے۔

۱۲ مئی کی صبح مجھے دکار سے واپس روانہ ہونا تھا۔ ہوٹل میں اپنے کمرہ کی کھڑکی کھول کر باہر کی طرف دیکھا تو سمندر اور آسمان اور اڑتی ہوئی چڑیوں اور سورج کی ہلکی روشنی کے مناظر تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر اپنی مسلسل اٹھتی ہوئی موجوں کے ساتھ اذا ذکر اللہ وجلت قلوبہم کی کیفیت کو نشر کر رہا ہے۔ چڑیاں حمد خداوندی کے نغمے بکھیرتی ہوئی فضا میں اڑ رہی ہیں۔ سورج اپنا آفاقی ٹارچ جلا رہا ہے تاکہ خدا کی نشانیوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ ٹھنڈی ہواؤں میں ہلتے ہوئے درخت زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اگر خدا کے کرشموں (آلاء) کو دیکھ کر تمہارے اندر تموج (thrill) پیدا نہیں ہوتا تو تم نے اس دنیا میں نہ کچھ دیکھا اور نہ اس دنیا میں کچھ پایا۔

اس دنیا کی ہر چیز حمد خداوندی کی تسبیح میں مشغول ہے۔ مسبحین کے اس عظیم اجتماع میں صرف ایک انسان ہے جو رب العالمین کا تسبیح خواں نہ بن سکا۔ جو پتھر کی طرح سخت دل ثابت ہوا ، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت۔

ہوٹل کے اس کمرہ میں ایک ہفتہ سے زیادہ مقیم رہا۔ آج جب اس کو چھوڑ کر باہر نکلا تو خیال آیا کہ اسی طرح مجھے ایک روز موجودہ دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ آج میں منتظمین کانفرنس کی مقرر کی ہوئی تاریخ کے تحت ہوٹل کا کمرہ چھوڑ رہا ہوں ، کل خدا کی مقرر کی ہوئی تاریخ کی بنا پر مجھے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف جانا ہوگا۔ کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آچکا ، اور کیسا عجیب ہوگا وہ وقت جو آنے والا ہے۔

دکار سے جنیوا جاتے ہوئے راستہ میں لندن کا انگریزی اخبار ٹیلی گراف

(The Daily Telegraph) ۱۱ مئی ۱۹۹۰ پڑھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک رپورٹ درج تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانیہ کے متمدن شہر ۴۸ قسم کی آوازوں کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ مثلاً سوتے وقت لوگوں کا خراٹے لینا۔ وغیرہ۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ مشہور گن فائٹر جان وسلی (John Wesley) ایک بار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ملے ہوئے کمرہ سے خراٹے کی آواز آنے لگی۔ اس سے وہ اتنا بدحواس (upset) ہوا کہ وہ دیوار توڑ کر دوسرے کمرہ میں داخل ہوا اور اس آدمی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

ہیلتھ سروسز اسٹاف کے ایک ذمہ دار پیٹر پیلٹ (Peter pallot) نے لکھا ہے کہ ہماری آبادیوں میں روزانہ برپا ہونے والے ۴۸ قسم کے شور جو لوگوں کو پاگل بنا رہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ برا شور کتوں کا بھونکنا ہے:

The sound of dogs barking is the worst of 48 everyday noises that drive people mad.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہذب ممالک اپنی ظاہری رونقوں کے باوجود کس قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ تاہم مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ اس قسم کی باتوں کو لے کر یہ کہا جائے کہ اس کا حل اسلامی نظام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایک یا دوسری قسم کے مسائل باقی رہیں گے۔ خواہ یہاں اسلامی نظام ہو یا غیر اسلامی نظام۔ مسائل اور مصائب سے خالی دنیا صرف آخرت میں ممکن ہے۔ اور ہم کو اسی کی طرف دعوت دینا چاہئے۔

اسلامی قانون کا نفاذ حقیقۃً کسی معاشرہ کی اجتماعی اطاعت ہے، جس طرح عبادت ایک فرد کی انفرادی اطاعت ہوتی ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ کو مسائل سے آزاد دنیا کی تعمیر کا نام دینا صرف سطحیت ہے۔ مزید یہ کہ اس میں یہ اندیشہ ہے کہ کسی ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کے باوجود جب مسائل کا خاتمہ نہ ہو تو لوگ خود اسلام سے مایوس ہو جائیں یا اس کے بارہ میں بری رائے قائم کرنے لگیں۔ مسائل کے حل کی بات جزئی طور پر صحیح ہو سکتی ہے۔ مگر وہ کلی طور پر درست نہیں۔

دکار سے جنیوا جاتے ہوئے جہاز میں میرے قریب ایک صاحب تھے۔ تعارف کے بعد

معلوم ہوا کہ وہ امریکی ہیں۔ ان کا نام کانریڈ (Conrad) تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کمیونی کیشن انجنیئر ہیں اور واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

کھانے کے وقت انھوں نے "ریڈ وائن" کا آرڈر دیا۔ یہاں سے گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ شراب کیوں پیتے ہیں۔ تفریح کے لئے یا غذا کے لئے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں کے لئے۔ میں نے کہا کہ کچھ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ شراب صحت کے لئے مضر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر چیز کی زیادتی (excess) مضر ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ شراب ایک عادت ہے، اور جب کسی چیز کی عادت پڑ جائے تو آدمی ایسا نہیں کر پاتا کہ وہ ایک حد سے زیادہ اس کو استعمال نہ کرسکے۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ خدا اور مذاہب میں یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ وجہ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ مذہب لوگوں کو آپس میں لڑاتا ہے۔ میں نے کہا کہ لڑائی کا تعلق مذہب سے نہیں۔ انھوں نے کہا :

Why people kill each other in the name of God.

میں نے کہا کہ مذہبی لوگ نہیں لڑتے بلکہ سیاسی لوگ مذہب کے نام پر لڑائی کرتے ہیں۔ وہ مذہبی لوگوں کی برائیاں بتاتے رہے۔ میں نے کہا کہ مذہبی لوگ اگر غلط کریں تو اس سے خدا کا عقیدہ غلط ثابت نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ آپ ایک انجنیئر ہیں۔ یہ بتائیے کہ اگر کچھ لوگ ایٹمی توانائی کا غلط استعمال کریں تو کیا آپ ایٹمی توانائی کے وجود کا انکار کردیں گے۔ اس کے بعد ان کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ مگر میں خدا کے وجود کو نہیں مانتا۔

ڈیلی ٹیلی گراف میں ایک ہوائی حادثہ (air crash) کی رپورٹ درج تھی۔ پچھلے دن ایک ہوائی جہاز (Midland 737) انگلینڈ میں گر کر تباہ ہوگیا۔ ۴۷ آدمی مر گئے۔ چند آدمی جو بچ گئے تھے۔ انھوں نے آخر وقت کی آنکھوں دیکھی کہانی بتائی۔ ایک بچے ہوئے مسافر نے کہا کہ آخر وقت میں جب کہ جہاز میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر زندگی سے ناامید ہوچکے تھے، اس نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یسوع مسیح، اب ہم مرنے والے ہیں :

Jesus, we are going to die

ایک مسافر جو بچ گیا تھا، اس نے اخباری نمائندہ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میرا بھروسہ جہاز کے عملہ کے اوپر تھا :

My faith was in the crew.

ایک جہاز کے دو آدمی ایک طرح کے حالات میں پہنچ کر بالکل دو قسم کے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک اپنے خدا کی طرف دیکھتا ہے، دوسرا، جہاز چلانے والے انسانوں کی طرف۔ یہ مشہور حدیث کے مطابق، غالباً تربیت کے فرق کا نتیجہ ہے۔ جس آدمی کی تربیت نے اس کے ذہن میں "مسیح" کی اہمیت بٹھائی تھی، اس کے ذہن نے اس کو مسیح کی یاد دلائی، اور جس آدمی کی تربیت نے اس کے ذہن میں "عملہ" کی اہمیت بٹھا رکھی تھی، اس کے ذہن نے اسے بتایا کہ اس کو اس نازک موقع پر اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ جہاز کا عملہ ہے۔

ظہر اور عصر کی نماز جنیوا ایئرپورٹ پر پڑھی۔ اِس وقت میں ایئرپورٹ کے گیٹ نمبر ۴۲ پر اگلے جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے سامنے کھلے ہوئے میدان میں مختلف ہوائی کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی جہاز ایئرپورٹ پر اترا، یا کوئی جہاز یہاں سے روانہ ہوا۔

اسی طرح دنیا میں ہر وقت کوئی انسان آرہا ہے، اور کوئی یہاں سے رخصت ہو رہا ہے۔ دنیا آنے اور جانے کی جگہ ہے۔ بسنے اور آباد ہونے کی جگہ صرف وہ ہے جس کو آخرت کہا جاتا ہے۔

جنیوا سے فرینکفرٹ کے لئے سوئس ایئر ۵۴۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں سوئس ایئر کا میگزین (Swissair Gazette) مئی ۱۹۹۰ کا شمارہ دیکھا۔ اس شمارہ میں مصر اور دریائے نیل کے بارہ میں ایک مفصل مضمون شامل تھا۔ قدیم مصر میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، ان میں سے کچھ بتوں کی تصویریں اس میں دی گئی تھیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قدیم مصر کے لوگوں نے بت تراشی میں غیر معمولی کمال حاصل کیا تھا۔

ایک بت کی تصویر کے نیچے بامعنی طور پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ـــــ فرعون کے زمانہ میں وہ پوجے جاتے تھے۔ آج وہ ثقافتی ورثہ کا ایک حصہ ہیں :

In pharaonic times they were worshipped,
today they are part of a cultural patrimony.

ان الفاظ کی پوری معنویت اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک اس میں یہ اضافہ نہ کیا جائے کہ قدیم زمانہ میں شرک ساری دنیا میں تہذیبی طاقت بن کر چھایا ہوا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب نے اس مشرکانہ غلبہ کو ختم کر دیا۔ اگر یہ مشرکانہ غلبہ ختم نہ کیا جاتا تو دنیا میں کبھی وہ دور نہیں آسکتا تھا جس کو آج سائنسی ترقی کا دور کہا جاتا ہے (ملاحظہ ہو: اسلام دور جدید کا خالق)

فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر حفاظتی ہدایت (security advice) کے عنوان کے تحت دیواروں پر لکھا ہوا تھا کہ اپنے سامان کو رکھوالی کے بغیر نہ چھوڑیں:

Do not leave your baggage unattended.

اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہی معاملہ آدمی کو خود اپنے نفس کے ساتھ کرنا ہے۔ ہر آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کا نگراں بنا رہے۔ ورنہ اس کا نفس اس کو تباہی کے راستہ پر ڈال دے گا اور پھر کوئی چیز اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہ بن سکے گی۔

۲۱ مئی کی شام کو فرینکفرٹ پہنچا۔ یہاں مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے جیسے عاجز انسان کے ساتھ نصرت کا خصوصی معاملہ فرمایا۔

میرا اندازہ تھا کہ فرینکفرٹ میں چند گھنٹہ انتظار کے بعد مجھے اگلی فلائٹ دہلی کے لئے مل جائے گی۔ مگر یہ میرے اندازہ کی غلطی تھی۔ یہاں دراصل مجھے پندرہ گھنٹہ انتظار کرنا تھا۔ میں لفتھانسا کے کاؤنٹر پر گیا کہ آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس جرمنی کا ویزا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسی حالت میں آپ جرمنی کے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کے پاس ویزا ہوتا تو ہم شہر کے کسی ہوٹل میں آپ کے لئے ٹھہرنے کا انتظام کر دیتے۔ میں نے کہا کہ آپ میری مدد کریں کہ ایسی حالت میں میں کیا کروں۔

کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون نے ٹیلی فون پر کسی سے بات کی۔ بات کرنے کے بعد کہا کہ آپ یہاں ٹھہریئے۔ ابھی ایک لیڈی آرہی ہیں وہ آپ کو بتائیں گی۔ چند منٹ کے بعد ایک جرمن خاتون آگئیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں کمبل تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹرے جس میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ شہر میں تو داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں ایئرپورٹ کے لاونج میں ٹھہریئے۔ یہ آپ

کے لئے کھانے کا سامان ہے، اور یہ آپ کے اوڑھنے کے لئے کمل ہے۔

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ رات گزارنے کے بعد اگلی صبح کو یہ کمل میں کس کو واپس کروں۔ انھوں نے کہا کہ اس کو واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ ہی کا ہے۔ یہ پوری گفتگو انگریزی زبان میں ہوئی۔

پھیلے ہوئے لاونج میں ہر قسم کی عمدہ کرسیاں سیکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ بیٹھنے کے لئے بھی اور سونے کے لئے بھی۔ رات نہایت آرام اور سکون کے ساتھ گزری۔

اس واقعہ کے بعد مجھے ایک صاحب کا قصہ یاد آیا جو انھوں نے مجھے بتایا تھا۔ میں ہندستان کے ایک مشہور اسلامی ادارہ میں تین سال تک رہا ہوں۔ ۱۹۶۶ میں جب کہ میں اپنے وطن گیا ہوا تھا، وہ مجھ سے ملنے کے لئے مذکورہ ادارہ میں آئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت میں یہاں موجود نہیں ہوں تو انھوں نے سوچا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ یہ مغرب بعد کا وقت تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ رات وہاں کی مسجد میں گزاریں اور صبح کو واپس چلے جائیں۔ چنانچہ عشا کی نماز کے بعد وہ مسجد میں ایک طرف لیٹ گئے۔

کچھ دیر کے بعد ادارہ کا چوکیدار آیا۔ اس نے کہا کہ مسجد میں سونا منع ہے، اس لئے آپ یہاں نہیں سو سکتے۔ انھوں نے کہا کہ اچھا، میں بیٹھ کر رات گزار لوں گا۔ چنانچہ وہ دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد چوکیدار دوبارہ آیا۔ اس نے کہا کہ آپ مسجد میں بیٹھ کر بھی نہیں رہ سکتے۔ اس لئے آپ باہر جائیں۔ وہ باہر نکل کر ایک چبوترہ پر لیٹ گئے۔ چوکیدار پھر آیا۔ اس نے کہا کہ اجنبی آدمی کو ادارہ کے اندر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے آپ یہاں سے چلے جائیں۔

انھوں نے چوکیدار سے کہا کہ تم مجھ کو یہاں کے ذمہ دار کے پاس لے چلو، میں ان سے بات کروں گا۔ اس کے بعد چوکیدار انھیں ایک کمرہ میں لے گیا۔ یہاں ادارہ کے اساتذہ رات کی چائے پی رہے تھے۔ وہ دروازہ پر کھڑے ہو گئے۔ نہ کسی نے ان کو بیٹھنے کے لئے کہا اور نہ چائے کی پیش کش کی۔ دروازہ پر کھڑے کھڑے انھیں حکم دے دیا گیا کہ آپ اس طرح ادارہ کے اندر رات نہیں گزار سکتے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما مغرب کی جو تصویر پیش کرتے ہیں اس کے مطابق، مغرب کی برتری کا راز اس کی "دسیسہ کاری" ہے۔ اس نے سازشی تدبیروں کے ذریعہ دنیا کے اوپر اپنا غلبہ قائم

کر رکھا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک لغوبات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب اپنی اخلاقی طاقت کے بل پر قائم ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے اخلاقی زوال کی بنا پر موجودہ زمانہ میں اپنی جگہ حاصل نہ کرسکے۔ قوموں کے عروج وزوال میں جو چیز فیصلہ کن ہے وہ اخلاق ہے نہ کہ سازش اور دسیسہ کاری۔

سفر میرے لئے تجرباتی مطالعہ کے ہم معنی ہے۔ ہر سفر میں کچھ نئی باتیں دریافت ہوتی ہیں۔ موجودہ سفر میں جو نئی باتیں سمجھ میں آئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ مغربی قوموں کی اخلاقیات کا راز کیا ہے۔ یہ سوال بہت عرصہ سے کیا جاتا رہا ہے کہ مشرقی قوموں کے مقابلہ میں مغربی قوموں میں جو بلند اخلاقی پائی جاتی ہے، اس کا راز کیا ہے۔

اس کا راز نہایت سادہ ہے اور وہ تجارت ہے۔ مثلاً مذکورہ واقعہ میں لفتھانسا ہوائی کمپنی اور اسلامی تعلیمی ادارہ میں اخلاقیات کا فرق کیوں ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ لفتھانسا ایک تجارتی ادارہ ہے اور مذکورہ اسلامی ادارہ (دوسرے تمام اسلامی اداروں کی طرح) ایک ایسا ادارہ جو چندہ اور تبرعات پر چلتا ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تجارت سے کردار پیدا ہوتا ہے اور چندہ سے بے کرداری۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان بحیثیت قوم تجارت میں داخل نہ ہوسکے۔ اس لئے ان کے اندر وہ کردار بھی پیدا نہ ہوسکا جو ایک تاجر کے اندر لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ فرق چھوٹے پیمانہ پر ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندو ایک تاجر قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں تاجر قوم نہ بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں میں نسبتاً کردار ہے، جب کہ مسلمان ان کے مقابلہ میں کردار سے خالی ہیں۔

یہ فرق یورپ میں بہت زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ ہندو صرف ابتدائی درجہ کے تاجر ہیں۔ اس لئے ان میں ابتدائی درجہ کی اخلاقیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی قومیں (اور جاپان) زیادہ بڑے درجہ کے تاجر ہیں۔ تجارت میں وہ تمام قوموں سے بہت زیادہ آگے جاچکے ہیں۔ اس لئے ان میں کردار کی طاقت بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔

مسلمانوں میں کردار پیدا کرنے کے لئے ان کا ایمان کافی تھا۔ مگر موجودہ مسلمان ایک زوال یافتہ قوم ہیں۔ ان کے اندر وہ زندگی نہیں جو جاندار قوموں میں ہوتی ہے۔ اس

لئے ان کا ایمان ایک بے روح ایمان بن کر رہ گیا۔ اور بے روح ایمان اسی طرح اخلاقیات کو پیدا کرنے سے عاجز رہتا ہے جس طرح بنجر زمین لہلہاتی ہوئی فصل اگانے سے۔

ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں میری کرسی کے قریب دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک شخص امریکی لہجہ میں بول رہا تھا۔ دوسرا کسی اور لہجہ میں۔ امریکی مسافر کسی تعلیمی ادارہ میں تھا اور بتا رہا تھا کہ میں اکثر کانفرنسوں میں جاتا رہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں اس نے بتایا کہ میں فلاں فلاں کارروائیاں کرتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو میرے پاس کانفرنسوں کے دعوت نامے نہیں آئیں گے۔ پھر میں کیا کروں گا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس کے بعد تو میرے پاس کرنے کا کوئی کام ہی نہ ہوگا:

Otherwise I have no job.

عین یہی معاملہ زیادہ بری شکل میں ہمارے لیڈروں کا ہے۔ وہ ایک نہ ایک جھگڑے کا شوشہ کھڑا کرتے رہتے ہیں۔ کوئی مذہبی جھگڑا کرتا ہے، کوئی قومی جھگڑا، اور کوئی سیاسی جھگڑا۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر جھگڑے کا ماحول نہ ہو تو وہ بے روزگار (jobless) ہو جائیں گے۔

فرینکفرٹ میں ایک بہت بڑا تجارتی ادارہ " بزنس انفارمیشن سروس " کے نام سے قائم ہے۔ اس کا صدر دفتر ایئرپورٹ سنٹر کی نویں منزل پر ہے، اور اس کی شاخیں ساری دنیا میں قائم ہیں۔

فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر اس تجارتی ادارہ کا ایک شاندار اشتہار تھا۔ اس میں یہ بتاتے ہوئے کہ ہم آپ کے بہترین تجارتی مشیر ہیں، یہ کہا گیا تھا کہ فلاں فلاں نمبر پر آپ ہم کو ٹیلیفون کر دیں، ہم خود آکر آپ کو اپنے مرکز میں لے جائیں گے:

Please call us...We will come to accompany you.

یہ دیکھ کر خیال آیا کہ کاش اسی طرح اسلامی دعوت کے مراکز جگہ جگہ قائم ہوتے اور ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا جاتا کہ ـــــ آپ ہم کو مطلع کریں، ہمارے آدمی آپ کو اپنے ساتھ مرکز میں لائیں گے۔ تاکہ آپ یہاں آکر اسلام کا مطالعہ کر سکیں۔

فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر فنانشیل ٹائمز (۱۲ مئی ۱۹۹۰) پڑھا۔ اس میں ایک رپورٹ ٹیکس کی

ادائگی کے بارہ میں تھی۔ اس کا عنوان تھا: جب شادی مفید ہوتی ہے (When marriage pays)۔
اس میں بتایا گیا تھا کہ افراد عام طور پر یہ چاہتے ہیں کہ انھیں سرکاری ٹیکس کم سے کم ادا کرنا پڑے۔
موجودہ قوانین کے تحت اس کی ایک صورت نکاح ہے۔ ایک مستحکم اور پر مسرت ازدواجی زندگی
کم سے کم ٹیکس ادا کرنے کی ایک پیشگی شرط ہے:

A stable and happy marriage may be a prerequisite for paying the smallest amount of income and capital gains tax.

مغرب میں غیر شادی شدہ ازدواجی زندگی گزارنے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں بے شمار سماجی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اب مغرب کے دانشور اپنے لوگوں کو اقتصادی محرک بتا کر انھیں ازدواجی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں تجربات نے ثابت کیا ہے کہ مذہبی طرز زندگی ہی صحیح طرز زندگی ہے۔ مگر اس کے باوجود ابھی تک مذہب کی عظمت جدید دور میں قائم نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ مذہبی لوگوں کا داخلی زوال ہے۔ اہل مذاہب کے اخلاقی اور عملی زوال نے مذہب کی نظریاتی صداقت کی نفی کر رکھی ہے۔ اہل مذاہب کی عملی زبوں حالی مذہب کی نظریاتی عظمت کے اوپر ایک قسم کا پردہ بن گئی ہے۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لئے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۷۶۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ مسلسل ساڑھے سات گھنٹہ کی پرواز تھی۔ میں نے اپنے دہلی پہنچنے کا پیغام اگرچہ فیکس کے ذریعہ پہلے بھیج دیا تھا۔ تاہم مزید احتیاط کے لئے آج میں نے جہاز کے عملہ کو ایک پیغام لکھ کر دیا کہ اس کو دہلی کے ٹیلیفون نمبر پر منتقل کر دیں۔ انھوں نے فوراً میرا کاغذ لے لیا اور کہا کہ یہ پیغام ہم اپنے دہلی کے آفس کو دوران پرواز بھیج دیتے ہیں۔ وہ دہلی میں آپ کے آفس کے ٹیلیفون نمبر پر مطلع کر دیں گے۔

یہ ہوائی کمپنیوں کا عام دستور ہے۔ مسافر کی منزل پر اگر ہوائی کمپنی کا دفتر ہے تو وہ پرواز سے پہلے یا دوران پرواز مسافر کا پیغام بھیج دیتے ہیں۔ یہ سہولت صرف اس وقت ہے جب کہ منزل کے مقامی ٹیلیفون نمبر پر مطلع کرنا ہو۔ مثلاً وہ میرا پیغام دہلی کے ٹیلیفون نمبر پر بھیج سکتے ہیں۔ مگر وہ اس

کو بنارس کے ٹیلیفون نمبر پر نہیں بھیجیں گے۔ یہ سہولت لوکل کال کے لئے ہے۔ ٹرنک کال کے لئے نہیں۔

جہاز کے اندر لفتھانسا میگزین (Lufthansa Bordbuch) کا تازہ شمارہ مئی۔ جون ۱۹۹۰ دیکھا۔ اس کے صفحہ ۶۵ پر بتایا گیا تھا کہ لفتھانسا نے امریکہ کے لئے نان اسموکنگ پروازیں (non-smoking flights) حال میں شروع کی ہیں۔ اس میں مزید بتایا گیا تھا کہ امریکی حکومت نے حال میں اندرونی پروازوں پر تمباکو نوشی پر پابندی لگا دی ہے:

> The U.S. Administration recently introduced a general ban on smoking on domestic routes under six hours.

ایک زمانہ تھا کہ تمباکو نوشی فیشن میں داخل ہو گئی۔ بڑے بڑے لوگ سگریٹ اور سگار کا دھواں نکالنے کو اپنی بڑائی کا نشان سمجھنے لگے تھے۔ مگر آج سائنسی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ تمباکو نوشی صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ چنانچہ اب مختلف طریقوں سے سگریٹ نوشی پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔

ہمارا جہاز ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا تیزی سے دہلی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو سورج روشن تھا اور چاروں طرف اجالا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد اپنی گھڑی پر نظر گئی تو اس میں آٹھ بج رہے تھے۔ گویا اس وقت جب کہ ہندستان میں رات کے آٹھ بج چکے تھے، یہاں میں مکمل طور پر اجالے میں اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

زمین پر اجالے اور اندھیرے کا یہ فرق سورج کے گرد زمین کی محوری گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر جگہ ایک ہی وقت میں شام یا ایک ہی وقت میں صبح نہیں ہوتی۔ بلکہ مختلف وقتوں میں ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں مختلف انداز میں اشارے کئے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک رب المشارق والمغارب (۷۰/۴۰) ہے۔ یعنی اس مالک کائنات کی قسم، جو زمین پر بے شمار مشرق اور بے شمار مغرب پیدا کرتا ہے۔

سورج کے گرد زمین کی گردش بلاشبہہ حیران کن حد تک ایک عظیم واقعہ ہے۔ یہ واقعہ خاموش زبان میں اعلان کر رہا ہے کہ اس کائنات کا مالک بے پناہ حکمت والا اور بے پناہ قدرت والا

ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین کی یہ حیرت ناک گردش اتنی صحت کے ساتھ مسلسل قائم نہ رہ سکے۔

جہاز میں زیورک کا انگریزی اخبار انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون (۱۲-۱۳ مئی ۱۹۹۰) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۶ پر ایک مضمون تھا جس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا گیا تھا:

From Kuwait to Algiers, A new political openness

مضمون میں دکھایا گیا تھا کہ مسلم ملکوں میں ہر جگہ پرو ڈیموکریسی موومنٹ ابھر رہی ہے۔ ۲۲ سال کے بعد دسمبر ۱۹۸۹ میں اردن میں الکشن ہوا۔ امیر کویت نے ۱۹۸۶ میں پارلیمنٹ توڑ دی تھی، اب کویت میں دوبارہ الکشن کے انعقاد کا اعلان کیا گیا ہے۔ اسی طرح تیونس اور الجیریا میں جون ۱۹۹۰ء میں میونسپل الکشن کئے جا رہے ہیں، وغیرہ۔

اس مضمون کے لکھنے والے مسٹر گولڈ اسٹین (Eric Goldstein) تھے۔ مذکورہ قسم کی مثالیں دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ اکثر عرب حکومتیں آزادانہ سیاسی سرگرمیوں کو ایک ایسی حد تک گوارا کر رہی ہیں جو پچھلے سالوں تک لامعلوم تھا:

Many Arab governments are tolerating independent political activity to an extent unknown in recent years.

مغرب کے دانشور آج کل اپنے آپ کو ایک نئے یقین کی حالت میں پا رہے ہیں۔ سوویت یونین میں کمیونسٹ نظام کی ناکامی اور جمہوری نظام کی طرف جھکاؤ نے ان کو یہ یقین دیا ہے کہ ان کا نظام زیادہ بہتر ہے۔ اب مسلم ملکوں میں جمہوریت کی طرف رجحان ان کے یقین میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ تمام نظامات ختم ہو کر مغربی جمہوریت کے نظام کے لئے جگہ خالی کر دیں گے۔

اسلام نے انسانی تاریخ میں پہلی بار جمہوریت کے دور کا آغاز کیا تھا۔ مگر بعد کے دور میں مسلم حکمرانوں کے غیر جمہوری عمل نے غیر ضروری طور پر مغرب کو اس فخر کا موقع دے دیا کہ ان کے نظام کو (اسلام سمیت) تمام دوسرے نظاموں پر برتری حاصل ہے۔

اگر آپ جغرافی نقشہ کو اپنے سامنے رکھیں تو کاغذی نقشہ کے اعتبار سے میرے لئے سیدھی روٹ یہ نظر آئے گی: دکار۔ نیجر۔ جدہ۔ دہلی۔ یعنی افریقی علاقہ میں سفر کرتے ہوئے ایشیا میں داخل

ہو جاتا۔ مگر میں نے ڈکار۔ جنیوا۔ فرینکفرٹ۔ دہلی کا راستہ اختیار کیا۔ یعنی میں افریقہ سے یورپ گیا، اور یورپ سے لوٹ کر ایشیا کی طرف آیا۔

اس کی وجہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کا صنعتی پچھڑا پن ہے۔ آج کا زمانہ مواصلات (communications) کا زمانہ ہے۔ مگر مواصلات کے جدید ذرائع زیادہ تر مغربی ملکوں میں مہیا ہوتے ہیں۔ اس لئے ایشیا اور افریقہ کے درمیان روابط مغرب ہی کے واسطہ سے قائم ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما آخری جو چیز جانتے تھے، وہ صرف سیاست تھی۔ اپنے روایتی ذہن کی بنا پر انھوں نے سیاست ہی کو سب کچھ سمجھا۔ وہ سیاست کے میدان میں مغرب سے ٹکراؤ کرتے رہے۔ وہ سائنس کی اہمیت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ چنانچہ سیاست کے علاوہ باتوں کو وہ سمجھ نہ سکے اور نہ ان باتوں میں انھوں نے مسلمانوں کو بر وقت رہنمائی دی۔ موجودہ زمانہ کی پوری مسلم تاریخ میں کوئی ایک رہنما بھی ایسا نہیں جس کے اقوال و اعمال سے ثابت ہو کہ وہ سائنسی ذہن رکھتا تھا یا سائنس کی اہمیت سے واقف تھا۔

اسی غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ سیاسی زنجیروں سے رہائی کے باوجود تمام مسلم ممالک مغرب کی غیر سیاسی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں اپنے پچھڑے پن کی وجہ سے وہ تمام جدید شعبوں میں مغرب کی مدد لینے پر مجبور ہیں۔

۱۳ مئی ۱۹۹۰ کو دہلی پہنچا۔ ایرپورٹ پر امیگریشن سے فارغ ہو کر آگے بڑھا تو کسٹم کے مقام پر لوگوں کی دار وگیر ہو رہی تھی۔ ہر آدمی اپنا سامان لئے ہوئے کسٹم والوں کی پکڑ میں تھا۔ اور سامان کھول کھول کر ہر ایک کی جانچ کی جا رہی تھی۔ میں وہاں ایک لمحہ کے لئے ٹھہرا۔ فوراً ہی کسٹم کا ایک آدمی میری طرف متوجہ ہوا اور کہا: آپ جائیے، آپ جائیے۔ گیٹ کے باہر آیا تو وہاں ایک صاحب گاڑی کے ساتھ مجھے لے جانے کے لئے موجود تھے۔

میں نے سوچا تو یہ پورا معاملہ میرے ذہن میں قیامت کے واقعہ کی صورت میں ڈھل گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں دنیا سے نکل کر قیامت کے میدان میں داخل ہوا ہوں۔ احتساب کے فرشتوں کو دیکھ کر رک جاتا ہوں۔ اچانک احکم الحاکمین کی طرف سے آواز آتی ہے کہ تم جاؤ، تم جاؤ۔ آگے بڑھتا ہوں

تو رحمت کے فرشتے استقبال کے لئے آجاتے ہیں تاکہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جاکر " دار الخلد " میں پہنچا دیں۔
حدیث قدسی میں آیا ہے کہ انا عند ظن عبدی بی (میں بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں)
کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اپنے عاجز بندے کے اس گمان کو پورا کر دے اور ایئر پورٹ کے دنیوی تجربہ کو
میرے لئے آخرت کے معاملے کی پیشگی خبر بنا دے۔

الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات مندرجہ ذیل پتوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں:

Mr Ahmed Bakhtiaruddin
Statistics Deptt.
Ministry of Health
Riyadh 11176
Saudi Arabia
Tel. 4012220 Ext. 1461

FazLeesons Ltd.
Urdu Bazar
Karachi
Pakistan
Tel. 212289

Mr Khaja Kaleemuddin
1439 Ocean Ave, 4C,
Brooklyn
New York 11230
U.S.A.
Tel. 7182583435

Naqshe Kokan
Masalawa Building
2nd Floor
56, Tandel Street North
Dongri
Bombay 400 009
Tel. 864968

Kusisum Mitab Ghar
9, Jama Masjid
Maulana Baba Lane
Bandra (West)
Bombay 400 050
Tel. 6425201, 6428589

Al-Risala Academy
3-5-780/19/2
King Kothi
Hyderabad 500 039
Tel. 231607

Tajamul Husain Khan
120 Lower Chitpur Road
Calcutta 700 073

Mohammad Iliyas
91 Colootola Street
Calcutta 700 073

Abdullah News Agency
First Bridge, Lal Chowk
Srinagar 190 001
Kashmir

قومی نہ کہ اسلامی

موجودہ زمانہ میں مسلمان جہاں جہاں آباد ہیں، خواہ وہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، ہر جگہ انھوں نے اسلام کے نام پر سرگرمیاں جاری کر رکھی ہیں۔ ان سرگرمیوں کو کچھ لوگ صحوہ اسلامیہ (اسلامی بیداری) کہتے ہیں۔ مگر یہ اس لفظ کا غلط استعمال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام نہاد سرگرمیاں نہ تو صحوہ ہیں اور نہ اسلامیہ۔ اسلام کے نام پر ہونے والی ان سرگرمیوں کو صحیح طور پر صرف ایک نام دیا جاسکتا ہے، اور وہ منفی ردّ عمل ہے۔

ان سرگرمیوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو ان سب میں ایک چیز مشترک طور پر موجود ملے گی۔ اور وہ ہے کسی نہ کسی دوسرے گروہ کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف لفظی یا عملی تحریک چلانا۔ کسی ملک میں یہ تحریک خود اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کے خلاف چل رہی ہے۔ جن کو یہ تحریک چلانے والے بددین یا دشمنوں کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ کہیں یہ تحریک غیر مسلم قوم کے خلاف جاری ہے جو "مسلم دشمن" ہونے کی بنا پر ان تحریکوں کی حریف بنی ہوئی ہیں۔ کہیں کوئی حکمراں گروہ اسلامی قانون کی راہ میں رکاوٹ نظر آتا ہے، اس لیے اس کو اقتدار سے ہٹانے کے نام پر ہنگامے کیے جارہے ہیں۔

صحوہ اسلامیہ کے تحت چلنے والی تمام تحریکوں کا نشانہ احتساب غیر ہے۔ جب کہ صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جس کا نشانہ احتساب خویش ہو۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ سرگرمیاں حقیقۃً صحوہ اسلامیہ کا معاملہ نہیں۔ یہ صرف ماحول کے خلاف منفی رد عمل ہے۔ اس سے یادہ اور کچھ نہیں۔

قومی ہنگاموں اور منفی ردّ عمل کو اسلام بتانا اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنا اشبہ جرم ہے۔ اور موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام رہنما اور دانشور اس جرم میں مبتلا ہیں۔ یہ بن وہی جرم ہے جس میں اس سے پہلے یہود مبتلا ہوئے۔ یہ قرآن کے الفاظ میں، آیات الٰہی کے لے ثمن قلیل خریدنا ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں اسی کا نام استغلال (exploitation) ہے۔ نا قومی اور دنیوی سرگرمیوں کو مذہب کا نام دینا۔

محتسبِ اقوام یا خیر خواہِ اقوام

ایک مسلم رہنما نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے عقیدہ کی رو سے محتسبِ اقوام ہیں۔ ایک اور رہنما نے لکھا ہے کہ مسلمان تمام قوموں کے اوپر خدائی فوجدار ہیں۔ تقریباً ایک صدی سے یہی بات ایک یا دوسرے لفظ میں کہی جا رہی ہے۔ شاعر اور خطیب اور انشا پرداز قسم کے لیڈر اس بات کو نہایت جذباتی انداز میں بیان کرتے رہے ہیں۔ حتی کہ اب موجودہ مسلم نسل کا یہی عام ذہن بن گیا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کا نوجوان طبقہ ہر جگہ اسی احساس حاکمیت سے سرشار نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ خاص نفسیات ہے جس کے تحت مسلم نوجوان ساری دنیا میں ان سرگرمیوں میں مشغول ہیں جن کو وہ بطور خود انقلابی سرگرمی کہتے ہیں اور دوسرے لوگوں نے جس کو توڑ پھوڑ اور دہشت گردی کا نام دیا ہے۔

مگر مسلمان کی شخصیت کے بارہ میں یہ حاکمانہ نظریہ سراسر لغو ہے۔ اس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں محتسبِ اقوام کی نہیں ہے، بلکہ خیر خواہِ اقوام کی ہے۔ مسلمان کو دعوت کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ مسلمان دوسری قوموں کے سامنے خدا کے دین کا داعی ہے۔ داعی روحانی ڈاکٹر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سچا ڈاکٹر خیر خواہی کی حد تک اپنے مریض کا خدمت گار ہوتا ہے۔ اسی طرح سچا داعی وہ ہے جو خیر خواہی کی حد تک لوگوں کی ہدایت کا حریص بن جائے۔

داعی کے لیے قرآن میں ناصح (خیر خواہ) اور امین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ داعی بیک وقت دو شدید احساس کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے دین کا امانت دار ہے۔ یہ احساس اس کے اندر آخری حد تک ذمہ داری کا جذبہ ابھار دیتا ہے۔ وہ اس ڈر سے کانپتا رہتا ہے کہ امانت کی ادائگی میں اگر ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو وہ خدا کے یہاں پکڑا جائے گا۔ دوسری طرف بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر تلخی کو اپنی ذات پر سہتے ہوئے مدعو کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں لانے کی کوشش کرے۔

اس طرح جو انسان بنے وہ خیر خواہِ اقوام ہوگا نہ کہ محتسب اقوام۔ وہ لوگوں کی نجات کے لیے تڑپے گا نہ کہ لوگوں کے اوپر حاکمانہ اختیار استعمال کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔

قرآنی تدبیر

از مولانا محمد منظور نعمانی

قرآن پاک کی ایک ہدایت ہے کہ جب کوئی تم سے برسرپیکار ہو اور تمہارے ساتھ برے طریقے سے پیش آئے تو تم اس کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرو اور خوب صورت طریقے پر اس کی بات کا جواب دو، اگر تم نے ایسا کیا تو جلد ہی دیکھو گے کہ دشمن تمہارا دلی دوست بن جائے گا۔

آگے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اس کی توفیق صرف ان خوش نصیبوں کو ہوگی جو برداشت کی صفت یعنی اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوں گے۔

یہ قرآن مجید کی آیت کا حاصل اور گویا لفظی ترجمہ ہے یقین ہے کہ جس کسی بندے نے بھی اس کی ہدایت پر عمل کیا ہوگا اس کو ضرور اس نتیجہ کا بھی تجربہ ہوا ہوگا جو قرآن مجید نے بتلایا ہے۔

ناچیز راقم سطور کو اعتراف ہے کہ اپنے مزاج کی فطری حدت یعنی تیزی اور نفس پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی اس زریں ہدایت وتعلیم پر عمل کی توفیق بہت ہی کم نصیب ہوئی ہے لیکن جب کبھی اللہ کی توفیق سے اس پر عمل نصیب ہوگیا تو اسی وقت کھلی آنکھوں وہ نتیجہ دیکھا جس کا وعدہ قرآن پاک کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کا اپنا ایک تجربہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اگست ۱۹۴۷ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یاد ہے کہ رمضان المبارک کی ۱۸ تاریخ تھی۔ ناچیز راقم سطور کو ۱۴۔۱۵ ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ سے دلی جانا تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد کرلی جائے کہ یہ وقت وہ تھا جب کہ ہندستان میں ہندو مسلم کشیدگی آخر حد تک پہنچ چکی تھی۔ کلکتہ نواکھالی اور بہار وغیرہ میں بڑے بڑے مہیب فساد ہو چکے تھے۔ اور بس ایک ہفتہ کے بعد ۱۵ اگست کو ملک کی باقاعدہ تقسیم عمل میں آنے والی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ لکھنؤ اور دہلی کے درمیان براہ راست ۳، ۴ ٹرینیں چلتی ہیں اس وقت ایک ٹرین بھی لکھنؤ سے دہلی براہ راست نہیں جاتی تھی۔ کانپور، مرادآباد تبدیل کرنی پڑتی تھی۔ ہم نے براہ مرادآباد دہرہ ایکسپریس سے سفر طے کیا۔ لکھنؤ سے اس کی روانگی کا وقت اس وقت بھی وہی تھا جو آج ہے یعنی تقریباً ۹ بجے شام۔ اپنے سفری تجربہ کی بنا پر مجھے سب سے آگے والے ڈبہ میں جگہ ملنے کی زیادہ امید تھی۔ اس لئے ہم لوگ وہاں کھڑے ہوگئے جہاں اس ڈبہ کے پہنچنے کی توقع تھی۔

اور ساتھیوں میں سے چند کو مقرر کر دیا کہ ٹرین جیسے ہی آکر رکے وہ مستعدی سے ڈبہ میں گھسنے کی کوشش کریں، اور جو جگہ بھی خالی نظر آئے اس کو ساتھیوں کے لئے گھیر لیں۔ اس کی تاکید کر دی گئی کہ کسی کو ایذا نہ پہنچے اور جھگڑا نہ ہو۔ ٹرین آکر رکی۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا اگلے ڈبہ سے مسافروں کی خاصی تعداد اتری اور کافی جگہ خالی ہوئی۔ ہمارے وہ چند ساتھی قرارداد کے مطابق پھرتی سے ڈبے کے اندر پہنچ گئے اور خالی شدہ سیٹوں پر اپنے کپڑے بچھا کر جگہ محفوظ کر لی اور دوسرے ساتھی بھی اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی پہنچ گیا۔

ایک سیٹ پر ایک ساتھی نے کپڑا بچھا دیا تھا۔ میں اسی کپڑے پر جاکر بیٹھ گیا۔ میرے برابر میں ایک اور ساتھی بیٹھ گئے۔ ایک پنڈت جی جو اسی ٹرین میں (صوبہ بہار کے کسی مقام سے آرہے تھے) اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً کسی ضرورت سے نیچے آئے وہ اندر آئے۔ زبان سے کوئی بات کہنے کے بجائے انھوں نے انتہائی اشتعال انگیز طریقہ پر ایک ہاتھ سے میرا بازو پورے زور سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے میرے دوسرے ساتھی کا۔ اس جگہ سے ہمیں اٹھانا چاہا۔ انھیں غالباً یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہم لوگ اتنی تعداد میں ہیں۔ جیسے ہی انھوں نے یہ حرکت شروع کی میرے بعض ساتھیوں نے بڑھ کر انھیں پکڑ لینے کا ارادہ کیا۔ میں نے اپنے بعض ساتھیوں سے ڈانٹ کر کہا کہ ہر شخص اپنی جگہ پر بیٹھے اور بالکل خاموش بیٹھے۔ اگر کچھ بات کرنے کی ضرورت ہوگی تو میں خود کر لوں گا۔ اس کے بعد میں نے ان پنڈت جی سے نرمی سے کہا کہ آپ زبان سے فرمائیے کہ کیا بات ہے اور آپ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے نہایت غصے کے ساتھ کہا آپ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں، یہ میری جگہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی یہ بات تو آپ سہولت سے بھی کہہ سکتے تھے۔ آپ نیچے اتر گئے تھے۔ ہمارے ساتھیوں نے یہ جگہ خالی دیکھی تو انھوں نے کپڑا بچھا دیا اور میں آکر یہاں بیٹھ گیا۔ اگر آپ سیدھے طریقے سے یہ فرما دیتے کہ یہ جگہ آپ کی ہے، یہاں آپ بیٹھے تھے تو یہ آپ ہی کی جگہ ہے۔ آپ یہاں بیٹھ جائیے۔ میں نے یہ کہہ کر وہ جگہ خالی کر دی۔ پنڈت جی کے اس رویے پر میرے بعض ساتھیوں کو پھر گرمی آنے لگی۔ تو میں نے ان سے کہا۔

آپ لوگوں میں سے کسی کو بولنے کا حق نہیں۔ جب یہ اس جگہ پر پہلے سے بیٹھے تھے تو انھیں کی جگہ ہے۔ بات ختم ہو گئی اور میں نے پنڈت جی کا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ پر ان کو بٹھا دیا۔ اور ساتھیوں کے ذہن کو دوسری طرف موڑنے کے لئے بہ حیثیت امیر قافلہ سفر کے اصول و آداب اور دعا وغیرہ کے بارے میں کچھ ہدایتیں دینا شروع کر دیں۔

ہم سب روزے سے تھے اور ٹرین کی روانگی کے صرف پانچ سات منٹ کے بعد افطار کا وقت ہونے والا تھا۔ ایک دوست جو ہم لوگوں کو صرف رخصت کرنے اسٹیشن آئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ اگر اسٹیشن پر برف مل جائے تو ایک سیر آپ لا دیجئے۔ وہ دوست برف تلاش کرنے کے لئے چلے گئے۔ ہمارے وہ مہربان پنڈت جی بھی خاموشی کے ساتھ ڈبے سے اترے۔ ہمارے جو دوست برف تلاش کرنے کے لئے گئے تھے وہ ابھی واپس نہ آئے تھے کہ پنڈت جی پانچ سیر برف کہیں سے خرید لائے اور خاموشی کے ساتھ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھ میں شرافت کی چمک اور ندامت کے آنسو تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ قبول کرلو۔ میں نے کہا کہ سر آنکھوں پر، لیکن یہ بہت زیادہ ہے۔ آپ اس کی قیمت لے لیں مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ بالآخر میں نے قبول کرلیا۔ اب ٹرین لکھنؤ سے روانہ ہوگئی۔ میں پنڈت جی سے ذرا فاصلے پر اپنے ساتھیوں کے پاس بیٹھ گیا۔

پنڈت جی خود اٹھ کر آئے اور مجھ سے کہا کہ بہت غلطی ہوئی، آپ وہاں بیٹھئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آرام سے بیٹھا ہوں آپ بلا تکلف اپنی جگہ بیٹھیں۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور کہا کہ اگر آپ وہاں چل کر نہیں بیٹھیں گے تو میں بھی نہیں بیٹھوں گا۔ بالآخر میں اسی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد جب آفتاب غروب ہوگیا تو ہم لوگوں نے روزہ افطار کیا اور ٹرین ہی میں مغرب کی نماز باجماعت پڑھی۔ پنڈت جی ادب کے ساتھ نماز ختم ہونے تک کھڑے رہے، اپنی جگہ پر بیٹھے بھی نہیں۔ سلام پھیرنے کے بعد جب انھیں اس حالت میں دیکھا تو اصرار کر کے بیٹھایا پھر بھی وہ اس وقت تک ادب سے بیٹھے رہے جب تک ہم سنتوں اور نفلوں سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ پھر کچھ دیر کے بعد عشا کا وقت آگیا ہم لوگوں نے جماعت سے عشا کی نماز اور جماعت ہی سے تراویح بیس رکعت پڑھی۔ اس پورے وقت میں پنڈت جی اس ادب سے بیٹھے رہے گویا وہ بھی دل سے ہمارے ساتھ نماز میں شریک رہے۔

ڈبے میں اتنی جگہ نہ تھی کہ ہم میں سے کوئی شخص سو سکے اوپر والی سیٹوں پر ان حضرات کے بستر لگے ہوئے تھے جو پہلے سے اس ٹرین پر سفر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک بستر پنڈت جی کا بھی تھا۔ ان کے علاوہ جن لوگوں کے بستر تھے سب جا کر لیٹ گئے۔ پنڈت جی نے اوپر کے ایک بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بستر میرا ہے اس پر آپ آرام کریں، میں نے کہا کہ پنڈت جی یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اپنے بستر پر آپ خود آرام کریں گے۔ پنڈت جی نے کہا یا تو اس پر آپ سوئیں گے ورنہ میں بھی نہیں سوؤں گا اور یہ رات بھر خالی پڑا

رہے گا۔ جب میں نے پنڈت جی کا اصرار دیکھا اور اندازہ کرلیا کہ واقعتاً وہ ایسا ہی کریں گے تو میں نے کہا کہ آپ مجھے اختیار دے دیجئے۔ خواہ میں خود سوؤں یا کسی دوسرے کو سلاؤں تو انھوں نے مجھے اختیار دے دیا۔

ہمارے ساتھیوں میں ایک بھائی نصیرالدین تھے جن کی صحت ایکسی ڈنٹ کی وجہ سے بہت خراب ہوگئی تھی گویا ہمیشہ مریض ہی رہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی نصیر تم سو جاؤ۔ پہلے انھوں نے معذرت کی پھر میں نے ان سے کہا کہ اچھا میں امیر قافلہ کی حیثیت سے آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ اس پر سو جائیں چنانچہ وہی سوئے۔

مرادآباد میں ہمیں ٹرین تبدیل کرنی تھی۔ رات کے دو بجے کے قریب جب مرادآباد آیا تو ہم لوگوں کو پنڈت جی نے اس طرح رخصت کیا جس طرح وہ اپنے عزیز ترین رشتہ داروں یا دوستوں کو رخصت کرتے۔ میرے دل پر آج تک پنڈت جی کے رویہ کا گہرا اثر ہے۔

قرآن مجید کی جس ہدایت و تعلیم کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اگر اس پر عمل کرنے کی توفیق قرآن والوں کو ہو جائے تو روزانہ ایسے ہی تجربے ہوں اور دین و دنیا کے کتنے ہی بند دروازے ہمارے لئے کھل جائیں۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ ۲۶ جولائی ۱۹۹۰)

خبرنامہ اسلامی مرکز ۶۷

۱ کلیم الدین صاحب نیو یارک میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ الرسالہ مشن کو پھیلانے کا کام موثر انداز میں کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مرکز کی تین کتابیں فوٹو کاپی کے ذریعہ چھاپی ہیں تاکہ ان کو بڑے پیمانہ پر پھیلائیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں: اسلام پندرہویں صدی میں۔ سچا راستہ (انگریزی) اپنے آپ کو پہچان (انگریزی)

۲ لاس اینجلیز (امریکہ) کی اسلامک سوسائٹی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے امریکہ کا سفر کیا۔ وہاں ان کے مختلف خطابات ہوئے۔ یہ سفر نومبر ۱۹۹۰ کے نصف ثانی میں ہوا۔ اس کی مفصل رپورٹ انشاء اللہ سفرنامہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳ بحرین کی وزارۃ العدل والشئون الاسلامیۃ کے تحت ایک عربی ماہنامہ الهدایۃ نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ میں مرکز کی عربی کتاب "تجدید الدین" پر ۹ صفحہ کا مفصل تعارف شائع ہوا ہے۔ تبصرہ نگار دکتور کارم السید غنیم نے آخر میں لکھا ہے کہ: فاننا نرى الكتاب الحالى من الاهمية بمكان عظيم ويتوجب على كل مسلم غيور ان يتعرف على ما جاء فيه (صفحہ ۱۷)

۴ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب جو یورپ میں رہتے ہیں، وہ الرسالہ مشن سے متاثر ہو کر اس کو یورپ میں پھیلا رہے ہیں۔ الرسالہ انگریزی اور دوسری انگریزی مطبوعات منگا کر وہاں لوگوں کو پڑھنے کے لئے دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ الرسالہ انگریزی کے خاص مضامین فوٹو کاپی کر کے بڑی تعداد میں لوگوں کے درمیان تقسیم کر رہے ہیں۔ اس قسم کے پمفلٹوں کے نیچے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ہیں:

For further information, please contact:
Tareq El'Kurdi, 21 Wolesely St.
South Circular road, Dublin 8

۵ مامون ابراہیم صاحب نیو یارک میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ الرسالہ انگریزی کے ذریعہ نیو یارک میں اسلام کی دعوت پہنچا رہے ہیں۔ بعض عیسائیوں نے ان کی کوشش سے اسلام قبول کر لیا ہے۔

۶ نواب خاں صاحب (غازی پور) نے بتایا کہ غازی پور کے علاقہ کم سارو بارجس میں ۴۰ بستیاں ہیں، وہاں شادی بیاہ میں لوگ بہت اسراف کرتے تھے۔ الرسالہ کا فکر ان میں پھیلا۔ اس کے نتیجہ میں وہاں شادی بیاہ کا طریقہ بدل گیا ہے اور بالکل سادہ میں شادیاں ہونے لگی ہیں۔ الرسالہ سے متاثر لوگ اصلاحی کمیٹی بنا کر یہ کام کر رہے اسی طرح دوسرے مقامات کے لوگوں کو کرنا چاہئے۔

۷ مالک رام ایم اے ہندستان کے مشہور دانشور ہیں۔ وہ الرسالہ بہت پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک مجلس میں الرسالہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا: الرسالہ آج کی دنیا میں بہت بڑا کام کر رہا ہے۔ اس نے قوم کی پوری فکر کو ری اورینٹیٹ (re-orientate) کر دیا ہے۔

۸ دارالسلام (تنزانیہ) کے مدرسۃ الثقافۃ الاسلامیۃ نے اپنے خط میں لکھا کہ انھیں اسلامی مرکز کا انگریزی الرسالہ ملا اور وہ انھیں بہت پسند آیا۔ اب انھوں نے درخواست کی ہے کہ ان کے مدرسہ کو ہم اپنی میلنگ لسٹ میں شامل کرلیں اور ان کو اعزازی طور پر انگریزی الرسالہ برابر روانہ کریں (نطلب منکم ان تدرجوا المدرسۃ فی قائمۃ المشترکین فی المجلۃ بالمجان وذالک لقلۃ امکاناتھا المالیۃ) اس طرح کے خطوط ہمیں ملتے رہتے ہیں۔ مگر مرکز کی طرف سے لوگوں کو اعزازی طور پر الرسالہ بھیجنا ممکن نہیں۔ اگر کچھ لوگ تبلیغی جذبہ کے تحت اپنی طرف سے بدل اشتراک ادا کر کے جاری کرائیں تو مناسب ہوگا۔

۹ مالیگاؤں میں ایک روزنامہ نکلتا ہے۔ اس کا نام "شام نامہ" ہے۔ اس اخبار کے کالموں میں اکثر الرسالہ کے مضامین نقل کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اکثر مقامی اخبار اور رسالے الرسالہ کے مضامین چھاپ رہے ہیں۔

۱۰ جمیل احمد انصاری (مالیگاؤں) نے انجنیئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ بمبئی میں ایک فرم میں ان کا انٹرویو تھا۔ انٹرویو لینے والے سب کے سب ہندو لوگ تھے۔ انھوں نے ایک سوال کیا کہ آپ کون سا میگزین پڑھتے ہیں۔ جمیل احمد انصاری صاحب نے کہا کہ

منتقلی" انٹرویو لینے والوں نے کہا کہ یہ کون سا میگزین ہے، اس کا تو ہم نے نام بھی نہیں سنا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک تعمیری پرچہ ہے۔ اسی لئے میرا ذہن بدل دیا۔ اس کی وجہ سے مجھے یہ حوصلہ ملا کہ آج میں یہاں انٹرویو دینے کے لئے آیا ہوں۔ یہ واقعہ رفیق لقمان انصاری صاحب (مالیگاؤں) نے بتایا۔

١١ مراکش کے ایک خط سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک عرب اسکالر مرکز کے علمی منہج پر ریسرچ کر رہے ہیں اور اس پر اپنا مقالہ تیار کر رہے ہیں۔ ان کے عربی مقالہ کا موضوع (عنوان البحث) یہ ہے: الدراسة والمنهج لفكر وحيد الدين خان من خلال كتابه الاسلام يتحدى۔

١٢ الرسالہ کے ہندی اڈیشن کا کام تیزی سے جاری ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی ہندی الرسالہ شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔ ترجمہ کا کام مسٹر صغیر کرمانی (ایم اے ہندی) انجام دے رہے ہیں۔

١٣ عرب حضرات کے اصرار پر تذکیر القرآن کے عربی ترجمہ کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی کئی پارہ تک ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ کام مولانا انیس لقمان ندوی مرکز کے تحت انجام دے رہے ہیں۔

١٤ امراوتی سے ایک ہفت روزہ اخبار "باغبان" کے نام سے نکلتا ہے۔ وہ مستقل طور پر ہر اشاعت میں الرسالہ کے مضامین شائع کر رہا ہے۔ اسی طرح مختلف اخبارات ورسائل کبھی حوالہ کے ساتھ اور کبھی بغیر حوالہ الرسالہ کے مضامین نقل کرتے ہیں۔

١٥ دہلی سے انگریزی میں ایک دو ماہی پرچہ نکلتا ہے۔ اس کا نام لوکاین بلیٹن (Lokayan Bulletin) ہے۔ اس کے شمارہ نومبر۔ دسمبر ١٩٨٩ میں الرسالہ انگریزی کا ایک آرٹیکل مفصل نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس طرح مختلف پرچے الرسالہ کے مضامین چھاپتے رہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے الرسالہ کا پیغام مختلف حلقوں میں پہنچ رہا ہے۔

١٦ اسلامی مرکز کی مطبوعات میں "اللہ اکبر" اور "عظمت قرآن" کے نسخے کافی عرصہ سے ختم ہو چکے تھے۔ دونوں کتابیں دوبارہ چھپ کر آگئی ہیں۔ اسی طرح "تجدید دین" اور "عقلیات اسلام" کے نئے اضافہ شدہ ایڈیشن تیار کیے گئے ہیں جن کی ضخامت پہلے کے مقابلہ میں تقریباً دوگنی ہوگئی ہے

125585

11.9.

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسا
کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام اذ
تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ
ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع
تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضر
ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک
ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ
روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں
صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین
تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر د
الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر
اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جا

زرِ تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرِ تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک کے لیے

ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسؤل نے ناتس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی د

الرسالہ کیسٹ

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	25/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-

مکتبہ الرسالہ